# جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

# جامعہ

زیرِ ادارت:۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

| جلد ۳۵ نمبر ۱ | بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵؁ فی پرچہ آٹھ آنہ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین



(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی
گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

# جامعہ

زیرِ ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم، اے


جلد ۳۵ ✠ نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ع | چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ آٹھ آنہ


## فہرست مضامین




(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی۔
**مطبوعاتِ جامعہ** کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
اربابِ ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں

# جامعہ

زیر ادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۵ نمبر ۴ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

## فہرست مضامین



(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی
ہیں ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

# جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

| جلد ۳۵ نمبر ۵ | بابتہ ماہ نومبر ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵؎ فی پرچہ آٹھ آنہ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین



(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# جامعہ

زیرِادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم، اے


| جلد ۳۵- نمبر ۶ | بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ آٹھ آنہ |
|---|---|---|


## فہرست مضامین




(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# مکتبہ جامعہ دہلی

## کو

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین اور دوسرے مشہور اداروں کی مطبوعات کی ایجنسی حاصل ہے، اس لئے مکتبہ سے ہر موضوع کی کتابیں اصلی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

# مالیات جنگ

جنگ کے سب سے زیادہ نمایاں اثرات ملک کے مالیہ پر پڑتے ہیں یوں تو معاشی زندگی کے ہر شعبہ کا جنگ سے متاثر ہونا ناگزیر ہے لیکن ہم ان اثرات کو فوراً محسوس نہیں کرتے البتہ حکومت کے مالیہ میں جنگ کی وجہ سے جو تغیرات ہوتے ہیں ان کا ہمیں نسبتاً جلد علم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حالت امن کی بہ نسبت حالت جنگ میں حکومت کے اخراجات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ آلات حرب کی فراہمی، سپاہیوں کے لئے خوراک کی رسد، فوجوں کی حمل ونقل، رنگروٹوں کی بھرتی اور ان کی تنخواہیں یہ وہ بعض مدات ہیں جن کے لئے جنگ کے زمانہ میں حکومت کو زائد اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور ان جدید اخراجات کی بجا آوری کے لئے حکومت کو مالیہ میں تغیرات کرنے پڑتے ہیں۔ نئے نئے مدات آمدنی نکالے جاتے ہیں اور ان مدات کی تقسیم بھی ایسی نہیں ہوگی جیسی کہ زمانہ امن میں ہوا کرتی ہے۔ حکومت کے پاس دست غیب تو ہے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نئے مدات کے تحت جو آمدنی حاصل ہوگی وہ اہل ملک کی جیب ہی سے نکلے گی۔ گویا حکومت کے مالیہ میں تغیر و تبدل کا اثر بالراست اہل ملک پر پڑتا ہے۔

مالیات میں ان تغیرات کا اثر دوران جنگ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے حکومت اور عوام کو مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنگ کے اختتام سے بیرونی ہیجان تو ختم ہو جاتا ہے لیکن یہی بیرونی سکون، اندرونی سیاسی ہیجان کا باعث ہوتا ہے جنگ کے زمانہ میں جو صنعتیں رواج پاتی ہیں وہ جنگ کے بعد بند ہو جاتی ہیں اور ان صنعتوں میں جو افراد معروف تھے بیکار ہو جاتے ہیں ان اشخاص کو کام پر لگانا ایک حل طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔ جنگ سے قبل جو تجارتی حالات تھے عود کر آتے ہیں ان تمام حالات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں عام طور پر بےچینی اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان غیر معمولی حالات کے پیدا ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہی حکومت کے مالیہ کی تبدیلیاں ہیں۔ جنگ کے بعد حکومت کے زائد اخراجات میں کمی ہوتی ہے۔ دوران جنگ میں حکومت کی حیثیت ایک بہت بڑے خریدار کی سی ہوتی ہے لیکن جنگ کے بعد حکومت کی طلب میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قیمتوں میں تخفیف ہوتی ہے اور اس کا لازمی اثر آمدنیوں پر بھی پڑتا ہے

جنگی مالیات کے یہی وہ اثرات ہیں جن کی وجہ سے متمدن ممالک میں موازنوں پر حکومت اور عوام خاص نظر رکھتے ہیں اور دونوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ موازنہ کی ترتیب ایسی ہو کہ اس سے ایک طرف جنگی ضروریات کامل طور پر پوری ہوں اور دوسری طرف ملک کا معاشی توازن بگڑنے نہ پائے۔

سوال یہ ہے کہ جنگی مالیات کا مقصد کیا ہے؟ ہم نے بتلایا ہے کہ زمانہ جنگ میں حکومت کو نئے نئے اخراجات لاحق ہوتے ہیں ان اخراجات کی جس سرعت کے ساتھ پابجائی کی جائے گی اسی قدر جنگ میں کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اخراجات جنگ کی پابجائی جنگی مالیات کا بنیادی کام ہے لیکن اخراجات جنگ کا ٹھیک ٹھیک مفہوم کیا ہے؟ فرض کیجئے کہ جنگ کے لئے انگلستان کو دس کروڑ پونڈ کی ضرورت ہے یہ ہوسکتا ہے کہ حکومت دس کروڑ پونڈ کے سکّے دارالضرب میں ڈھال لے اور اپنی ضروریات پوری کرے۔ بادی النظر میں تو یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے حکومت کو اپنی ضروریات کے لئے دس کروڑ پونڈ کے نہیں بلکہ ان کے ہم قدر وسائل اشیا و خدمات درکار ہیں تاکہ جنگی ضروریات پوری ہوسکیں اور ظاہر ہے دس کروڑ پونڈ کے سکّے ڈھالنے سے یہ کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ حکومت کو جن اشیاء و خدمات کی ضرورت ہے امن کے زمانہ میں عوام ان سے مستفید ہوتے تھے لیکن اب اغراض جنگ کے لئے حکومت ان اشیاء و خدمات کو حاصل کرے گی اور دس کروڑ پونڈ کے ہم قدر اشیاء و خدمات کے استعمال کی حد تک عوام کو حکومت کے حق میں دست بردار ہونا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر جنگ کے مصارف صحیحہ ان اشیاء و خدمات پر مشتمل ہیں جن کی تیاری و استعمال کو اس لئے ترک کرنا پڑتا ہے کہ جنگی ضروریات کی تکمیل ہوسکے مختصراً یہ کہ ملک کے معاشی وسائل کے کثیر حصہ کو زمانہ امن کے کاروبار کی انجام دہی اور اشیاء کی تیاری سے زمانہ جنگ کے کاروبار کی سربراہی اور اشیاء ضروریات کی فراہمی کی طرف منتقل کرنا ہی مالیات جنگ کا بنیادی مقصد ہے۔

## مالیات جنگ کے مختلف طریقے:۔

حکومت اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ شاہی خزانوں میں معتدبہ رقم زیادہ تر اسی غرض سے رکھا کرتے تھے۔ یا پھر بھاری قرضے لیتے تھے اور محاصل میں اضافہ بھی کردیا کرتے تھے بعض بعض اوقات رعایا سے جبراً رقومات وصول کی جاتی تھیں کبھی کبھی خطابات

اور جاگیریں دے کر ملک کے مالدار اشخاص سے روپے پیسے لیتے تھے۔ انعام علیات اور جاگیر کے معاوضہ میں اشخاص کی خدمات اور آلات حرب حاصل کئے جاتے تھے جاگیرداری نظام میں ہر جاگیردار اپنی جاگیر کے پورے وسائل کے ساتھ مرکزی حکومت کی جنگی ضروریات پوری کرتا تھا لیکن موجودہ زمانہ میں جہاں طریقہ ہائے جنگ میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہاں جنگی ضروریات پورا کرنے کے قدیم ذرائع کے بجائے نئے طریقے رائج ہوگئے ہیں جس طرح جدید جنگی طریقے میکانی اور سائنٹفک اصولوں کی بنا پر ہر قدیم طریقے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح مالیات جنگ کے جدید طریقے اپنے علمی و عملیاتی نوعیت کے لحاظ سے قدیم ذرائع سے جداگانہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اخراجات جنگ کی پابجائی کے چار مختلف طریقے ہیں۔

۱۔ صنعتی نگرانی۔

۲۔ محصول۔

۳۔ قرضہ۔

۴۔ افراط زر۔

## ا۔ صنعتی نگرانی:۔

اس طریقے کے مطابق ملک کے تمام معاشی شعبے حکومت کے تحت آجاتے ہیں اور حکومت ان تمام شعبوں کی نگرانی کرتی ہے۔ ایسی صورت میں آلات حرب کی تیاری کے لئے تفصیل (Rationing) اور تقلیل قیمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ حکومت کو عوام کی آمدنی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنیاں علیٰ حالہٖ برقرار رہتی ہیں۔ اشیا کی تیاری میں جو اخراجات پہلے لاحق ہوا کرتے تھے اب بھی وہی برداشت کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اس طرح اس اضافہ قیمت سے حکومت جنگی اخراجات کے لئے آمدنی حاصل کرتی ہے اور بقیہ حصہ سے ان اشیا کی تیاری کے اخراجات کی پابجائی کی جاتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس طریقہ میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور بعض خرابیاں بھی۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عوام کی آمدنیوں میں تغیرات نہیں ہوتے اور جنگی

ضروریات کی فراہمی کا جو بار عوام پر پڑتا ہے وہ ان کے لئے کچھ زیادہ بارگراں نہیں ہوتا۔ جنگی ضروریات کے لئے جو محصول لگایا جاتا ہے اس کو عوام بخوشی پسند نہیں کرتے۔ اس طریقہ میں عوام پر قرضہ کا بار نہیں پڑتا۔ حکومت کے لئے بھی یہ طریقہ بہت سہولت بخش ثابت ہوتا ہے۔ تمام جنگی مساعی ایک ہی مرکز اور نظام کے تحت شروع کی جاتی ہیں اور ان میں اعلیٰ درجہ کی مرکزیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ چونکہ جنگی اشیاء و خدمات کی فراہمی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے اس لئے اس میں کافی وقت بچتا ہے اور جنگ کے زمانہ میں وقت کی بچت فتح کا پیش خیمہ ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ماہرین کی نگرانی میں ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ موجودہ جنگ میں جزئی طور پر انگلستان اس طریقہ پر عمل کررہا ہے۔ یہاں زمانہ امن کے غیر اہم کاروبار کو جنگی صنعتوں میں منتقل کردیا گیا ہے اور وزارت رسدان کی نگرانی کرتی ہے۔ اس وزارت کے دو فرائض ہیں ایک تو یہ کہ قومی تحفظ کے لئے ضروری اشیاء فراہم کیجائیں اور دوسری حکومت کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔

نقائص:۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو سرعت کے ساتھ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جنگ کے ابتدائی زمانہ میں اس طریقہ پر عمل پیرا ہونا دشوار رہے۔ اس کے لئے بہت سے پیچیدہ انتظامی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ صنعتیں منتخب کی جائیں ان کے انتظام و نگرانی کے لئے کمیٹیاں بنائی جائیں۔ ان کی مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔ یہ سب پاپڑ بیلے جائیں تب کہیں جاکر اس طریقہ کو پورے طور پر نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان تمام انتظامات کے لئے وقت درکار ہے۔

اشتمالی نظام میں اس طریقہ کو بہت جلد اختیار کیا جاسکتا ہے۔ معاشی شعبے حکومت کے زیر نگرانی تو ہوتے ہی ہیں۔ البتہ غیر اہم کاروبار و مصنوعات کو جنگی ضروریات تیار کرنے والے کارخانوں میں منتقل کردینا پڑتا ہے اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔

موجودہ جنگ کے چھڑنے سے پیشتر ہی جنگ کی قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں تھیں۔ اسی لئے انگلستان میں کئی صنعتوں مثلاً حمل و نقل، جہاز رانی، طیارہ سازی وغیرہ کو جنگ سے قبل ہی قومی تنظیم و نگرانی کے تحت لے لیا گیا تھا

**۴۔محصول:**۔ یوں تو امن کے زمانہ میں بھی حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ محصول ہی ہے لیکن زمانہ جنگ میں جو محاصل لگائے جاتے ہیں ان کی نوعیت زمانہ امن کے محاصل سے جداگانہ ہوتی ہے۔ زمانہ امن میں محصول لگاتے وقت کئی باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً زمانہ امن کی محصول اندازی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ اشیاء ضروری پر محصول نہ لگایا جائے تاکہ اس کا بار غریب طبقہ پر نہ پڑے یعنی آدم اسمتھ کا یہ قانون کہ ٹیکس کم سے کم ضرر رساں ہو، پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ زمانہ امن میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ محصول خصوصاً محصول آمدنی اس تناسب سے لگایا جائے کہ اس کا رد عمل پس اندازی کی تخفیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو یعنی محصول اتنا زیادہ نہ ہو کہ افراد کی خطرات برداشت کرنے اور پس انداز کرنے کی قابلیت میں کمی ہو جائے ورنہ اس سے بیروزگاری پھیلے گی اور معاشی ترقی میں یہ محصول سنگ گراں ثابت ہوگا۔ بالفاظ دیگر آدم اسمتھ کے قانون معدلت پر عمل کیا جاتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں ان اصولوں کا کچھ زیادہ پاس و لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت اشیاء ضروری پر محصول لگانے سے نہیں چوکتی۔ چنانچہ جنگ کے چھڑتے ہی حکومت ہند نے دیا سلائی پر محصول لگا دیا ہے اور اب اس میں اضافہ کر رہی ہے غرض یہ کہ زمانہ جنگ میں چونکہ حکومت کو غیر معمولی اخراجات لاحق ہوتے ہیں اس لئے ان کی پابجائی کے لئے غیر معمولی محاصل لگائے جاتے ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کا بار ان افراد پر نہ پڑے جو فاقے کے حد پر پہونچ گئے ہوں۔

جنگ کے زمانہ میں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ محاصل کا بار دولتمند طبقہ پر زیادہ پڑے۔

محاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ محاصل میں اضافہ کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ نئے محاصل عائد کئے جائیں۔ موجودہ جنگی ضروریات کی فراہمی کا انتظام صرف محاصل میں اضافہ ہی سے ممکن نہیں۔ اس لئے دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو طریقہ عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے وہ ( Fanoy Taxes ) یا بے اندازہ محصول ہے۔ اس سے وہ محصول مراد ہے جس سے پس اندازی کا محرک متاثر نہ ہو محصول منافع زاید یا محصول آمدنی زاید اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے تحت ہر اس شخص پر جس کی آمدنی جنگ کے زمانہ میں بہ نسبت امن کے زمانہ کے زیادہ رہی ہو محصول عائد کیا جاتا ہے لیکن ان محاصل سے زمانہ جنگ میں زیادہ امداد نہیں ملتی کیونکہ منافع زاید آمدنی زاید کا انحصار بیشتر قیمتوں کے اضافہ پر ہے اور جنگ کے زمانہ میں عوام اور حکومت دونوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قیمتوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔

اور اسی لئے قیمتوں کی نگرانی کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جب صورت حال یہ ہو تو حکومت کو ان محاصل سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں محصول منافع زائد کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ جنگ میں جو زائد منافع ہوتا ہے اس پر محصول لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے زمانہ جنگ کے منافع پر جو محصول لیا جاتا ہے اس کو محصول منافع جنگ ( War Profit Tax ) کہتے ہیں محصول منافع زائد درحقیقت ایک تجارتی یا کاروباری محصول ہے۔ دولت پر تین طرح سے محصول لگایا جا سکتا ہے۔ ایک تو پائیدار آمدنی پر، دوسرے اشخاص یا اداروں پر تیسرے اشخاص یا اشیاء پر۔ اشیاء پر جو محصول لگایا جاتا ہے وہ یا تو زمین پر لگایا جائے گا یا اصل پر یا پھر تجارت پر یہ محصول منافع زائد اشیاء پر ہی لگایا جاتا ہے۔

زمانہ جنگ میں جو نئے محاصل لگائے جاتے ہیں ان کے منجملہ دونوں اوپر بیان ہو چکے ہیں یعنی (۱) محصول منافع زائد (۲) محصول آمدنی زائد (۳) ایک تیسرا محصول، محصول تعیشات عاید کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بے اندازہ محصول کی ایک قسم ہے ظاہر ہے کہ جنگی معیشت میں "طاؤس ورباب" کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مالیات جنگ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اشیائے تعیشات کا استعمال کم سے کم ہو۔ اس لئے ان پر محصول لیا جاتا ہے۔

سالانہ اصل پر محصول ( Annual Capital Tax ) یہ بھی زمانہ جنگ کا ایک نیا محصول ہے ایک سال گزرنے کے بعد جائیداد کی معمولی قیمت پر محصول لیا جاتا ہے۔ اس محصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا سالانہ جسٹر رکھا جائے اور عموماً اس کی ادائی کے لئے چھ ماہ کی مدت دی جاتی ہے۔

۴۔ غیر مکتسبہ آمدنی کا حصول:۔ یہ بھی منجملہ ان نئے محاصل کے ایک قسم کا محصول ہے جو زمانہ جنگ میں غیر مکتسب آمدنی مثلاً معاشی لگان، جاگیر کی آمدنی وغیرہ پر عاید کیا جاتا ہے۔ اس محصول کے عاید کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پوری کی پوری آمدنی حکومت لے لے یا دوسرے یہ کہ غیر مکتسب آمدنی کا ایک حصہ لے لے اور بقیہ حصہ چھوڑ دے جو حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس کا انحصار شخص متعلقہ کی آمدنی پیدا کرنے کی قابلیت، اس کے سابقہ مطالبات اور اس کے زیر پرورش افراد کی تعداد پر ہوتا ہے۔

مزدوروں اور چھوٹی چھوٹی آمدنی والوں پر محصول عاید کرنے میں کئی ایک انتظامی دشواریاں پیش آتی ہیں اس لئے

---

ط Unearned Income

ان پر ٹیکس لگانے کا واحد طریقہ بالواسطہ محصول ہے یعنی اخراجات زندگی کی معمولی اشیا مثلاً بیڑی، تمباکو، شکر وغیرہ پر محصول لگایا جاتا ہے اور ہم پہلے بیان کر آئے ہیں زمانہ جنگ میں حکومت کا ان ضروری اشیا پر محصول لگانا کچھ معیوب نہیں خیال کیا جاتا۔

اخراجات جنگ کی پا بجائی کے اس طریقہ میں نقائص بھی ہیں اور فوائد بھی۔

**فوائد:۔** اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے اشیا کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا البتہ اشیا کی طلب میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ کہ محصول عائد کرنے سے پہلے محصول ادا کنندہ جن اشیا کو زیادہ استعمال کرتا تھا محصول عائد کرنے کے بعد ان میں سے بعض اشیا کی طلب میں کمی کر دے گا ممکن ہے کہ بعض کا استعمال ترک کر دے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی محصول عائد کرنے کے بعد اشیا کی سابقہ طلب میں کمی ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان اشیا کی انفرادی قیمت میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہو۔

(۲) اگر صرف محاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پا بجائی کی جائے تو جنگ کے بعد مالیات کے غیر معمولی مسائل باقی نہیں رہتے اور نہ انھیں حل کرنے کے لئے غیر معمولی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ نہ تو قرضہ عام میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور نہ ہی شرح سود میں، اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے زیادتی کا رجحان پیدا ہوگا۔ الغرض اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے جنگ کے بعد حکومت کو ملک کی مالی و معاشی حالت درست کرنے کے لئے غیر معمولی دردسری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ حکومت کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ مجوزہ محاصل میں کمی کرے اور اس طرح عوام کی آمدنیوں کو جو دوران جنگ میں گھٹ گئی تھیں سابقہ معیار پر لے آئے۔

**نقائص:۔** اس طریقہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ عوام اس کی دلی تائید نہیں کرتے جنگ کے زمانہ میں بھی بہت کم افراد ہوتے ہیں جو اپنی جیب پر بار پڑتے دیکھ کر چین بجبیں نہ ہو جائیں۔

**قرضے:۔** اخراجات جنگ کی پا بجائی کے لئے حکومت کثیر مقدار میں قرضے لیتی ہے، اس قسم کے قرضوں کو غیر پیدا آور کہا جاتا ہے۔ قرض کی صورت میں بھی ٹیکس کی مانند رقم افراد کی جیب سے نکل کر حکومت کے ہاتھوں میں آتی ہے لیکن قرض و ٹیکس میں فرق یہ ہے کہ قرض دہندہ کی رقم کو ختم میعاد پر حکومت واپس کرنے کا وعدہ کرتی ہے لیکن محصول ادا کنندہ سے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ نہ صرف قرض دہندہ کو اس کا اصل واپس مل جاتا ہے بلکہ اس اصل پر مقررہ

شرح سے سود بھی ادا کیا جاتا ہے۔

قرض حاصل کرنے کے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ اہل ملک سے حاصل کیا جائے یا دیگر ممالک سے۔ اگر اہل ملک سے حاصل کیا جائے تو اس کی دو نوعیتیں ہو سکتی ہیں یعنی لازمی یا اختیاری۔ لازمی قرض سے مراد قرض کی وہ مقدار حکومت حاکمیہ کی جانب سے مقرر کی جائے۔ اور اگر اختیاری قرض ہو تو افراد کی آمدنی کا صرف وہی حصہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو ان کے اپنے صرف سے بچ جائے یا جو محصول کی صورت میں ان کی جیب سے نہ چلا گیا ہو۔ جنگ کے زمانہ میں بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی غیر جانبدار ممالک سے قرضے حاصل کرتی ہیں۔ مثلاً گذشتہ جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ نے ۱۳۵۰ ملین پونڈ امریکہ سے قرض لئے تھے۔

اب ہم اس طریقہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں گے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں یہ طریقہ عوام کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ قرض و ٹیکس دونوں صورتوں میں افراد کی کچھ رقم ان کی جیبوں سے نکل حکومت کے خزانے میں داخل ہو جاتی ہے لیکن قرض کی صورت میں نہ صرف اصل کی واپسی کی امید رہتی ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں سود بھی ملتا ہے۔ اس لئے قرض دہندہ کے لئے یہ امر ناگوار نہیں گذرتا۔ حکومت کو اس طریقہ سے نسبتاً آسانی کے ساتھ رقم مل جاتی ہے۔ قرضے حاصل کرنے کے لئے صنعتی نگرانی کے طریقہ کی مانند پیچیدہ انتظامات نہیں کرنے پڑتے۔

یہ طریقہ بھی نقائص سے پاک نہیں ہے۔ قرض لیتے وقت حکومت کو جتنی آسانی ہوتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ دشواریاں اس کو ادا کرتے وقت لاحق ہوتی ہیں۔ حکومت اس قرضہ عامہ کو ادا کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کی ادائی کے لئے حکومت سنکنگ فنڈ یا ذخیرہ ادائی قائم کرتی ہے اس فنڈ میں ہر سال ایک معینہ رقم جمع کی جاتی ہے تاکہ جمع شدہ رقم قرض کی ادائی میں دی جائے۔ ایک دوسرا طریقہ طریقہ تبدیل ہے یعنی یہ کہ اختتام جنگ پر حکومت شرح سود میں کمی کر دے اور اسی شرح سے سود ادا کرنے کا اعلان کر دے۔ قرض دہندے اس طرز عمل پر احتجاج کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں حکومت اسی کم شرح سود پر نیا قرضہ حاصل کر کے پرانا قرضہ ادا کر دیتی ہے۔ برطانوی حکومت نے نپولیانی جنگوں کے سلسلہ میں یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ کثیر المقدار قومی قرضوں میں تخفیف کرنے کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ملک کے مالکان جائداد کی نقد مالیت کا

ایک حصہ حکومت حاصل کرے۔ اس طریقے کے اختیار کرنے میں کئی دشواریاں ہیں۔ اول تو یہ کہ جائداد کی مالیت کا تعین مشکل سے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرین کا اندازہ بھی غلط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر قیمت کا صحیح اندازہ قائم بھی ہوجائے تو اس جائداد کا فروخت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر مستطیع شخص جو اس جائداد کو خریدنے کے قابل ہوگا وہ خود بھی ہمارے مفروضہ کے مطابق اپنی جائداد فروخت کرنے کی فکر میں ہوگا۔ البتہ اگر مالکان جائداد حکومت کے لیندار ہوں تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کی اُس رقم کی حد تک دستبردار ہوجائیں مثلاً ایک شخص کے پاس حکومت کا پانچ ہزار کا تمسک ہے اور اب یہ شخص اس رقم کے لینے سے دستبردار ہوجائے۔ اسی طرح ایک شخص کے پاس ریلوے کمپنی کے حصص ہوں اور وہ اپنے حصص حکومت کو دیدے۔ حکومت ان حصص کو فروخت کرکے یا اس کی آمدنی سے اپنا قرضہ چکا سکتی ہے

آخرالذکر طریقہ کے سوا مندرجہ بالا دونوں طریقوں یعنی ذخیرۂ ادائی یا طریق تبدیل کے ذریعہ قومی قرضہ کی ادائی کے لئے حکومت کو عوام پر محصول لگاکر ہی رقم حاصل کرنی پڑتی ہے اس طرح گویا اگر قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کی جائے تو اس کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے کیونکہ ان ہی پر ٹیکس لگاکر اس قرض کی ادائی عمل میں آتی ہے۔ بعض معاشئین کا خیال ہے کہ اخراجات جنگ کی ادائی موجودہ نسلوں کے اندوختہ و سرمایہ اور محنت سے ہونی چاہئے اور آئندہ نسلوں پر اس کا بار غیر منصفانہ اور معاشی زندگی کے لئے مضرت رساں ہے لیکن بعض اشخاص اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جنگی مصارف کا بار آئندہ نسلوں پر بھی پڑنا چاہئے۔ کیونکہ جنگ کے خطرات اور مضر اثرات سے ملک کو محفوظ رکھ کر موجودہ نسل بیش بہا خدمات انجام دیتی ہے اور اسی طرح باواسطہ یا بلاواسطہ جنگ سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے نئی نسلیں بھی مستفید ہوتی ہیں۔ موجودہ نسلوں کی یہی قربانی کیا کم ہے وہ جنگ اور اس کی ہولناکیوں کے مقابلہ میں اپنا خون بہاتی ہیں۔ اگر آئندہ نسلوں پر اخراجات جنگ کے ایک حصہ کا بار پڑتا ہے تو یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

الغرض قرض لینے کی صورت میں اخراجات جنگ کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی ادائی کے لئے ملک کے مختلف طبقوں پر ٹیکس لگایا جاتا ہے جس میں دولت مند، متوسط حتیٰ کہ غریب طبقہ کو بھی شامل کرلیا جاتا ہے۔ اس طرح اخراجات جنگ کا بار نہ صرف دولت مند بلکہ متوسط اور غریب طبقوں پر بھی پڑتا ہے

بادی النظر میں یہ ہوتا ہے کہ ان طبقوں پر اسی تناسب سے بار پڑتا ہے جس تناسب سے کہ ٹیکس کی رقم وصول کی جاتی ہے لیکن بہ نظرِ غائر دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غریب طبقہ پر اس کا بار زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگر دولت مند طبقہ کی جیب سے ٹیکس کی صورت میں کچھ رقم لگائی جا رہی ہے تو انھیں پھر یہ رقم سود کی شکل میں واپس مل جاتی ہے لیکن غریبوں سے ٹیکس تو برابر لیا جاتا ہے مگر انھیں کوئی معتد بہ معاوضہ سود کی شکل میں واپس نہیں ملتا گویا دولت مند طبقہ مزید دولت مند بن جاتا ہے اور غریب طبقہ غریب تر ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جنگی اغراض کے لئے زیادہ تر دولت مند طبقہ کے اندوختوں سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ دولت مند و غریب کی اضافی حیثیت جنگ کے زمانہ میں ایک سی نہیں ہوتی۔ جنگ کے زمانہ میں علی العموم قیمتیں اعلیٰ ہو جاتی ہیں۔ قیمتوں کے اضافہ سے امیر کی بہ نسبت غریب زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اخراجات جنگ کا جو بار غریب طبقہ پڑتا ہے وہ اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ الغرض قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی سے معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور عدم مساوات آمدنی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ کی ایک اور یہ خرابی ہے کہ نئی نئی صنعتیں جنھیں جنگ کے زمانہ میں جاری کرنے کے کافی مواقع رہتے ہیں محض اس وجہ سے جاری نہیں کی جا سکتیں کہ ملک کا کثیر سرمایہ قرضوں میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ V

یہ تو ہوا ان قرضوں کا حال جو اندرون ملک حاصل کئے جاتے ہیں اگر جنگی اغراض کے لئے بیرون ملک سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں تو اس کے نتائج اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ قرضے غیر پیدا آور ہوتے ہیں ان سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی کہ جس سے غیر ملکی قرض دہندوں کو سود ادا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اصل و سود کی پابجائی اہل ملک پر محصول عائد کر کے کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس مقدار میں بیرون ملک سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اس سے زائد مقدار میں (اصل معہ سود) رقم واپس کی جاتی ہے گویا اس مقدار کی حد تک ملک کی دولت بغیر کسی معاوضہ کے ملک سے باہر چلی جاتی ہے۔ اس قسم کے غیر ملکی و غیر پیدا آور قرضوں کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ جرمنی نے گذشتہ جنگ عظیم میں جو قرضے کثیر مقدار میں غیر ممالک سے حاصل کئے تھے ان کے بوجھ سے جرمنی کی معاشی حالت ایک عرصہ دراز تک سنبھل نہیں سکی تھی اور بعض معاشیین کا

کا تو اس وقت یہ خیال تھا کہ بس اب جرمنی ختم ہو چکا۔

الغرض اس طریقہ سے مابعد جنگ مالیات کے مختلف اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

افراط زر۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ قرض کے ذریعہ بھی مالیات جنگ کا انصرام کیا جاتا ہے۔ یہ قرض دو ذرائع سے لیا جاتا ہے۔ حکومت یہ قرض یا تو عوام سے لے سکتی ہے یا اداروں یعنی بنکوں سے۔ اگر حکومت بنکوں سے قرض لے تو عوام کے پاس جو مقدار رقم ہوتی ہے اس میں اضافہ کرنا ہوگا مثلاً اگر برطانوی حکومت انگلستان بنک سے قرض لے تو خزانوی بل (Treasury Bills) جاری کرنے پڑیں گے اور بنک ان کی ضمانت پر اپنے کھاتہ داروں کے کھاتوں میں اضافہ کرے گا اور یہ اضافہ غیر متناسب ہوگا۔ یا اگر حکومت معمولی بنکوں سے قرض لے تو بھی یہ بنک خزانوی بل کی طمانیت پر اپنے کھاتا داروں کے کھاتوں میں اضافہ کریں گے۔ البتہ یہ اضافہ متناسب طریقہ سے ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں مقدار اعتبار میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی لئے زر نقد کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اسی اضافہ کو افراط زر کہا جاتا ہے۔ اگر عوام سے قرض لیا جائے تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔

افراط زر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہیں لیکن مالیات جنگ میں اس اصطلاح کو صرف ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کرکے عوام کے صرف میں کمی کی جاتی ہے۔ مالیات جنگ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے صرف میں کمی کی جائے۔ محصول، قرضہ، صنعتی نگرانی بھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں۔ محصول اور قرضے کے ذریعہ عوام کی جیب سے رقم لے لی جاتی ہے قبل ازیں کہ وہ اس رقم کو اپنے صرف میں لائیں۔ افراط زر میں یہ ہوتا ہے کہ انھیں خرچ کرنے کی اجازت حسب معمول دی جاتی ہے لیکن جتنا وہ خرچ کرتے ہیں اس سے پہلے کی بہ نسبت کم اشیا حاصل ہوتی ہیں۔

افراط زر کے دو طریقے ہیں ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ۔ سادہ طریقہ یہ ہے کہ حکومت زر کاغذی کا کثیر مقدار میں اجرا کرتی ہے اور یہ زر علی العموم غیر نقد پذیر ہوتا ہے یعنی حکومت اس کے معاوضہ میں سونا دینے کی ذمہ داری نہیں لیتی لیکن اس کے باوجود یہ زر اس وجہ سے جاری ہوتا ہے کہ حکومت اسے زر قانونی قرار دیتی ہے جس کے قبول کرنے پر ہر شخص اندرون مملکت مجبور ہے۔ یہ زر فوجی ضروریات اور سپاہیوں کی تنخواہ میں دیا جاتا ہے زر کی مقدار میں اس حد تک اضافہ کیا جاتا ہے کہ حکومت کو اشخاص کی مطلوبہ تعداد اور ساز و سامان فراہم ہو جائے

پیچیدہ طریقہ وہ ہے جس کو ہم مختصراً ابتدا میں بیان کر آئے ہیں۔ ہم نے افراط زر کی سادہ صورت بیان کی ہے کہ حکومت زر کاغذی کا اجرا کرتی ہے لیکن موجودہ زمانہ خصوصاً متمدن ممالک میں زر کاغذی کا استعمال کم ہوتا ہے کاروبار زیادہ تر چیک کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں افراط زر کی نوعیت مختلف ہوگی۔ حکومت بنکوں سے خزانہ کے بلز کی طمانیت پر مصنوعی کھاتے کھولنے کی خواہش کرتی ہے اور دوسری طرف جنگی قرضہ جات کا اعلان کرتی ہے۔ عوام جنگی قرضوں میں حصہ لینے کی خاطر ان کھاتوں میں سے رقومات لیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرح حکومت کو قرضوں کی شکل میں جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ عوام کی آمدنی کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ مقدار اعتبار میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اور یہی مقدار حکومت کو قرضوں کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ گویا یہ رقم مصنوعی طریقہ سے خاص طور پر حکومت کو قرض دینے کے لئے مہیا کی جاتی ہے حکومت افراط زر کی پالیسی اختیار کر رہی ہے یا نہیں اس کے آزمانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ حکومت جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ کسی کی آمدنی کا حصہ ہے تو یہ صورت افراط زر کی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر حکومت کے خرچ میں اضافہ ہوا اور عوام کے خرچ میں کمی نہ ہو تو یہ صورت افراط زر کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک ستثنیٰ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ حکومت اگر سکوں کو زیادہ مقدار میں ڈالدے تو اس سے قیمتوں میں لازماً اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر ملک میں بے روزگاری ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ زائد رقم اجرتوں میں چلی جائے۔ اسی اصول پر نازیوں نے مالیات کا انتظام کیا تھا۔ جب ڈاکٹر ساخت سابق صدر رائخ بنک نے اس طریقہ کی کمزوری بتلائی تو انھیں برطرف کر دیا گیا لیکن یہ واضح رہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کر دینے کے بعد صرف اسی صورت میں قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا جب کہ بے روزگاری زیادہ شدید ہو۔

اب ہم اس طریق کی بعض خوبیوں اور خامیوں پر غور کریں گے

زمانہ جنگ میں بھی ہمارے صنعتی وسائل کا ایک کثیر حصہ ایک عرصہ تک حکومت کی نگرانی میں نہیں رہتا بلکہ خانگی افراد کی زیر سرکردگی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اگر ان افراد کی خدمات کو حکومت اغراض جنگ کے لئے حاصل کرنا چاہے تو پھر ان کے منافع میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر عام حالات میں عاملین پیدائش اسی شعبہ پیدائش میں مصروف رہتے ہیں جہاں شرح منافع زیادہ ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت ان عاملین کو ان کاربہائے پیدائش میں استعمال کرنا چاہتی ہے جو اغراض جنگ کے لئے مفید ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان

عاملین کو ان شعبوں میں منتقل کرنے کے لئے حکومت دو طریقے اختیار کرتی ہے یعنی اختیاری اور جبری۔ جبری طریقہ کو ہم صنعتی نگرانی کے طریقے کے تحت وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اور اس کی خامیوں کی بھی ہم نے صراحت کر دی ہے۔ ان ہی خامیوں کے پیش نظر یہ تو ناممکن ہے کہ جملہ شعبہ ہائے پیدائش کے عاملین فی الفور جنگی کارہائے پیدائش میں جبری طور پر منتقل کر دیئے جائیں اس لئے حکومت منتقلی کا اختیاری طریقہ بھی رائج کرتی ہے۔ اس اختیاری طریقہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان عاملین کو جن کو کارہائے پیدائش میں منتقل کرنا مقصود ہے وہاں شرح منافع زیادہ ہو۔ افراط زر سے یہ شرط بخوبی پوری ہو سکتی ہے۔

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مالیات جنگ کے کامیاب انصرام کے لئے پس انداز کرنا ضروری ہے۔ افراط زر سے پس اندازی میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی قومی آمدنی پانچ ہزار ملین پونڈ تھی جس میں سے چھ سو یا پانچ سو ملین پونڈ پس انداز کئے جاتے تھے گویا کل آمدنی کا تقریباً دس یا بارہ فی صد حصہ پس انداز کیا جاتا تھا لیکن حکومت نے اس جنگ میں کل آمدنی کا ۸۰ فی صد قرض لیا ہے ظاہر ہے کہ پروپیگنڈے ترغیب و تحریص کے ذریعہ اس قدر رقم پس انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ پس اندازی میں غیر معمولی اضافہ کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی بشکل زر میں اضافہ ہو اور صرف پر پابندی عائد کی جا سکے۔ گویا حکومت ایک ہاتھ سے مقدار زر میں اضافہ کرے اور دوسرے ہاتھ سے پروپیگنڈے، اضافہ قیمت حمل و نقل کی دشواریوں ان مختلف ذرائع سے صرف پر پابندی عائد کرے۔ ایسی صورت میں ایک شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اس زر کی مقدار میں تو اضافہ ہو گیا ہے لیکن وہ اس اضافہ کو صرف نہیں کر سکتا۔ اس طرح جبری پس اندازی ہوتی ہے۔

افراط زر کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ حکومت اخراجات جنگ کی تکمیل کے لئے قرض لیتی ہے۔ قرض لینے کے بعد اس قرض کے مطالبات سالانہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان زائد مطالبات کی ادائی کا بہترین طریقہ افراط اجرائی زر ہے۔

افراط زر سے بعض طبقوں کو جن کی آمدنی غیر معین ہوتی ہے۔ فائدہ بھی پہونچ جاتا ہے مثلاً تاجر اس سے بعض اوقات کافی نفع اٹھاتے ہیں خصوصاً اس وقت جبکہ اشیا کے خریدنے اور بیچنے کے درمیانی وقفہ میں قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے تو تاجر کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اشیا اس کو کم قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں اور وہ انہیں

زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔ اسی طرح کارخانہ داروں کو بھی اضافہ قیمت سے بعض دفعہ فائدہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ہی مصارف پیدائش مثلاً اجرتوں میں فی الفور اضافہ نہیں ہوتا گویا کارخانہ دار کو مصارف پیدائش حسب سابق کم وبیش برقرار رہتے ہیں لیکن اس کو اپنی اشیا کی نسبتاً زیادہ قیمت ملتی ہے۔ اس طرح اس کو منافع کمانے کے زیادہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں واضح رہے کہ یہ صورت حال افراط زر کے ابتدائی زمانہ میں رہتی ہے لیکن جوں جوں افراط زر کے اثرات پھیل کر کم وبیش تمام اشیاء کی قیمتوں کو متاثر کرتے ہیں اور دوسری طرف اجرتوں میں اضافہ کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے تو کارخانہ داروں کا یہ زائد منافع غائب ہو جاتا ہے۔

مشہور ماہر معاشیات جے۔ ایم کینس کے اس قول سے بھی افراط زر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ: افراط کے لئے کسی کو ذمہ داری لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دفعہ افراط زر ہو جانے کے بعد یہ خود بخود جاری رہتا ہے۔

نقائص:- افراط زر کی خرابیاں اس کی خوبیوں سے زیادہ ہیں اگر افراط طویل مدت تک جاری رہے تو ایک نقطہ ایسا آ پہونچتا ہے جبکہ زر بے قدر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ افراط زر کے باعث جرمنی میں ۱۹۲۳ء میں مارک کی قدر گھٹ کر ...... ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال نہایت خطرناک سمجھی جاتی ہے اس سے معاشرہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

افراط زر کا بار امیر و غریب دونوں پر یکساں پڑتا ہے معاشرہ کے مختلف طبقوں پر جن کی مقدار آمدنی ایک ہی ہو لیکن نوعیت جداگانہ ہو تو افراط زر کا بار ان طبقوں پر مختلف طور سے پڑتا ہے

وظیفہ خوار یا سود کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے والوں پر سب سے زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ان لوگوں کی آمدنی تو حسب سابق ہی رہتی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس آمدنی سے وہ اتنی ما یحتاج زندگی نہیں خرید سکتے جتنی کہ وہ پہلے خریدا کرتے تھے جو اشخاص اجرتوں کے ذریعہ آمدنی حاصل کرتے ہیں وہ اضافہ قیمتوں کے بعد اپنی اجرتوں میں بھی اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا ہے مختصر یہ کہ افراط زر سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اضافہ معینہ آمدنی پانے والوں کے لئے مضر ہوتا ہے۔

مقدار زر میں جس تناسب سے اضافہ کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ عوام اس کے عادی ہو جاتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کرنے کے باوجود بھی زر کی قلت محسوس کی جاتی ہے۔ اس مستبعد صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ سبھی کو یہ معلوم رہتا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے

اس لئے زیادہ قیمت طلب کی جاتی ہے

افراط زر سے قیمتوں میں جو اضافہ ہو جاتا ہے وہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اور روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے انسداد کے لئے حکومت کو تفریط زر کی حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے قیمتوں میں کمی ہوتی ہے اور کساد بازاری پھیل جاتی ہے اس طرح افراط زر کی وجہ سے ختم جنگ پر معمولی حالات کے احیا کیلئے حکومت اور عوام دونوں کو نئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

افراط زر سے بعض معاشری خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مزدوروں کی جانب سے اضافہ اجرت کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر آجرین نئے حالات سے اتنی جلدی تطابق نہیں پیدا کر سکتے۔ اس لئے اکثر صورتوں میں مزدور ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے آجرین اور حکومت دونوں کوشش کرتے ہیں مصالحتی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ باہمی سمجھوتوں اور راضی ناموں سے حالات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ختم جنگ کے بعد حکومت افراط زر کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ اس طرح زر کی مقدار میں اضافہ تو ختم ہو جاتا ہے لیکن قیمتیں معمول سے زائد معیار پر مستقیم ہو جاتی ہیں۔ اس سے وہ طبقے جن پر زیادہ بار پڑا ہے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اگر اس کا جلد انسداد نہ ہو تو ان کی تکالیف حکومت و معاشرہ کے لئے خطرناک صورت اختیار کرنے لگتی ہیں۔

ان تمام خرابیوں کے پیش نظر افراط زر کی پالیسی میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے کہ زر کی مقدار میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو اور یہ کہ یہ اضافہ کہیں قابو سے باہر نہ ہو جائے غیر ارادی یا اضطراری افراط زر سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

بعض معاشئین نے افراط زر کے سلسلے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ حکومت تجارتی بنکوں سے خفیف یا معمولی شرح سود پر قرض لے اور ساتھ ہی تجارتی بنکوں کے معمولی معاملات قرض دہندگی پر نگرانی رکھے۔ یہ لوگ براہ راست تجارتی بنکوں سے قرض لینے پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ اس سے مرکزی ارباب اقتدار کو افراط زر کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ مرکزی بنک مثلاً انگلستان بنک سے قرض لیا جائے تو مقدار اعتبار کا جو اضافہ ہوگا اس کا اندازہ "حساب گھر" ( Clearing Banks ) کے ذخیرۂ محفوظ کے تناسب سے ہو سکتا ہے

اور جب تک کوئی خاص قانون نہ نافذ کیا جائے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

**دیگر طریقے**:۔گذشتہ صفحات میں ہم نے مفصل طور پر مالیات جنگ کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے یہ تو وہ مختلف طریقے تھے جن کا ماہرین معاشیات یکساں اہمیت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان مذکورہ طریقوں کے علاوہ بعض اور طریقے بھی ہیں جن کی اہمیت یقیناً اس قدر زیادہ تو نہیں ہے لیکن جنھیں مصارف جنگ کی پابجائی کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ان طریقوں کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ **درآمد** | درآمد سے بھی مالیات جنگ میں مدد ملتی ہے بالفاظ دیگر اس کے ذریعہ مبادلات خارجہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ مبادلات خارجہ حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں ایک تو یہ کہ اشیا برآمد کی جائیں۔ سونے چاندی کو غیر ممالک کے ہاتھوں فروخت کیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات حاصل کی جائیں بعض اوقات قومی دولت داصل تائم بکانات، زمینات وغیرہ کو غیر جانبدار ممالک کے ہاتھوں فروخت کر کے مصارف جنگ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خدمات برآمد کی جائیں لیکن یہ طریقہ دوران جنگ میں بہت کم قابل عمل ہے۔ تیسرا طریقہ یہ کہ بیرونی کاروبار کے ملکی تمسکات کو غیر ممالک میں فروخت کر دیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات درآمد کی جائیں۔

ان تمام طریقوں سے مصارف جنگ کا بار بڑی حد تک آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

۲۔ مصارف جنگ کی پابجائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ محنت میں اضافہ کر کے مزید آمدنی حاصل کی جائے مثلاً بیروزگاروں سے کام لیا جائے اوقات کار میں اضافہ کیا جائے اور آرام و اطمینان سے بسر کرنے والی عورتوں و مردوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

۳۔ **جنگی عطیات** | دوران جنگ میں عوام کو طرح طرح سے ترغیب و تحریص دلائی جاتی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ جنگ کی امداد میں بطور عطیہ دیں۔ ان کے قومی جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ حب وطن آزادی و حریت خودداری ایثار و قربانی جیسے لطیف جذبات کو ہوا دی جاتی ہے۔ نوآبادیات اور توابع سے بھی جنگی امداد کے فنڈ میں کثیر رقمات وصول کی جاتی ہیں۔ اصحاب ثروت سے بھی مختلف طریقوں سے عطیے وصول کئے جاتے ہیں۔ دیسی

ریاست کے والیوں سے قدیم حلیفانہ تعلقات کے تحت بھاری مقداریں عطیئے لئے جاتے ہیں۔

۴۔ پروفیسر کینز کی اسکیم | پروفیسر کینز نے اپنے رسالہ (How to Pay for the War) میں لازمی بچت یا جبری پس اندازی کی ایک نئی اسکیم پیش کی ہے اس اسکیم کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک معینہ مقدار سے زائد آمدنی پانے والے اپنی آمدنی کے ایک مقررہ حصہ کو لازمی طور پر پس انداز کریں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں اور یہ رقم وہ لوگ سیونگ بنکس میں جمع کرائیں۔ حکومت اس بچت کو جنگی اغراض کے لئے کام میں لائے اور ختم جنگ پر حکومت ملک کی کل دولت پر محصول لگا کر اس رقموں کو معہ سود ان کے کھاتوں میں جمع کردے کینس کا خیال ہے کہ یہ طریقہ قرضہ ومحصول کا درمیانی راستہ ہے اور اس سے مالیات جنگی کی تمام مشکلات پر قابو پا لیا جا سکتا ہے اور پھر اس طریقہ سے چھوٹی چھوٹی آمدنیاں پانے والے اشخاص بھی حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں دوران جنگ میں تخفیف آمدنی کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف ہوگی اس کے ارتفاع کے لئے وہ دو تجاویز پیش کرتا ہے ایک تو یہ کہ حکومت کی جانب سے اس امر کا معقول انتظام کیا جائے کہ ان اشخاص کو اپنی ضروریات زندگی معقول اور واجبی داموں پر مل سکیں اور دوسرے یہ کہ ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کو ۵ شلنگ فی ہفتہ بھتہ دیا جائے۔ پروفیسر کینس کی اس اسکیم پر ماہرین معاشیات کے حلقوں میں نہایت دلچسپی سے غور کیا جا رہا ہے اور اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس اسکیم کو کچھ حذف و ترمیم کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے ان مختلف طریقوں کا ذکر کیا جن کے ذریعہ موجودہ زمانہ میں مصارف جنگ کی ادائی عمل میں آتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ مناسب اور قابل عمل ہے۔ مندرجہ بالا مباحث سے ہم بعض ایسے نتائج اخذ کر سکتے ہیں جنھیں طریقہائے مالیات جنگ کے انتخاب میں اصول ومعیار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اخراجات جنگ کی ادائی کا سب سے بہتر اور مثالی طریقہ وہ ہے جس میں عوام پر مزید بار نہ پڑے۔ اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ زید کو شکار کا شوق ہے اور وہ اس شوق کی تکمیل کے لئے سالانہ ایک مقررہ رقم ضروری اشیاء مثلاً بندوق، بارود وغیرہ کی خریداری پر صرف کرتا ہے۔ اب اگر جنگی مصارف کی ادائی کے لئے حکومت اس سے قرض یا ٹیکس یا کسی اور صورت میں

یہ مقررہ رقم وصول کرے تو اس سے عوام پر کوئی بار نہیں پڑے گا اس لئے کہ یہ اشیا پہلے بھی تیار ہوتی تھیں۔ اب بھی تیار ہوں گی اور ان اشیا کے تیار کرنے والوں پر اور ان کی آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ صرف ان اشیا کے استعمال میں تبدیلی ہوگی۔ پہلے یہ چیزیں شوق و تفریح کی خاطر استعمال کی جاتی تھیں اور اب جنگ میں استعمال ہونگی اس کے برعکس صورت وہ ہے جس میں اخراجات جنگ کا عوام پر مزید بار پڑتا ہے مثلاً زید پہلے جو رقم اپنی عمدہ پوشاک پر صرف کرتا تھا اب جنگی مصارف کے لئے دے تو ظاہر ہے کہ اس رقم کی حد تک جو اشخاص پوشاک تیار کرنے کی مختلف صنعتوں میں مشغول تھے ان پر برا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس حد تک بیکار ہو جائیں پھر حکومت یہ رقم اسلحہ اور دیگر ضروریات جنگ پر صرف کرے گی اور ظاہر ہے کہ ان کی تیاری کے لئے دیگر کاروبار سے خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اس طرح عوام ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے۔

۲۔ جنگی اخراجات کا بار موجودہ نسلوں پر پڑنا چاہیئے یا آئندہ نسلوں پر اس مسئلہ کے متعلق کافی اختلاف رائے موجود ہے جس کا مفصل تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں اس سلسلہ میں اگر بالکلیۃ کوئی فیصلہ نہ کیا جاسکے تو کم از کم یہ امر تو قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ اس بار کو موجودہ اور آئندہ نسلوں میں مناسب طریقہ سے تقسیم کیا جائے یعنی یہ تو نہ ہو کہ مصارف جنگ کا تمام تر بوجھ آئندہ نسلوں پر ڈالدیا جائے کسب معاش اور توفیر آمدنی کے جو مستقل قومی وسائل ہیں انھیں جنگ کے بھینٹ چڑھا دینا قومی خودکشی اور معاشی غلامی کے مترادف ہے اس لئے ان وسائل کو بہرصورت محفوظ رکھنا موجودہ نسلوں کا قومی فرض ہے۔

۳۔ جنگی مصارف کی ادائی کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس میں یہ چیز ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کا بار زیادہ تر دولت مند طبقہ پر پڑے اور غریب طبقہ کو اس بوجھ سے جس قدر طویل عرصہ تک بچایا جاسکے بچایا جائے۔ اگر اس طبقہ کے وسائل سے استفادہ ناگزیر ہی ہو تو دانشمندانہ طریق عمل یہ ہوگا کہ ان کی چھوٹی موٹی بچت پر ہی ہاتھ ڈالا جائے ان کی ناگزیر ضروریات کے کسی حصہ کو اغراض جنگ کے لئے استعمال کرنے کی بالکل آخری صورت میں ہی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۴۔ جنگ کے غیر معمولی حالات میں عوام کی رضامندی، خوشنودی اور دلی تائید ہی جنگی مہمات کے سر کرنے میں ہمارا پہلا اور آخری مورچہ ہے۔ اس لئے مالیات جنگ کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کے لئے عوام کی

دلی تائید ضروری ہے۔

۵۔ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس سے ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں روڑے نہ اٹکائے جاسکیں

۶۔ مالیات جنگ کا کامیاب طریقہ وہ ہے جس میں نظام زر مستقیم رہے اس میں غیر معمولی تبدیلیاں نہ ہوں اور نہ اس پر کسی قسم کے برے اثرات پڑیں۔

۷۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جنگی مہمات کو سر کرنے کی دھن میں ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس کے مضر اثرات کو حکومت اور عوام دونوں دوران جنگ میں نہ محسوس کریں لیکن اختتام جنگ پر جب حکومت اور عوام کو پیچیدہ مالی مسائل سے دوچار ہونا پڑے تو فتح و کامیابی کا سارا نشہ ہرن ہوجائے۔ اس لئے اس امر کا خیال مالیات جنگ کے انصرام کے وقت ضروری ہے کہ جنگ کے بعد پیچیدہ مالی مسائل سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

۸۔ جنگ میں کامیابی کے لئے اندرونی امن و امان نہایت ضروری ہے اگر حکومت کی توجہ اندرونی جھگڑوں کے ارتفاع کی طرف مبذول رہے تو اس سے جنگی کامیابی میں بڑا رخنہ پڑجائے گا۔ اس لئے مالیات جنگ کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کی وجہ سے اندرون ملک کسی قسم کی معاشری خرابی اور شورش نہ پیدا ہونے پائے۔

۹۔ ایک طرف ان تمام امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور دوسری طرف ایسے طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں جن سے مالیات جنگ کا مقصد جلد از جلد حاصل ہوجائے۔ تھوڑے سے وقت اور معمولی کوشش سے وہ سب کچھ حاصل ہوجائے جس سے مصارف جنگ کی پابجائی ہوسکے۔ اس لئے حکومت کو مالیات جنگ کے انصرام کے لئے جس قدر کم پیچیدہ انتظامات کرنے پڑیں اتنی ہی کامیابی یقینی ہے

مالیات جنگ کے مختلف طریقوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا ان تمام معیاروں پر بالکلیہ پورا اترنا ناممکن ہے علاوہ ازیں ماہرین مالیات اور ماہرین جنگ کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی عظیم الشان —— جیسی کہ گذشتہ جنگ عظیم تھی یا موجودہ جنگ ہے —— کے مصارف کی پابجائی کسی ایک طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ مختلف طریقوں بلکہ شاید ان تمام طریقوں کا استعمال

کرنا ناگزیر ہے۔ ان حالات اور واقعات کی موجودگی میں ہم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان کا ایک ترجیحی سلسلہ قائم کیا جائے۔ ان مختلف طریقوں کی خوبیوں اور خرابیوں پر غور کرنے کے بعد ہمارے خیال میں سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی جانی چاہئے کہ صنعتی نگرانی کے طریقے کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کو وسعت دی جائے۔ اس کے بعد محصول کے ذریعہ جنگی مصارف برداشت کئے جائیں۔ اگر یہ طریقے ناکافی ثابت ہوں تو اندرون ملک عوام کی حقیقی بچت سے قرضے حاصل کئے جائیں۔ اس کے بعد بھی مزید ذرائع آمدنی کی ضرورت ہو تو ہمارے خیال میں پروفیسر کینس کی اسکیم پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ افراط زر کا طریقہ اور بیرونی قرضے حاصل کرنے کا طریقہ پورے غور و خوض اور کامل احتیاط کے ساتھ سب سے آخر میں استعمال کیا جائے۔

احمد خاں صاحب متعلم ایم۔ اے (فائنل) عثمانیہ

# اقبال اور مارکس کے زاویہ ہائے نگاہ

یہ خیالی مکالمہ اقبال اور کارل مارکس کے فلسفہ کا موازنہ ہے۔ جہاںتک اقبال کے فلسفہ کا تعلق ہے میرا منبع علم بال جبریل ضرب کلیم سیدین صاحب کی کتاب "اقبال اور تعلیم" اور علامہ اقبال کے لکچر ہیں۔ اور جہاں تک کارل مارکس کا تعلق ہے وہ اس کی مشہور تصنیف "سرمایہ" اور دو چار اقتصادی کتب اور پروفیسر کول صاحب اور اسٹریچی صاحب کی تصانیف ہیں اور نیز فلسفہ کارل مارکس جو لینن گراڈ ادارہ فلسفہ نے شائع کی ہے۔ ان سب کتابوں کے مطالعے میں نے ان دونوں بزرگوں کے زاویہ نگاہ میں جو فرق سمجھا وہ اس مکالمہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی کتب میں کہیں میری نظر سے ایسی چیز نہیں گذری جس سے مارکس کے خاص اسلام کی بابت خیالات معلوم ہوتے لیکن مذہب کی بابت ضرور ہیں۔ اس کے نزدیک ایک مذہب اتنا ہی اچھا یا برا ہے جتنا کہ دوسرا۔ اب سنئے کہ اس کے خیالات مذہب کے متعلق کیا ہیں؛

"انسان جو خطرات کی دنیا میں رہتا ہے مجبور ہے کہ حفظ و امان کی جگہ تلاش کرتا رہے یہ وہ کس طرح کرتا ہے؛ قدرت کی تسخیر سے گورنمنٹیں بنا کر، بجلی پیدا کر کے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح وہ سماجی زندگی کے پُر پیچ بندھن پیدا کر لیتا ہے۔ دنیا کو عمل سے بدلنے کا یہی طریقہ ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی خود کے جذبات اور تفکرات کو بدلنے کا جب دنیا کو بدلنا نہایت مشکل ہو جائے۔ یہ اوّلاً مذہب اور بعدہٗ فلسفہ کا طریقہ ہے اس میں پہلے دنیا کو سازگار بنانے کی کوشش ہوتی ہے اور جب نہیں ہو پاتی تو خود کو اس سے سازباز کرنا پڑتا ہے یعنی۔ اگر زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز، اور اس طرح انسان فنا ہو جانے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے"

مسلمانوں کا فلسفہ اس معنی میں مسخ ہو گیا کہ بقول علامہ اقبال کے مسلمان تقدیر کا راکب ہونے کی بجائے مرکب ہو گیا۔ اسی امر کی طرف میں نے کارل مارکس سے اشارہ کروایا ہے کہ شروع میں مسلمان میں ماحول سے تجربہ کرنے کا شوق تھا لیکن وقت گذرنے پر وہ یونانیوں کے فلسفہ کے زیر اثر آ گیا جو تخئیلیت ہے۔ اب یہ سنئے کہ تخئیلیت کیا ہے؟

"علم و عمل کی کشمکش سے فلسفہ کا مسئلہ اور تخئیلیت (مذہب) اور مادیت کے تنازعات پیدا ہوتے ہیں"...... تخئیلین کے نزدیک یہ دنیا ایک کمتر درجہ کی دنیا ہے جس میں اشیا تغیر پذیر رہتی ہیں استحکام نہیں یہ دنیا بالکل فریب اور دہوکا ہے جس میں بجائے وحدت کے کثرت بہت زیادہ ہے لیکن بدقسمتی سے یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ اس لئے عمل ہمیشہ خیال سے کم اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ مایا کی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے تخئیلین کے نزدیک علم کا کام یہ ہے کہ حقیقت کے رموز کھولے بجائے اس کے

کہ اس قسم کی واقفیت حاصل کرتا رہے جس کی ضرورت معمولی روزمرہ کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے؟
مندرجہ بالا اقتباس مارکسی فلسفہ میں سے پیش کیا گیا ہے۔ فی زمانہ مسلمانوں کا بھی یہی تخیلی (صوفیانہ زاویہ نگاہ رہ گیا ہے!)
بسیط اقتباسات بخوف طوالت نظرانداز کئے گئے۔
غرض یہ عرض ہے کہ مکالمہ کا ہر خیال اقبال اور کارل مارکس کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ خیالی مکالمہ محض دو مفکروں کے فلسفوں کے فرق کی سعی بھی جائے۔ اور اگر میں نے علامہ اقبال کے سمجھنے میں کچھ غلطی کی ہو تو ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کر دیں۔ (م۔م جوہر)

**مارکس۔** اس وقت آپ کچھ سوچ رہے ہیں کیا مسئلہ زیر غور ہے؟

**اقبال۔** مسلمانان عالم کے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ان میں جذبۂ عمل، خوداعتمادی اور بے خوفی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔

**مارکس۔** میرے خیال میں مسلمانوں کا زوال اس لئے ہوا کہ ان کا فلسفۂ زندگی مسخ ہو گیا۔

**اقبال۔** درست فرمایا مسلمانوں کے فلسفۂ زندگی کی داستان بھی عجیب ہے۔ شاید آپ کو علم ہوگا کہ مسلمانوں میں صوفیوں کے دو گروہ ہیں جس میں ایک کے بموجب زندگی کا مقصد ہستی کو اُبھارنا شخصیت کو جلا دینا اور انفرادیت کو مستحکم کرنا ہے۔ ان تینوں خصوصیات کو وہ گروہ خودی کے نام سے پکارتا ہے اور اسی شخص کو صاحب کمال یعنی قلندر سمجھتا ہے جو اپنی خودی کو اتنا ہمہ گیر بنائے کہ خدا کو اپنے آغوش میں لے لے دوسرے گروہ کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے اس کے مطابق وہ شخص قلندر ہے جو اپنی شخصیت اور انفرادیت کو اس درجہ مٹائے کہ اپنے آپ کو خدا میں ضم کر دے اور بس۔

**مارکس۔** درست۔ یہ نظریئے ایک دوسرے کی تکرار ہیں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟

**اقبال۔** میں نے صاف طور پر کہہ دیا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

میرے نزدیک ہر شے کا مقصد اپنی ہستی اور انفرادیت کو جلا دینا ہے۔ میں اپنی ہستی کو کسی دوسری ہستی میں ضم کرنے کا قائل نہیں ہوں بلکہ دوسری ہستی کو اپنی آغوش محبت میں لینے کا قائل ہوں اگرچہ قطرہ سہی لیکن سمندر میں ملنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اندر سمندر کی سی وسعت و طغیانی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہر ہستی اپنی انفرادیت قایم رکھنا چاہتی ہے اور انسان اسی لئے اشرف المخلوقات ہے کہ اس میں اپنی

خودی مستحکم کرنے کا جذبہ اپنی پوری آب وتاب سے جلوہ گر ہے میں نے کہا ہے۔

چوں حیات عالم اززور خودی است — بس بقدر استواری زندگی است

چوں زمیں برہستی خود محکم است — ماہ پابند طواف پیہم است

ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است — پس زمیں مسحور چشم خاور است

خودی کو مستحکم بنانے کے لئے عمل ضروری ہے۔ انسان کا طرۂ امتیاز تخلیقی عمل ہے۔ وہ دوسری مخلوق کی طرح کسی خاص راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں بلکہ انسان کو صحیح وغلط راستہ منتخب کرنے کا اختیار ہے۔ اس آزادی واختیار سے غلطی کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ یہ غلطی کرنے کا امکان انسان کو تجسس وفکر اور اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زندگی ہم فانی وہم باقی است — ایں ہمہ خلاقی ومشتاقی است

زندۂ! خلاق شو مشتاق شو — ہم چو ما گیرندۂ آفاق شو

درشکن آنرا کہ ناید ساز گار — از ضمیر خود دگر عالم بیار

ہر کہ اورا قوت تخلیق نیست — پیش ما جز کافر و زندیق نیست

بندۂ آزاد را آید گراں — زیستن اندر جہان دیگراں

بندۂ آزاد قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول پر تخلیقی عمل کرکے خود اپنا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس میں رہتا ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ میں بھی تخلیقی عمل کا قائل ہوں لیکن کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال وعمل ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے لکچروں میں یہ کہا ہے "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی ہمارے سامنے یہ حقیقت بے نقاب کررہی ہے کہ اسلام کا بنیادی تخیل نہ قومیت ہے نہ سامراج بلکہ جمعیت الاقوام ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ جمعیت الاقوام کا تخیل ترقی یافتہ ماحول ہی میں پیدا ہوسکتا ہے جبکہ مختلف اقوام کے نمائندے ٹیلیفون تار اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے اپنی اپنی حکومتوں سے برابر تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو سال قبل جمعیت الاقوام کا تخیل پیدا ہی نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ

اس زمانے میں نہ جمعیت الاقوام بنانے کی ضرورت تھی اور نہ وہ حالات موجود تھے جو ایسی جمعیت کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام کا تخیل بین الاقوامی ہے غلط ہے۔

اقبال۔ آپ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیال و عمل کسی خاص ضرورت کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ضرورت ماحول کے تابع ہوتی ہے اس لئے کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں! خیال و عمل کی نوعیت کا دارومدار انفرادی یا اجتماعی ضرورت پر ہے اور ضرورت کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے ماحول سے میری مراد نہ صرف قدرت کے عملیات ہیں بلکہ وہ تمام اشیا بھی ہیں جو انسان کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہیں لیکن معاملہ یہاں ہی ختم نہیں ہوتا۔ ضرورت سے متاثر ہو کر انسان کے دماغ میں ماحول کے امکانات کی بموجب چند خیالات پیدا ہوتے ہیں پھر ان خیالات کی بموجب انسان عمل کرتا ہے اس عمل سے انسان کے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے پھر یہ بدلا ہوا ماحول انسان کی ضرورتوں اور نتیجتاً خیالات کو بدلتا ہے اور پھر ان خیالات کی بموجب انسان اپنے ماحول کو بدلتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ میں نے اپنی کتاب سرمایہ کے صفحہ اول پر یہ کہہ دیا تھا کہ انسان قدرت پر عمل کر کے اس کو بدلتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ میں مذہب کو بھی ماحول کا پابند سمجھتا ہوں کسی زمانہ کے مذہبی اصول اسی زمانہ کے ماحول اور ضرورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور چونکہ ماحول اور ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں اس لئے مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے زاویہ نگاہ کے مطابق مذہب کی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اسی لئے آپ کو مذہب میں اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہر وہ شے جو انسان اور ماحول کی پیدا کردہ ہو اس کو بھی بدلنا چاہئے۔ مذہب کو بھی آپ انسان اور ماحول کی پیداوار خیال کرتے ہیں؟

مارکس۔ قطعی۔

اقبال۔ لیکن مذہب کا معاملہ دوسرا ہے وہ عشق و نظر کا معاملہ ہے۔ اس میں استحکام بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ مذہب ارتقا کے خلاف نہیں ہے لیکن دنیا جہاں ادلتی بدلتی بنتی بگڑتی رہتی ہے وہاں اس میں ایک اٹل اور لافانی عنصر بھی ہے ؎

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا　　نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام

تفسیر لکھنے اور اجتہاد کرنے کا میں قائل ضرور ہوں لیکن میں مذہب کو ماحول کے مطابق بدلنا نہیں چاہتا بلکہ مذہب کے اصولوں کو ماحول کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

**اقبال۔** اقبال صاحب! اصول واضح کرنے ہی میں تو ساری تبدیلی کر دی جاتی ہے کسی اصول کے الفاظ تو وہی رکھے جاتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل دیا جاتا ہے۔ عورت کی آزادی کا مسئلہ لیجئے جس معاملہ میں آپ بہت رجعت پسند معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک جزوی بات عرض کرتا ہوں فرض کیجئے کہ یہ اصول قائم کیا جائے کہ عورت کو زینت و زیبائش نمایاں نہیں کرنی چاہیئے۔ بظاہر بہت معصوم اصول معلوم ہوتا ہے اور یکبارگی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف زیبائش ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عورت کی غلامی اور آزادی کا مسئلہ ہے۔ آپ یہ غور فرمائیں کہ لفظ زینت و زیبائش کی کئی طریقہ پر تفسیر کی جاسکتی ہے اور اس لفظ کو کئی مفہوم دے جاسکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں ماحول کی ضرورت سے متاثر ہو کر عورت کی زیبائش سے مراد اس کی آواز، چال، ڈھال رنگ روپ چہرہ مہرہ لیا جاتا تھا اور زینت نمایاں نہ کرنے کے اصول کی اس طرح تفسیر کی جاتی تھی کہ عورت مقید ہو کر رہ جاتی تھی اب جبکہ سماجی زندگی میں عورت کے حصہ لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور ماحول بدل رہا ہے تو زینت و زیبائش سے صرف بُندے، چوڑیاں، زیور مراد لی جانے لگی ہے اور عورت کو چہرہ بے نقاب کرنے اور وقت ضرورت نامحرم سے گفتگو کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زینت کے لفظ کا مفہوم بدل دینے سے عورت قید سے آزاد ہو گئی۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ زندگی اپنے ساتھ ساتھ لفظ کا مفہوم بھی بدل ڈالتی ہے۔ جب آپ کسی مذہبی اصول کو مندرجہ بالا طریق پر واضح کرتے ہیں تو گویا آپ الفاظ تو وہی رکھتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بدل ڈالتے ہیں۔ مجھے یہ باور کرنے میں تامل ہے کہ ایک ہی دائرے میں رہ کر اصول اس قدر بدلا جا سکتا ہے کہ اس کے بالکل برعکس نتیجے برآمد ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر آپ الفاظ کا مفہوم بدل کر اصول بدل ڈالتے ہیں اور کہتے یہ رہتے ہیں کہ اصول اپنی جگہ قائم ہے نفس اصول الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کا

مفہوم ہوتا ہے جس کو ضرورتاً بدل دیا جاتا ہے۔

اقبال۔ لیکن عورت کی زینت کا مسئلہ تو کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے اگر جزوی باتوں کو ماحول کے اثر سے
بدل بھی دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے

مارکس۔ چلئے آپ نے یہ تو مانا کہ جزوی امور ماحول کے پابند ہوتے ہیں۔

اقبال۔ اس امر کو مان لینے میں کیا مضائقہ ہے لیکن اصول کو نہیں بدل سکتے۔ مساوات کا اصول لیجئے جب
ہم نے یہ اصول مان لیا کہ بنی نوع انسان میں مساوات ہونی چاہیے تو سماجی اور انفرادی زندگی
کی تشکیل اس طریقہ پر کرنی ہوگی کہ یہ اصول نہ ٹوٹے لیکن طریقہ کار بدل سکتے ہیں۔

مارکس۔ لیکن دیگر اصولوں کی طرح مساوات کے اصول کا مفہوم بھی ہر زمانہ میں اس زمانے کے ماحول
کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ آج سے چند صدی پیشتر جب اجناس تجارت کے لئے بننی شروع ہوئیں
اور خرید و فروخت کا سلسلہ اتنا ترقی کر گیا کہ بازار اور منڈیاں پیدا ہو گئیں اور اس امر کا امکان
پیدا ہو گیا کہ غریب انسان بلا غلامی قبول کئے بھی پیٹ بھرلے تو اس وقت مذاہب نے مساوات
کو اپنا بنیادی اصول بنایا لیکن غلام رکھنے کی اجازت دینا اصول کو ماحول کے مطابق لانا تھا۔ مذاہب
نے مساوات کا اصول بھی قایم کیا لیکن غلام، بیگاری اور مزدور کے درجہ کی بھی حمایت کی۔ امیر اور
غریب کے فرق کو بھی مستقل طور پر سماجی زندگی کا جزو بنایا لیکن اس ماحول میں وہی ہو سکتا تھا جو کچھ کیا
گیا لیکن آج کل کے ماحول نے مساوات کے لفظ کو نیا مفہوم دیا ہے۔ آج کل دنیا مساوات قائم
کرنے کے یہ معنی سمجھتی ہے کہ سماج کو انفرادی ملکیت سے نجات دلائی جائے اور اقتصادی مساوات
قائم کی جائے۔ میں بھی مساوات کا قائل ہوں لیکن میرے اور آپ کے مساوات کے مفہوم میں
زمین آسمان کا فرق ہے اگر آپ یہ فرمائیں کہ دیکھو مارکس بھی ہمارے مساوات کے اصول کا قائل
ہے تو یہ کتنا غلطی ہوگی کیونکہ اگرچہ میں بھی اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے مساوات ہی کا لفظ
استعمال کرتا ہوں لیکن اس لفظ سے میرا مفہوم مساوات کے اسلامی مفہوم سے بہت جدا ہوتا ہے
کسی زمانہ میں انسان کا ماحول قدرت کا عطا کردہ تھا لیکن اب انسان نے اپنے عمل سے ایک

نیا ماحول پیدا کر لیا ہے جس کے سامنے قدرتی ماحول کی اہمیت نسبتاً بہت کم رہ گئی ہے۔ اب ہمارا ماحول دریا، پہاڑ، میدان نہیں ہیں بلکہ انجن، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو وغیرہ ہیں۔ یہ نیا ماحول نئے امکانات اور نئی ضرورتیں پیدا کر کے ہمارے دماغ میں نئے خیالات پیدا کر رہا ہے اور ہم کو نئے طریقہ پر عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس وقت یہ تلقین کرنا کہ پرانے تخیلات کو از سر نو زندہ کیا جائے رجعت پسندی ہے۔

**اقبال۔** تو یوں فرمائیے کہ انسان اپنے کردار کے ماحول میں رہتا ہے۔ انجن وغیرہ کیا ہیں یہ لوہے کی شکل میں انسان کا صدیوں کا تفکر و عمل ہی تو ہے۔

**مارکس۔** درست فرمایا۔ انجن صدیوں کے انسانی تفکر و عمل کی داستان ہے۔ انجن لوہے کی شکل میں انسانی ذہن ہے انسان جب تک اپنے تخیل کو مادی شکل نہ دے اس وقت تک اپنی خودی کو نمایاں نہیں کرتا۔

**اقبال۔** آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فکر سے اپنے آپ کو بدلتا ہے۔

**مارکس۔** جی ہاں اس خیال کو میں اس طرح بیان کرتا ہوں کہ طریقہ پیداوار سماجی تخیل اور عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ طریقہ پیداوار مادی شکل میں کسی سماج کا صدیوں کا فکر و عمل ہوتا ہے۔ سماج اپنے فکر سے اپنے فکر کو بدلتی ہے یا یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ انسان اپنے عمل سے اپنے عمل کو بدلتا ہے۔

**اقبال۔** درست آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں۔

**مارکس۔** ہمارا خیال ہمارے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہمارا ماحول ہمارے خیال و عمل کا لیکن میں ماحول کو مقدم اور خیال کو موخر سمجھتا ہوں یعنی پہلے وجود بعد میں شعور، شعور وجود کا محتاج ہے لیکن جہاں تک خودی کو مستحکم کرنے کا تعلق ہے مجھے آپ سے قطعی اتفاق ہے۔ خودی صرف عمل سے مستحکم ہو سکتی ہے

**اقبال۔** لیکن ایشیا والوں کی بدقسمتی دیکھئے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ صرف مراقبہ ہی سے انفرادیت یا خودی مستحکم ہوتی ہے حالانکہ خودی اس وقت جلا پاتی ہے جبکہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ تجربہ کرتا ہے اور بہت غور و فکر کے بعد بہت سی غلطیاں کرنے کے بعد وہ ایک راہِ راست تلاش کرتا ہے۔ جب انسان وہ کام کرتا ہے جو خدا کرتا ہے اس وقت انسان کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ خدا بھی مادہ کی شکل بدلتا ہے

اور انسان بھی۔ خدا لوہا پیدا کرتا ہے تو انسان پہاڑوں میں سے نرم لوہا نکال کر اس کا فولاد بناتا ہے میں نے اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم | سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم | من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

جب تک عمل فکر کا ساتھی نہ ہو اس وقت تک خودی مستحکم نہیں ہو سکتی ؎

خیز و خلاق جہان تازہ شو | شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
دم بدم مشکل گرد آسان گذار | دم بدم نو آفریں و تازہ کار

انسان خود مختار پیدا ہوا ہے اور خیر و شر کرنے پر قادر ہے۔ وہ سورج کی طرح ایک راستہ چلنے پر مجبور نہیں۔ عمل کی آزادی ہی خودی کو مستحکم کرتی ہے اور یہ معاملہ صرف افراد کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ قوموں کی خودی بھی آزادئ عمل سے مستحکم ہوتی ہے میں انسان کو جنت سے نکالے جانے کے قصہ کو بھی اسی زاویہ سے دیکھتا ہوں جنت میں انسان سورج کی طرح ایک قانون میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ خیر ہی خیر کر سکتا تھا اور اس پابندی کی وجہ سے وہ اپنی انفرادیت کو مستحکم نہیں کر سکتا تھا۔ جنت سے نکالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آزادئ عمل حاصل کی اور خیر و شر کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا اور یہی ایک راستہ خودی کو مستحکم کرنے کا ہے کہ انسان اپنے عمل کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی راہیں ڈھونڈے ؎

از گل خود آدمی تعمیر کن | آدمی را عالمے تعمیر کن

**مارکس۔** مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔ انسان اور اس کا ماحول آپس میں ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ انسان اسی وقت مہذب کہلاتا ہے جبکہ وہ فکر و عمل سے قدرت کی طاقتوں پر قابو پا لیتا ہے اور اپنے لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جس میں رہ کر وہ بہتر انسان بن سکے

**اقبال۔** لیکن میں خودی کی ترقی کے لئے ایک اور امر بھی اہم خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی دوسرے کے افکار و عمل

کی نقالی سے خودی طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور ہوتی ہے۔ فرد کی خودی اس کی اپنی سماج کی کلچر اپنی تہذیب و تمدن میں رہ کر ترقی کر سکتی ہے کسی دوسری قوم کی کلچر اور تہذیب کی تقلید سے خودی کمزور ہوتی ہے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش　　　براہ دیگراں رفتن عذاب است

مارکس۔ اب تو دنیا کی مختلف قوموں کی کلچر ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک نئی کلچر پیدا ہو رہی ہے جو تمام دنیا کی مشترکہ کلچر ہو گی۔ یہ کلچر تمام دنیا کے مزدوروں کے باہمی ارتباط سے پیدا ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک و قوم کی خاص کلچر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص دور میں کسی خاص طبقہ کی خاص کلچر ہوتی ہے مثلاً اگر یورپ کے جاگیردار دور کے جاگیردار طبقہ کی کلچر کا مقابلہ ہندوستان کے جاگیردارانہ دور کے جاگیردار طبقہ سے کی جائے تو معلوم ہو گا کہ یورپ کے جاگیردار اور ہندوستان کے جاگیردار میں کوئی فرق نہیں اسی طرح یورپ کے بیگاری اور ہندوستان کی بیگاری کی کلچر ایک تھی۔ اس وقت جو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ مشرق یورپ کی کلچر اختیار کرتی جا رہی ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ دور شروع ہوئے مدت ہوئی اور اس دور نے یورپ کو ایک خاص کلچر دی اب چونکہ ایشیا میں بھی وہی سرمایہ دارانہ دور حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے ایشیا میں سرمایہ دارانہ دور کی کلچر رواج پاتی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ ہر عبوری زمانہ میں ہوتا ہے یہ تبدیلی بہت خرابی کے بعد اپنی اصلی شکل اختیار کرے گی۔ کلچر بھی ارتقائی شے ہے۔ ایک ہی ملک میں مختلف طبقوں کی مختلف کلچر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ماحول بدلتا جاتا ہے کلچر بدلتی جاتی ہے۔ مختلف طبقوں کی محبت، مروت، وفاداری، خودداری، حیا و شرم۔ سچ جھوٹ کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔

اقبال۔ یہ تو درست ہے کہ دنیا میں ایک مشترکہ کلچر نمودار ہو رہی ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اپنی ہی کلچر کو ضرورت کے مطابق بدلنا چاہیئے۔ میں کسی دوسرے کا بچہ خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اپنی بغل میں نہیں لے سکتا۔ میں اپنا ہی بچہ پیدا کرنے اور پرورش کرنے کا قائل ہوں ؎

تا کجا در تہ بال دگراں می باشی　　　در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز

**مارکس۔** لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جس طرح ایک عورت جوانی کو کارآمد نہ بنائے تو ۵۰ برس کے بعد اگر چاہے بھی تو اولاد پیدا نہیں کر سکتی اور کسی دوسرے کا بچہ گود لینے پر مجبور ہوتی ہے اسی طرح اگر ایک قوم مدت تک بے عمل رہے تو وہ اپنی تخلیقی قوت کھو دیتی ہے اور پھر اگر ترقی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی بلکہ اس کو ترقی یافتہ قوم کا طریقۂ کار اور تہذیب و تمدن اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایشیا کی اقوام ترقی کی دوڑ میں اس وجہ پیچھے رہ گئی ہیں کہ اب ان کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ نہ صرف مغرب کا آلاتی طریقہ پیداوار اختیار کریں کہ بلکہ جو اشتراکی کلچر اس وقت یورپ میں پیدا ہو رہی ہے اس کی تعیر میں پورا حصہ لیں۔

**اقبال۔** دلا نارائی پروانہ تاکے — نگیری شیوہ مردانہ تاکے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز — طواف آتش بیگانہ تاکے

**مارکس۔** لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ ایشیا کا اپنا سوز تو ختم ہو گیا۔ اب تو ایشیا میں تخلیقی شعلہ اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے تفکر و تدبر صنعت و حرفت کی چنگاری مستعار لے۔

**اقبال۔** از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر — از گدائی گدیہ گر نادار تر

**مارکس۔** میں کب کہتا ہوں کہ آپ گدا بن کر سوال کریں یورپ کی تہذیب و تمدن صنعت و حرفت قرض لیجئے اور یہ قرض معہ سود کے ادا کر دیجئے گا۔ یورپ نے بھی تو ایشیا سے علم و فضل لیا مغرب کو مشرق ہی نے مذہب دیا یہ یورپ کی قابلیت ہے کہ انھوں نے ایشیا سے قرض لے کر کام شروع کیا اور اسکو اتنا بڑھایا کہ اب وہ اس قابل ہیں کہ ایشیا کو قرض دیں۔ آخر ایشیا یورپ سے قرض لینا کیوں کسرشان سمجھتی ہے۔

**اقبال۔** ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست — تجلی دگرے درخورِ تقاضا نیست

**مارکس۔** لیکن یورپ نے بھی تو ایشیا کے شعلہ سے اپنی آگ روشن کی تھی اب ایشیا کو یورپ کی چنگاری سے اپنی شمع روشن کرنے میں کیوں عار معلوم ہوتا ہے۔

اقبال۔ اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں  سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

مارکس۔ لیکن ہندوستان کی قوت عمل تو شل ہو چکی ہے اب وہاں مینا و جام کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

اقبال۔ لیکن قوت عمل کسی زمانہ میں تو جدت طراز تھی اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ کسی زمانہ میں ایشیا یورپ کا استاد تھا آخر وہ تخیلات اور جدت عمل ایشیا ہی میں پیدا ہوئے تھے جن کی بدولت وہ یورپ کا استاد بنا وہ تخیلات آج بھی ہماری روایات اور کتابوں میں موجود ہیں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔ میرا مقصد حیات صرف یہ رہا ہے کہ ان پرانے تخیلات کو از سر نو جگا دیا جائے۔ میں مغربی فکر و عمل کا مخالف نہیں ہوں میں نے خود کہا ہے ؎

علم و فن را اے جوان شوخ شنگ  مغز می باید نہ ملبوس فرنگ

قوت افرنگ از علم و فن است  از ہمیں آتش چراغش روشن است

لیکن مغربی تہذیب و تمدن کے جو خراب پہلو ہیں میں ان کا مخالف ہوں۔ یورپ کی عریانی مجھے نہیں بھاتی اور جس درندگی کا ثبوت یورپ آج دے رہا ہے وہ اس کی کلچر کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔

مارکس۔ خراب پہلو۔ خوب اور ناخوب کی تکرار ہی تو ارتقائی حرکت پیدا کرتی ہے۔ شیطان کی کارفرمائی ہی سے تو مشت خاک میں ذوق نمو ہے۔ اگر رزم خیر و شر نہ جاری رہے تو ارتقا ہی بند ہو جائے۔ یورپ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ درندگی کا مظاہرہ نہیں ہے۔ بلکہ جیسا آپ نے کہا ہے ؎

جہان نو ہو رہا ہے وہ عالم پیر مر رہا ہے  جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جب بچہ ہوتا ہے تو ماں کو درد و تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کوئی شے بلا درد و کرب کے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب ایک سماج کے بطن سے دوسری سماج نکلتی ہے تو تمام دنیا درد و کرب محسوس کرتی ہے۔ یورپ میں جہان نو پیدا ہو رہا ہے لیکن ایشیا والے آج کل مغربی تہذیب کے متعلق آپ کا یہ شعر بہت پڑھتے ہیں ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی  جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کا ہنگامہ خودکشی نہیں بلکہ جراحی ہے۔ بنی نوع انسان کے جسم پر سرمایہ داری

کا جو پھوڑا نکل آیا تھا اس میں شگاف دیا جا رہا ہے۔

رہا یہ امر کہ ایشیائی قوت تخلیق کو پرانی روایات و تخیلات کے ذریعہ سے از سر نو زندہ کیا جا سکتا ہے تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے خود ایک جگہ اس قول کی تائید کی ہے کہ تاریخ عالم کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ جن روایات و اقوال کو کسی قوم نے مردہ ہونے دیا ہو ان خیالات و اقوال کے ذریعہ سے اس قوم میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی" میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ پرانی روایات کو زندہ کر کے قوم کو زندہ نہیں کر سکتے جس طرح پرانی دوا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ اسی طرح پرانی روایات اور کہنہ اصطلاحات و تخیلات بھی انسانوں پر اثر کرنا چھوڑ دیتے ہیں یا یوں کہئے کہ جس طرح مدت تک شراب پیتے پیتے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے کہ پھر پرانی خوراک اس پر اثر نہیں کرتی اسی طرح پرانی روایات سنتے سنتے مسلمان ان کے سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب وہ ان پر اثر نہیں کرتیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

م م جوہر صاحب میرٹھی

# ارتباطِ نصاب

(یہ چند الفاظ نصابی مضامین کے ربط پر ایک مختصر مقالے کے سلسلے میں تمہیدی طور پر لکھے گئے تھے)

کہتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا راز اس کے حرفے میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت کا راز اس کے اپنا خرچ آپ چلانے میں ہے۔

لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس کی کامیابی کا راز اس کے ارتباط میں ہے۔ اس کا وہ ارتباط جو نصاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصے سے، ایک مضمون کو دوسرے مضمون سے اور پورے مدرسے کو پوری زندگی سے مربوط کر دیتا ہے

جس طرح اتحاد ہماری سماجی زندگی کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی طرح ارتباط ہماری بنیادی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے جس طرح ہم سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے گلے کاٹنے والے مقابلے کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم نصابی زندگی میں بھی مضامین کے باہمی تصادم اور ٹکراؤ کو ختم کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ہماری تعلیمی گاڑی میں ہمارے مضامین پرانے رومن رتھوں کے گھوڑوں کی طرح برابر برابر جُتے ہوئے ہیں جو اکثر باہم مل کر کھینچنے کی بجائے ایک دوسرے کو دولتیوں اور کاٹ کھانے کے آداب بجا لاتے رہتے ہیں۔ ہمارے طلبا اور ہمارے استاد ہمارے اسکول اور ہمارے نصاب، ہمارے چھوٹے اور ہمارے بڑے سبھی ایک سماجی تعلیمی معاشی گھوڑ دوڑ میں مشغول ہیں۔ اس کے داؤں کہیں دولت کے منافع ہیں اور کہیں امتحانوں کے نمبر ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایک تعاونی کوشش سے آپس میں سر جوڑ کر کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے والا جذبہ پیدا کریں۔ اس جذبے کے پیدا کرنے کی صحیح راہ ہمیں بنیادی اسکیم نے بتائی ہے ارتباط، رہن سہن کے اسی اصول کا نصابی پہلو ہے

آپ نے پرانے مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کے پڑھے لکھے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ آپ نے اکثر ان کی کمزوریوں اور ان کی تعلیم و تربیت کے کچے پن، ان کی خامیوں پر تو سوچا ہی ہوگا لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اکثر ان پرانے لکھوں پڑھوں کے کردار میں، ان کے کیرکٹر میں کیسی ہم آہنگی، کیسا توازن اور وزن ہوتا ہے۔ اس

ہم آہنگی کو ہم آج کل کے لکھوں پڑھوں میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے۔ اس ہم آہنگی اُس توازن کا راز کیا تھا۔
اگر ہم پرانے نصاب پر ایک ہمدردانہ نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ اس کا ایک بڑا سبب نصابی ارتباط تھا
وہ ارتباط جو کتب کو زندگی سے مربوط کرتا تھا، وہ ارتباط جو ایک مضمون کو دوسرے سے مربوط کرتا تھا۔ اس جاری
وساری اصول کو خواہ آپ مذہبی یا روحانی ماحول کا نام دیں یا اسے انسانیت کی روح بتائیں۔ اس سے انکار نہیں
کیا جا سکتا کہ ان مدرسوں کی فضا میں ایک توازن تھا جو غیر شعوری طور پر ان کے اداروں کو ان کی فضا کو ان کے
بچوں کو اور ان کے بڑوں کو گرمائے ہوئے تھا۔

کسی شاعر نے کہا ہے کہ نئی عمارت کی اٹھان اُس کی تعمیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم پرانی بنیادوں کو جڑ
سے اکھاڑ کر پھینک دیں لیکن پرانی تعلیم کی جڑوں کو اڑا دینے کی بارود نہ تو حرفہ ہے نہ اپنا خرچ آپ
چلانے کا پہلو ہے۔ یہ بارود تو ارتباط نصابی ہے اگر ہم ارتباط کو کامیاب کر دکھائیں گے تو ہم پرانی تعلیم کے کھلاڑی
کو اس کی چال پر۔ اس کی نرد پہ مات دے سکیں گے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے تعمیری میدان کھلا ہوگا جہاں ہم نئے
اصولوں نئے طریقوں کی امداد سے ایک نیا کعبہ۔ ایک نیا تعلیمی بیت المقدس تعمیر کر سکیں گے۔

عبدالغفور صاحب ایم۔ اے
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

# مارکسزم اور فلسفہ اخلاق

Feuerbach

مارکسی اخلاقیات کی بنیاد ہیگل کی جدلیات اور فیور باخ کے نظریہ سائنسی انسانیت نے ڈالی ہے فیور باخ نے وقتی قابل احترام مذہبی دینی اور مابعد الطبیعاتی عقائد سے کنارہ کش ہو کر گوشت پوست کے انسان کو اس رنگ و بو والی دنیا میں لاکھڑا کیا اس نے ہر ایک چیز کو یہاں تک کہ عقائد کو بھی انسانی معیار سے پرکھا۔ مارکس اور اینگلس نے اس مجرد تصور کو جس میں انسان جمودی فرد کی حیثیت رکھتا ہے بدل دیا۔ انھوں نے انسان کا متحرک اور اجتماعی وجود تصور کیا۔ اس طرح فلسفہ مارکس نے فیور باخ کے نظریہ انسانیت کو ترقی دے کر تاریخی اور سماجی اصولوں کو جدلیات پر پرکھ کر سمجھنے میں مدد پہونچائی۔ فیور باخ کی تنقید بہت زیادہ وسیع اور بڑی حد تک تجربی ہے اس وجہ سے ہر چیز ایک نئی روشنی میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر تھوڑے بہت دقیانوسی خیالات کے اثرات کی وجہ سے اس کے نظریہ میں کہیں کہیں مذہبی اور دینی رموز بھی جھلکتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں مذہب کی بنیادی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے یعنی یہ کہ عقائد کی بنیاد ذاتیت (Egoism) پر ہے لیکن فیور باخ کے فلسفہ میں ایک بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اس کے اور مارکس کے فلسفہ میں اختلاف ہے۔ فیور باخ کے خیال میں انسان کی ہستی اس کے احساس اور شعور کو پیدا کرتی ہے اور خود اس کے اپنے قوانین کی محکوم ہے۔ مگر آخر وہ قوانین ہیں کیا؟ وہ کس طرح اثر ڈالتے ہیں؟ فیور باخ ان سوالات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ انسان ہر چیز کی تشریح کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے خود انسان کی کوئی تشریح نہیں کی گئی اور وہ خود اپنی جگہ پر ایک ناقابل تشریح قسم مان لیا گیا۔

**مارکس نے کس طرح تشریح کی** | مارکس نے یہ بتایا کہ انسان کا شعور اس کے طبعی ماحول کا نتیجہ ہے لیکن انسان کا ذہنی ارتقا نتیجہ ہے سماجی ماحول کا، جو کہ بعد میں انسان کی طبعی ہستی کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر انسان کو اپنی جگہ پر مکمل معیار تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کے خیالات اور افعال ہر زمانہ اور ہر مختلف ماحول میں یکساں ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں مجبوراً یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ سچائی ایک غیر متغیر چیز

ہے اور اخلاقی کے قوانین بھی کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔

انسان کی ہستی کو قائم رکھنے کی جد وجہد انفرادی نہیں اجتماعی ہے تاریخ کے آغاز سے ہی انسان کی ہستی سماجی ہے اس لئے انسان کی ہستی اور اس کے خیالات جن قوانین کے محکوم ہیں انھیں ہم کو اس کے اجتماعی روابط میں تلاش کرنا چاہیئے۔ مارکس نے تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی شعور اس ماحول کی پیداوار ہے جس میں وہ اپنی معاش پیدا کرتا ہے اور چونکہ معاش پیدا کرنے کے طریقے مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسان کے خیالات اور ان کے اظہار کرنے کے طریقے بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب، فلسفہ، اخلاقیات، جمالیات اور قوانین سب ایک قسم کے ذہنی ڈھانچے ہیں۔ ان کی بنیاد معاشی روابط پر مبنی ہے جن سے افراد کی جماعتیں مبنی ہیں۔

زندگی کا بنیادی اصول | جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بحیثیت ایک اجتماعی ہستی کے اسے خود اپنی قسمت بنانا ہے تو وہ اپنے آپ کو مابعد الطبیعاتی فلسفہ، اخلاقیات کی زنجیروں اور عقائد کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا بنیادی اصول نہ تو بالذات سچائی ہے اور نہ مجرد نیکی۔ وہ تبدیلی یا تغیر پسندی ہے۔ ایک مسلسل ترقی جس کی وجہ سے انسان روحانی اور اخلاقی ترقی کے مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ انسان کے خیالات اور نصب العین ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کی تاریخ تمدن اس تبدیلی کے عمل کی شاہد ہے۔ پرانے زمانہ میں سماجی تبدیلیاں بے تکے پن سے ہوتی تھیں۔ مگر جب سے انسان نے سائنس کی معلومات کے ذریعہ سے ایک طاقت حاصل کر لی ہے اس وقت سے اس نے مستقبل کی ترقی کے راستوں پر عبور حاصل کر لیا ہے۔ اسی وجہ سے خیالات کو ایک حسب اختیار تمیزی طاقت حاصل ہوگئی ہے اور انسان نے انھیں انسانی وجود سے متعلقہ باتوں پر ایک طرح کا عبور حاصل کر لیا ہے۔ چنانچہ اب پہلے سے ایک خاکہ تیار کر کے سماجی تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے فلسفہ اخلاق کو بھی تغیر پسند ہونا چاہیئے تاکہ وہ انسانیت کے آنے والے سماجی ڈھانچے کو مزید اونچے معیار پر پہونچا سکے صرف وہی اصول اور معیار جو مجموعی سماج کے تجربات سے اخذ کئے جاسکتے ہیں عام مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے دعویدار ہو سکتے ہیں کہ عوام ان پر عمل پیرا ہوں۔ یہ اصول اور معیار کسی طرح بھی مفاد عامہ کے متضاد نہیں ہو سکتے اس طرح اخلاقیات کے تصورات جو تجربہ پر مبنی ہوں سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہیں۔

روایتی فلسفہ اخلاق | فلسفہ اخلاق اپنی روایتی شکلوں میں جس کے اصول مقرر ہوتے ہیں ہمیشہ قائم شدہ سماجی نظام کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہی اصولوں کو جھٹلاتا ہے۔ وہ مفاد عامہ کے خلاف سماج کے صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے مفاد کو محفوظ رکھتا ہے۔ کس لئے ؟ اس وجہ سے کہ مفاد عامہ کے لئے سماجی روابط میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے

روایتی اخلاقیات کی بنیاد نیکی اور بدی صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب اور اسی قسم کے تصورات پر موقوف ہے۔ جن کی حقیقت چھوٹے نگوں سے زیادہ نہیں۔ ان تصورات کی کبھی صاف صاف تعریف نہیں کی جاتی اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ آخر ان کی ابتدا کیوں اور کیسے ہوئی ؛ ہمیں ذرا غور کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ ان تصورات میں باہم کس قدر تضاد ہے۔ جب ہمارے خیالات اور افعال ان تصورات کی مطابقت نہیں کرتے تو اس نظریہ کی رو سے برے ہیں۔ اس طرح جو چیز زمانہ حاضر میں بری ہے مستقبل میں اچھی ہے کیونکہ جب مفاد عامہ کے لئے سماجی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے تو پرانے اصولوں اور معیاروں پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور بعد میں نظرانداز کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے ؟ اسی وجہ سے کہ روایتی عقائد کے مقابلہ میں ایسی طاقتیں کام کرتی ہیں جنھیں سماجی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تبدیلی جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے زندگی کے بنیادی اصول پر مبنی ہے -

انسان فطری طور پر غیر مقلد ہے | انسان فطری طور پر غیر مقلد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ابتدائی حیوانیت کی حالت میں ہی قانع رہتا۔ اس لئے ہیگل کے الفاظ میں — "بجائے اس کے کہ پرانی باتوں کی طرح یہ دہرایا جائے کہ انسان کی فطرت نیک ہے، یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس کی فطرت بری ہے" جب کبھی بھی انسان نے کوئی قدم آگے بڑھانا چاہا اسے ہمیشہ قائم شدہ نظام کے قوانین اور روایتی اخلاقیات کے اصولوں کو توڑنا پڑا۔ غالباً اسی وجہ سے ہم ہندوستانیوں میں بھی مغربی تہذیب کو برا بھلا کہنے کی عادت ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے اصول روایتی اخلاقیات کے قوانین کے مطابق نہیں ہیں جو فرسودہ تہذیب کا آئینہ ہیں اور اسی وجہ سے برے کہے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں کے لئے مناسب اور ضروری ہیں جو رجعت پسند سماجی نظام کو ختم کرنے کے بعد فائدہ حاصل کریں گے

فلسفہ اخلاق میں اسی وقت انقلاب پیدا ہو سکتا ہے جب ہم اپنے دماغ سے اقدار مطلق کے تصور کو نکال باہر کریں۔ اسی صورت میں ہم لوگوں میں عدم تقلید کا احساس پیدا کر سکتے ہیں جو کہ زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ مارکسزم ایک انقلابی فلسفہ ہے جو سماجی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے۔ جو انسان کی ترقی اور مفاد کے لئے ضروری ہے۔ مارکسزم کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اس فلسفہ اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرے جو عقائد پر مبنی ہے اس سے صرف کنارہ کشی ہی اختیار نہیں کیجاتی بلکہ مارکسزم علوم سائنس کی روشنی میں پرانے عقائد کا بھانڈا پھوڑ کر انھیں خود بخود ختم کر دیتا ہے۔

مذہب اور اخلاقیات | خاص طور پر مغرب میں اخلاقیات کی بنیاد پرانے نظریہ فطرت پرستی پر قائم ہوئی۔ اس نظریہ پر مذہب کا اثر بہت کم تھا۔ مغربی فلسفہ اخلاق کا بانی سقراط ہے جو اس زمانے کے مذہب کے مطابق دیوتاؤں کا معتقد نہ ہونے کی وجہ سے مارا گیا۔ قرون وسطیٰ میں "نظریہ انسانیت" اور "عقلی مابعد الطبیعات" نے ان جذبات کی ترجمانی کی جو اعتقادی مذہب اور باطنی دینیات کے خلاف پیدا ہو گئے تھے۔ پھر بھی فلسفہ اخلاق خواہ قدیم ہو یا موجودہ اس کے تصورات کی بنیاد عقیدہ ہے ان تصورات کا سرچشمہ وجدان (Intuition) ہے جس کی خود تشریح نہیں کی گئی۔ اس لئے مجبوراً آخری معیار وجدان ہی تصور کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ کے ایسے نظام کی بنیاد کھوکھلی اور کمزور ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمزوری کی پردہ پوشی کے لئے ایسے معیار کو مافوق الفطرت اور مابعد الطبیعاتی دنیا کے احکامات سے منسوب کیا گیا۔

فلسفہ اخلاق کا بانی تو سقراط تھا مگر اس کے شاگرد رشید افلاطون نے اپنے استاد کے اصولوں کی تشریح کی اور ان سے ایک مابعد الطبیعاتی "نظام اخلاق" اخذ کیا۔ سقراط کی غیر مذہبی تعلیم کی یہی مابعد الطبیعاتی بنیاد بعد میں جا کر عیسائی دین کی فلسفیانہ بنیاد ہو گئی۔

ہندوستان اور فلسفہ اخلاق | ہندوستان میں صحیح معنوں میں کوئی خاص فلسفہ اخلاق کا نظام تعمیر ہی نہیں ہوا جو مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ ہر نظام کی بنیاد کوئی نہ کوئی مقدس کتاب ہے۔ انفرادی اور اجتماعی افعال کے قوانین اور اصول، اخلاق کے ان تصورات سے مختلف ہیں جو انسان کو بغیر مذہبی رسومات کے ادا کئے روحانی ترقی پر پہونچاتے ہیں اس کے علاوہ ذات مطلق کا خیال جو کہ اخلاق کے اعتقادی تصورات پر مشتمل

سے ہے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے نیکی، انصاف بھلائی وغیرہ اسی قسم کے متعین معیار انسانی اعمال کے مشعلِ راہ مانے جاتے ہیں لیکن اگر کسی فلسفہ اخلاق کے ماہر سے دریافت کیجئے کہ نیکی کیا ہے؟ تو اس کے کل جواب کا مطلب یہی ہوگا کہ نیکی وہی ہے جو نیکی کے تصور سے مطابقت کرے؛ پھر اسی سے نیکی کی تعریف دریافت کی جائے تو آپ کو یہ جواب ملے گا کہ اس اصطلاح کا کوئی تجزیہ یا تشریح نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں ضمیر یا دل سے ہے!! دوسرے الفاظ میں وہ ایک مجرد تصور ہے اس لئے مابعدالطبیعاتی ہے۔

موجودہ فلسفہ اخلاق افلاطون کے فلسفہ کی ترقی یافتہ شکل ہے" اخلاقی نظام" کا یہ غیر عقلی تصور خیالی دنیا کی ایک جھلک ہے۔ اس لئے فرض کر لیا گیا ہے کہ انسان جبلی طور پر اخلاق کا معیار وجدانی مانتا ہے۔ اگر نظری اعتبار سے یہ تسلیم کر لیا جائے تو ہر شخص کا فعل اخلاقاً جائز ہے لیکن عملی دنیا میں فلسفہ اخلاق اعتقادی ہو جاتا ہے اور انسانی افعال کے لئے قوانین وضع کرتا ہے جب نظریہ اور عمل میں اختلاف ہوتا ہے تو اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ ماحول کی وجہ سے ضمیر کی روشنی کم ہوگئی یا عام الفاظ میں "قلب سیاہ پڑگیا! اس وجہ سے جبلت "اخلاقی نظام" پر عمل پیرا نہ ہوسکی۔ اس لئے نیکی جو انسان کی سرشت میں داخل ہے صرف انسانوں ہی میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو ان کے ماحول سے بلند رکھ سکتے ہیں؛ یعنی نیکی ایک منعکس شعاع ہے جو صرف پاک روحوں پر پڑتی ہے۔

فلسفہ اخلاق اضافی ہے | جب ہمیں یہ علم ہو جاتا ہے کہ مطلق سچائی ایک کھوکھلا تصور ہے تو نتیجہ میں فلسفہ اخلاق کا کل ڈھانچہ خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ انقلابی جستجو صرف موجودہ علوم سائنس کی روشنی ہی میں کی جاسکتی ہے جس کا فلسفیانہ ماحصل مارکسزم ہے۔ اخلاقی اقدار مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ ایک چیز اگر انسان کے لئے اچھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کے لئے بھی اچھی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بری ہو۔ پھر کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا وقتی بھی ہوسکتا ہے۔ آج ایک چیز اچھی ہے وہی کل بری بھی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کوئی چیز بھی بذات خود اور قطعی طور پر اچھی یا بری نہیں کہی جاسکتی نظریہ قطعیت کو اس رنگ و بو کی دنیا کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نظریہ کی اہمیت جس کی بنیاد عقیدہ اور مابعد الطبیعات پر ہو خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح سائنس نے فلسفہ اخلاق میں ایک انقلابی روح پھونک دی ہے۔

نظریہ انسانیت کیوں مناسب نہیں ہے | نظریہ انسانیت اگرچہ عقائد کی سختیوں کو جنھیں مافوق الانسان قسم کی

چیزوں کی سرپرستی حاصل ہے ختم کرنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ یہ سختیاں جو اخلاقیات یا دوسرے ذرائع سے عائد کی جاتی ہیں صرف اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب ہم مافوق الانسان چیزوں کے بجائے خارجی تجربی اور قابل فہم فطرت کی حقیقتوں کو انسانی افعال کردار کا معیار مانیں نظریۂ انسانیت ایسا نہیں کرتا۔ وہ مافوق الانسان طاقت سے تو جھگڑتا ہے مگر انسان کے مجرد تصور کو فطرت سے بلند رکھتا ہے۔ اس طرح ہمیں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی کیونکہ انسان کو خاص، وقتی، تاریخی اور اجتماعی ماحول سے علیحدہ رکھا جاتا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ انسانی فطرت کو دائمی، غیر متبدل اور جبلی طور پر یک تصور کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے ایسے تصور اور روح کی ابدیت میں نیز مافوق الانسانی چیزوں اور مابعد الطبیعاتی اخلاقی نظام میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دونوں میں خارجی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

انسانی فطرت بدلتی رہتی ہے

انسان مافوق انسانی اور مابعد الطبیعاتی رموز کی سختیوں اور تشدد سے اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب اپنے آپ کو اس طبعی دنیا کا ایک جز سمجھنے لگے۔ فلسفہ اسی وقت مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے جب انسانیت کا نظریہ فطرت پر مبنی ہو نہ کہ اخلاقیات پر۔ انسان کی فطرت اسی طرح تغیر پسند ہے جس طرح فطرت کے دوسرے پہلو متغیر ہیں۔ اگرچہ انسان میں ذہنی اور چند باقی کیفیات پائی جاتی ہیں مگر وہ پھر بھی طبعی کائنات کا ایک جز ہے۔ اس لئے انسان کی فطرت کا ابدی اور غیر متغیر تصور جس کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی اخلاقی اقدار کا آخری معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انسانی فطرت چونکہ بدلتی رہتی ہے اس لئے قدر کے معیار بھی بدلتے رہنا چاہئیں۔ اگر ہم ذرا سمجھ کر اجتماعی ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم مجبور ہوں گے کہ انسان کی غیر متغیر فطرت کے تصور کو خیرباد کہدیں۔

اخلاق کے معیار زمان و مکان کے اعتبار سے بلحاظ طبعی ماحول اور سماجی حالات جن میں کہ انسان رہتا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ انسان ایک اجتماعی حیوان ہے اس کی فطرت اسی ماحول سے بنتی ہے جس میں وہ سوسائٹی کے مفاد کے لئے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے کام کرتا ہے یا کام کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ انسانی سوسائٹی ایک جامد اور بے جان جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے وجود کو قائم رکھنے کے ذرائع اور طریقے اور اس کی اجتماعی ترقی اور مفاد کی وجوہات بدلتی رہتی ہیں جن سے انسان کے اخلاقی تصورات پر اثر پڑتا رہتا ہے۔ انسان کی کوئی انفرادی ہستی نہیں ہے اور نہ وہ اجتماعی روابط سے آزاد ہے۔ اسے اپنی انفرادیت کا خیال بحیثیت جماعت کے

ایک فرد کے ہوتا ہے۔ اس انفرادیت کو بنانے والا بھی جماعت کا ماحول ہوتا ہے۔ انسان مجموعہ ہے تاریخی اور اجتماعی تجربات کا۔ اس لئے اخلاقیات ایک اجتماعی فلسفہ ہے۔ اخلاق کے قوانین سماجی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنتے ہیں۔ اس لئے اقدار کا معیار جماعت کا مفاد ہے۔

**مارکسی اخلاقیات** فلسفہ اخلاق کے تصورات ذہنی، مابعد الطبیعاتی، باطنی اور غیر استدلالی ہیں۔ مثلاً نیکی بذات خود ایسے تصورات کا مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر قائم شدہ سماجی نظام کو قائم رکھنا ہے جو سماج کے کسی ایک طبقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ ایسا فلسفہ کل سوسائٹی کے عام مفاد کا ہمدرد نہیں ہو سکتا۔ ایک غیر متغیر مطلق اخلاقی نظام پہلے ہی سے ایک نمایاں نظام فرض کر لیا گیا ہے۔ مثلاً دنیا اس طرح کی ہے کیونکہ اس سے علاوہ وہ دوسری طرح کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اسے کسی مافوق انسان نے بنایا ہے۔ اس طرح کے تصورات انسان کی ذہنیت کو پست بناتے ہیں اور جدوجہد کی صلاحیتوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ میں انسان مجبور محض بن جاتا ہے اور اپنے مفاد کے لئے بھی جدوجہد نہیں کر سکتا۔

مارکسزم، اخلاقیات کو مخفی اور باطنی مابعد الطبیعات اور اسی قسم کی چیزوں سے علیحدہ رکھتا ہے۔ اس کے مطابق اخلاق کا معیار سوسائٹی کا مفاد ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کا نظام صرف ایک طبقہ کے مفاد کی (جس میں چند افراد شامل ہیں) حفاظت کرتا ہے تو ایسے نظام کے قوانین غیر مفید ہیں۔ جو سوسائٹی کے عام مفاد کے لئے ایسے قوانین کا ختم کرنا ہی ضروری ہے۔ اگرچہ قائم شدہ نظام کے مطابق ایسا کرنا اخلاقیات کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح وہ انسان کو اس لائق بنا دیتا ہے کہ وہ خود بخود بغیر کسی جبر کے اخلاقی قوانین پر جو کہ پوری جماعت کے لئے مفید ہیں عمل کرے اور ان قوانین کی پابندی کرے۔

مارکسی اخلاقیات کا بنیادی اصول اپیقورس کے ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

"میں دیوتاؤں سے اور ظلم سے آزاد ہونا چاہتا ہوں تاکہ میں نیک بن سکوں کیونکہ نیک بننے سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

مرزا محمد اشفاق احمد صاحب بی اے ایل ایل بی

# رسوم ورواج اور ان کی خصوصیات

رسوم ورواج کی ماہیت اور سماجی زندگی میں ان کی اہمیت کے متعلق ولیم گریہم سیمنر(۱۸۴۰-۱۹۱۰)
پروفیسر عمرانیات ییل یونیورسٹی نے نمایاں تحقیق کی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اس کی ایک کتاب "Folk Ways"
کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۶۹۲ صفحات، بیس ابواب اور ایک اشاریہ ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب
میں سیمنر نے عادات واطوار اور رسوم ورواج کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔ عادات واطوار اور رسوم ورواج میں
فرق کیا ہے، رسوم ورواج کی خصوصیات بتلائی ہیں اور معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مزید
براں غلامی، اسقاط حمل، طفل کشی، مردم خوری اور بوڑھوں کو مار دینے کے جو طریقے زمانہ ماسبق میں مروج تھے انکا
دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ عمرانی نقطہ نظر سے اس کتاب کا مطالعہ باعث دلچسپی اور معلومات ہوگا۔

سیمنر نے طور طریق یا عادات واطوار کے لئے "فوک ویز" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور رسوم ورواج کو
"موریس" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "موریس" ایک لاطینی لفظ "موس" کی جمع ہے۔ جس کے معنی رسوم ورواج کے
ہیں۔ طور طریق عادات واطوار کی ابتدا انسانی ضروریات واحتیاجات کی وجہ سے ہوئی۔ بھوک، محبت،
خفت اور ڈر انسانی جدوجہد کی چار اہم تحریکات ہیں۔ اگر اپنی روزمرہ زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری
ہر جدوجہد براہ راست یا بالواسطہ جزاً یا کلاً مذکورہ چار تحریکات میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ وابستہ نظر
آئے گی۔ ان ہی تحریکات کی وجہ سے ہم مختلف نوعیت کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد جس قدر ... وسیع
ہوگی طور طریق اور عادات واطوار بھی اسی قدر وسیع ہوتے جائیں گے کسی مخصوص احتیاج کے رفع کرنے کے لئے جب
ایک ہی نوعیت کی جدوجہد کو بار بار دہرایا جائے گا تو وہ عادت بن جائے گی۔ انسان کی چند احتیاجات فطری اور
جبلی ہیں لیکن اکثر اکتسابی اور عادتی ہوا کرتی ہیں۔ فطری احتیاجات کی بجا آوری کے سلسلے میں اکتسابی اور عادتی
احتیاجات رونما ہوتی ہیں۔ انفرادی عادات جب پسندیدہ اور مقبول عام ہوتے ہیں تو انھیں اجتماعی رتبہ
حاصل ہو جاتا ہے اور بعد ازاں اجتماعی عادات واطوار، رسوم ورواج کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں چنانچہ

تیمز نے طور طریق اور رسوم و رواج پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انفرادی خصائل عادات و اطوار ہیں اور اجتماعی خصائل رسوم و رواج کہلاتے ہیں۔ رسوم و رواج در حقیقت کسی سوسائٹی یعنی سماج یا معاشرہ کے وہ مروجہ طور طریق ہیں جن پر عمل کر کے مختلف احتیاجات، خواہشات، اعتقادات، توہمات اور وجدانیات وغیرہ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں رسوم و رواج کا حصہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ رسوم و رواج کا اثر محض معاشرتی زندگی تک محدود ہے۔ سیاسی اور معاشی زندگی سے بھی رسوم و رواج کا بہت ہی قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سیاست اور معیشت کی تشکیل، ترقی یا تنزل میں رسوم و رواج کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ہم رسوم و رواج کی مختلف خصوصیات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ رسوم و رواج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تشکیل کسی مقررہ کمیٹی کی جانب سے کسی خاص پروگرام یا لائحہ عمل کے تحت نہیں ہوتی بلکہ وہ موسمی حالات جغرافیائی ماحول اور دیگر امور کا لحاظ کرتے ہوئے خود بخود رونما ہوتے ہیں۔

۲۔ جسمانی عضو کی طرح رسوم و رواج بھی ترقی کرتے اور تنزل کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن جسمانی عضو کی رفتار ترقی یا تنزل کے مقابل رسوم و رواج کی ترقی یا تنزل کی رفتار سست ہوتی ہے جسمانی عضو کی عمر مقابلتاً محدود ہوتی ہے اور رسوم و رواج بالعموم طویل عرصہ تک باقی رہتے ہیں

۳۔ رسوم و رواج نسلاً بعد نسلاً چلے آتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی رسم کسی معاشرہ میں شروع ہو جاتی ہے تو اس کا سلسلہ مدتوں جاری رہتا ہے۔ رسوم و رواج کی ابتدا اور وجہ ابتدا کے متعلق مابعد نسلیں بالعموم نابلد رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود نہایت شدت کے ساتھ اس کی پابندی کی جاتی ہے وجہ یہی بتلائی جاتی ہے کہ چونکہ باپ دادا نے ایسا کیا تھا لہٰذا ہم بھی کر رہے ہیں"

۴۔ مختلف قوموں کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے رسوم و رواج اور جاپان و چین کے رسوم و رواج میں اختلافات پایا جائے گا۔ اسی طرح ایشیائی ممالک کے مقابل یورپی ممالک کے رسوم و رواج جداگانہ ہوں گے۔ اگر ہم ہندوستان اور انگلستان کے رسوم و رواج کا مقابلہ کریں تو یہ فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی ملک میں رہنے والی مختلف ذاتوں اور فرقوں کے رسوم و رواج جدا جدا

نظر آئیں گے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ رسوم ورواج کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ وقت، مقام اور جماعت یا گروہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ منجملہ اور امور کے اس اختلاف کی ایک اہم وجہ موسمی حالات اور جغرافی خصوصیات ہیں۔

۵۔ رسوم ورواج میں بہ سرعت تبدیلی کرنا بہت ہی وقت طلب ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اگر رسوم ورواج کی قوت اور استحکام کا لحاظ کئے بغیر ان میں تبدیلی کی کوشش کی جائے تو خطرناک اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہونگے رسوم ورواج میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سماج کی مرضی کو بہت بڑا دخل ہے

۶۔ مختلف قوموں کے ارتباط لین دین اور میل ملاپ کی وجہ سے رسوم ورواج میں بتدریج تبدیلی ہوتی ہے اور مشترک نوعیت کے رسوم ورواج خود بخود رونما ہوتے ہیں۔ رسوم ورواج کی تبدیلی میں سب سے اہم حصہ ربط اور ارتباط کا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تسلط اور استحکام کے بعد یہاں کی سابقہ تہذیب اور رسوم ورواج پر اسلامی تہذیب اور رسوم ورواج کا اثر پڑا اور اکثر رسوم ورواج میں مشترکہ خصوصیات پیدا ہوئیں۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد انگریزی تسلط اور استحکام کی وجہ سے ہمارے طور طریق عادات واطوار اور رسوم ورواج پر انگریزی تہذیب و تمدن کا نمایاں اثر پڑ رہا ہے۔ روزمرہ زندگی میں اس کی بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوستانی باشندوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج انگریزی تہذیب سے بہت کچھ متاثر ہو چکے اور ہو رہے ہیں جس کی بنیادی وجہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کا یہی ربط ہے

۷۔ رسوم ورواج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں افراد کی رہنمائی کرتے ہیں، انفرادی جدوجہد پر ان کا اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور ہماری ہر قسم کی جدوجہد اپنے معاشرہ کے رسوم ورواج کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم وہی غذا استعمال کرتے ہیں جو ہمارا معاشرہ استعمال کرتا ہے ہم وہی لباس پہنتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے دیگر افراد پہنا کرتے ہیں ہم اسی نوعیت کے مکانات میں رہتے ہیں جس نوعیت کے مکانات میں ہمارے معاشرے کے دیگر ارکان رہتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم رسوم ورواج کے پابند نظر آئیں گے۔

۸۔ رسوم ورواج اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی بعض رسوم ورواج اور طریقے کسی زمانہ میں مفید

ہوتے ہیں اور کسی زمانے میں مضر، مفید رسوم و رواج کی ترویج اور مضر رسوم و رواج کا ترک کرنا سماجی خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان میں سماجی خوشحالی کے دیگر امور کی اصلاح کے علاوہ تخریبی رسوم و رواج کی اصلاح کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کسی ملک کی سیاست اور معیشت حقیقی معنی میں اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوسکتی جب تک معاشرتی حالات میں بھی مناسب حال ترمیم نہ کی جائے۔

۹۔ تعلیم یافتہ افراد کے مقابل غیر تعلیم یافتہ افراد پر رسوم و رواج کا اثر اور اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو معاشرہ جس قدر غیر تعلیم یافتہ ہوگا وہ اسی قدر قدامت پرست اور قدیم رسوم و رواج کا پابند نظر آئے گا۔ ہندوستان کی دیہی آبادی اس کی نمایاں مثال ہے۔ قدیم رسوم و رواج کا اثر دیہی معیشت پر بہت نمایاں نظر آئے گا۔

۱۰۔ رسوم و رواج کو گو کہ قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تاہم ان کی پابندی قانونی احکامات کی طرح کی جاتی ہے۔ ان کی قوت اس قدر ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تحفظ ذات کے جذبات کو بھی اس کی پابجائی کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے۔ ستی کی رسم کے تحت بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ نذر آتش ہو جانا پڑتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ تکلیف سے بچنے کی خواہش انسانی جبلت میں داخل ہے کون عورت جیتی جاگتی آگ میں جل جانے کے لئے بخوشی رضامند ہوگی مگر معاشرہ کے رسوم و رواج اسے بے زبان بنا دیتے تھے اور وہ بغیر کسی دفاعی کوشش کے ستی ہو جاتی تھی۔ اولاد کے ساتھ ماں باپ کی محبت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن ستی ہونے والی عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی کو جیتے جی جلتا ہوا دیکھ سکتے تھے لیکن رسم ستی کی مخالفت کی سکت ان میں نہ تھی۔ نومولود لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کا جو طریقہ عرب میں مروج تھا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسوم و رواج کے آگے ماں کی ممتا بھی بے سود ثابت ہوتی ہے۔ کون عورت بخوشی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی بچی کو زندہ درگور کر دیا جائے محض یہ رسوم و رواج کی قوت ہے کہ ناقابل برداشت امور بھی قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ رسوم و رواج کو درحقیقت نفس اجتماعی (سوشیل مائنڈ) کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور بہت کم افراد میں نفس اجتماعی (جس کا مظاہرہ طور طریق اور رسوم و رواج کے ذریعہ ہوتا ہے) کا مقابلہ کرنے کی استطاعت ہوتی ہے۔ جو افراد تعمیری نقطہ نظر سے نفس اجتماعی کا مقابلہ کرتے ہیں وہ مصلح معاشرت ہوتے ہیں۔ ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہوسکتی۔ نفس اجتماعی کے آگے نفس انفرادی کو بالعموم سر جھکانا پڑتا ہے۔ بعض ہندو فرقوں میں اب بھی بیوہ عورتوں کا سر مونڈ دیا جاتا ہے

کوئی عورت اس سلوک کو بخوشی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی لیکن نفس اجتماعی اور سماجی رسوم و رواج کی قوت کے آگے وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر نوجوان بیوہ عورتیں اس وجہ سے اپنی ساری عمر بیوگی میں گذارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں کہ عقد ثانی کے طریق کو سماج کی نگاہ میں عیب تصور کیا جاتا ہے۔ بالغ بیواؤں سے کہیں زیادہ افسوسناک حالت نابالغ بیواؤں کی ہوتی ہے جنھیں معاشرہ کے رسوم کے مطابق ساری عمر سوگ میں گذارنا پڑتا ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کا قوی ترین اور منظم ترین ادارہ حکومت ہے لیکن ہر قسم کی فوجی اور حربی طاقت کے باوجود حکومت کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ تخریبی رسوم و رواج کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ کیونکہ کسی قسم کا عملی اقدام کرنے سے قبل ملکی روایات اور رسوم و رواج کا پورا پورا لحاظ ضروری ہوتا ہے ورنہ بحالت دیگر خطرناک نتائج رونما ہوتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کی اصلاحی کوشش واقعی تعمیری حیثیت رکھتی تھی لیکن سماجی روایات اور رسوم و رواج کو نظر انداز کرنے سے جو نتائج برآمد ہوئے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ رسوم و رواج کی اسی اہمیت اور قوت کے پیش نظر قدیم مفکرین نے انھیں "معاشرہ کا بادشاہ" کہا ہے۔ شیکسپیر نے "ظالم" کا لقب دیا ہے اور بیکن نے "انسانی زندگی کا سب سے بڑا مجسٹریٹ" قرار دیا ہے۔ ٹارڈ کہتا ہے کہ "انسان کو رسوم و رواج کے پنجہ سے چھٹکارہ نہیں۔ اگر ایک نوعیت کی رسم سے رہائی پاتا ہے تو پھر دوسری کا شکار ہو جاتا ہے" بہر صورت انسان کے لئے رسوم و رواج کی پابندی لازمی اور ضروری ہوتی ہے۔ حکومتی قوانین کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے لیکن رسوم و رواج کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔ ہر شخص کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سماج کے طور طریق اور اپنے عادات واطوار میں مطابقت پیدا کرے ورنہ وہ رکن معاشرہ کی حیثیت سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔

محمد ناصر علی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبہ معاشیات

(ترجمہ "کینڈڈا" مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(برکیس کا لہجہ اور زبان خاص لندن کے جاہل لوگوں کی بولی میں ہے۔ اس کے الفاظ ادھ کچرے ہوتے ہیں۔ جو h حرف ہیں۔ جو منہ سے نہیں نکالتا اور جہاں h لگانا ہوتا ہے وہاں اڑا جاتا ہے اور جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہاں لگاتا ہے جس طرح ہمارے ہندوستان کی بولیوں میں جہلا خ اور ق کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ یا یہاں کو ہیاں، افسوس کو ہفسوس، جارہے کو جارییے یا کہہ دیا کو کہیدیا کہتے ہیں۔ ترجمہ میں ملیس زبان ہی رکھی گئی ہے)
(مترجم)

برکیس۔ (چوکھٹ پر رکتے ہوئے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر مارل یہاں موجود ہیں۔

پ۔ (اٹھتے ہوئے) میں جا کر بلائے لاتی ہوں۔

ب۔ (اس کی طرف ناامیدی سے گھورتے ہوئے) آپ وہ نوجوان لیڈی نہیں جو یہاں پہلے ٹائپ کیا کرتی تھیں؟

پ۔ جی نہیں۔

ب۔ (آتشدان کی طرف بڑھتے ہوئے اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے) ہاں! وہ آپ سے کم عمر تھیں کیوں نا؟ (اس گارنٹ اس کی طرف تکنے لگتی ہے، پھر دروازے کو زور سے بند کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے) کیا اپنے گشت پر جا رہے ہو مسٹر مل؟

ل۔ (اپنی یادداشت کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) جی ہاں مجھے جلدی جانا ہے۔

ب۔ (فوراً) مسٹر مل میں آپ کو روکنا نہیں چاہتا۔ مجھے مسٹر مارل سے ایک نجی کام ہے اور اسی لئے میں آیا ہوں

ل۔ (جھنجلا کر) میرا ہرگز ارادہ مداخلت کا نہیں ہے سٹر برگیس، گڈمارننگ

ب۔ (نہایت شفقت سے) ٭

(جیسے ہی لیکسی جاتا ہوتا ہے ماریل واپس آتا ہے)

م۔ (لیکسی سے) کیا چلدیئے؟

ل۔ جی ہاں۔

م۔ میرا ریشمی رومال لے لو اور گلے میں لپیٹ لو، باہر ہوا بہت سرد ہے۔ جاؤ۔

(لیکسی اس عنایت سے برگیس کی ناملائمت بھول جاتا ہے خوش ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے)

ب۔ جیمس بس تم اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ خراب ہی کیا کرتے ہو، گڈمارننگ، میں جب کسی اپنے ملازم کو کچھ دیتا ہوں اور جس کی کمائی کا انحصار مجھ ہی پر ہوتا ہے تو میں اس کو بس اسی کی اوقات ہی پر رکھتا ہوں۔

م۔ (ذرا تیزی سے) میں ہمیشہ اپنے نائبوں کو اپنا ساتھی اور مددگار سمجھتا ہوں، اور اس لئے جتنا وہ میرا خیال کرتے ہیں اگر اتنا ہی کام آپ کو اپنے کلرکوں اور آدمیوں سے حاصل ہو جائے تو آپ بہت جلد امیر ہو جائیں لیجئے اپنی پرانی کرسی (وہ ذرا ترشروئی سے اس آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آتشدان کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک خالی کرسی میز سے اٹھالتا ہے اور اپنے مہمان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھتا ہے)

ب۔ (بغیر حرکت کئے) تم بس ویسے ہی رہے جیمس!

م۔ آپ جب پچھلی دفعہ آئے تھے یعنی کوئی تین برس کا عرصہ گذرا جہاں تک میرا خیال ہے تو آپ نے یہی بات ذرا اور صفائی سے کہی تھی۔ آپ کے صحیح الفاظ اس وقت یہ تھے "جیمس! ہاں تم وہی ہمیشہ کے ایسے بڑے بیوقوف ہی رہے!

ب۔ (لطف و اطمینان دلاتے ہوئے) غالباً۔ ہاں میں نے ایسا کہا تھا لیکن (مصالحت کے لہجہ میں خوش کرتے ہوئے) میرا مطلب اس سے کوئی تکلیف پہونچانا نہیں تھا۔ ایک پادری کو اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ ذرا بیوقوف بھی ہو یہ تو تم جانتے ہی ہو بلکہ اس کے پیشے کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ بہرحال میں پرانی بدمزگیوں کو یاد کرنے نہیں آیا ہوں اس لئے گذشتہ پر صلوٰۃ بھیجو (یکایک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اور ماریل کے قریب

آتے ہوئے) جیمس تین سال کا عرصہ گذرا تم نے میرے ساتھ بڑا گھاٹا کیا تھا تم نے میرا ایک ٹھیکہ تڑوا دیا تھا اور جب میں نے غم و افسوس کے باعث تم پر غصہ کا اظہار کیا تھا تو تم نے میری لڑکی کو میرے خلاف کر دیا تھا لیکن بہر حال اب میں ایک سچے عیسائی کا فرض ادا کرنے آیا ہوں (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) یعنی جیمس میں تم کو معاف کرتا ہوں۔

م۔ (چونک کر اُٹھ بیٹھا) خدا غارت کرے تمہاری اس دیدہ دلیری کو۔

ب۔ (پیچھے ہٹتے ہوئے اور اس قسم کے برتاؤ پر آنکھیں نمناک کرتے ہوئے) جیمس کیا ایک پادری کے لئے اس قسم کی بات زبان پر لانا مناسب ہے اور خاصکر تمہاری زبان پر!

م۔ (غصہ سے) نہیں جناب، ایک پادری کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ میں نے غلط الفاظ استعمال کئے بلکہ مجھ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جہنم میں جائے تیری بے غیرتی بلکہ یہی الفاظ سینٹ پال یا ہر ایماندار آدمی تم سے کہتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارا وہ ٹھیکہ بھول گیا جب تم نے محتاج خانے کو کپڑے مہیا کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا؟

ب۔ (پبلک مفاد کے جوش میں آکر) جیمس میں نے محصول ادا کرنے والوں کے حق میں بڑا مفید کام کیا۔ میرا ٹھیکہ سب سے کم ٹھیکہ تھا تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

م۔ ہاں سب سے کم خرچ کا! اس لئے کہ تم نے مزدوروں کو نہایت ہی کم تنخواہیں دیں جتنی کہ کوئی دوسرا مالک کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی کم کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آجائے، بلکہ اس سے بھی کم خصوصاً ان بیچاری عورتوں کو جو تمہارے یہاں کپڑے سیتی تھیں۔ تمہاری تنخواہیں اس قدر کم تھیں کہ ان بیچاریوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتیں (غصہ اور بھی تیز ہوتا جاتا ہے) وہ عورتیں میرے گرجے میں آتی تھیں اس لئے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اس ٹھیکہ کو منسوخ کرانے کے لئے میں خیرات خانے کی مجلس انتظامی کے رکنوں کو غیرت دلائی۔ میں نے خیرات خانہ کا محصول چندہ ادا کرنے والوں کو غیرت دلائی، ہر شخص کو غیرت دلائی لیکن تمہیں نہ دلا سکا۔ (بے حد گرم ہو کر) اب یہاں تم کس منہ سے آئے ہو اور پھر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم مجھے معاف کرتے ہو اور اپنی لڑکی کو بیچ میں لاتے ہو اور ——

ب۔ غصہ نہ ہوا غصہ نہ ہو! جیمس ایک ذرا سی بات پر اتنے خفا نہ ہو۔ میں نے مان تو لیا کہ میں نے غلطی کی۔

م۔ کب تم نے مانا، میں نے نہیں سنا۔

ب۔ نہیں۔ واقعی میں نے اعتراف کر لیا اور اب پھر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں اس خط کے متعلق جو میں نے تمہیں لکھا تھا۔ بس اب کافی ہے؟

م۔ (انگلیاں چٹخاتے ہوئے) نہیں! ابھی نہیں۔ پہلے یہ بتلایئے کہ آپ نے تنخواہیں بڑھا دیں کہ نہیں؟

ب۔ (فاتحانہ انداز میں) ہاں

م۔ کیا!

ب۔ (چاپلوسی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، مصنوعی جوش اور رقت کے لہجہ میں) اب میں ایک مثالی مالک ہو گیا ہوں اب میں عورتوں کو نوکر نہیں رکھتا۔ وہ اب سب کی سب ہٹا دی گئی ہیں۔ اب سب کام مشینری سے کیا جاتا ہے اور کسی شخص کو چھ پنس فی گھنٹے سے کم نہیں ملتا، اور جو کاریگر ہیں ان کو ٹریڈ یونین کے نرخ سے مزدوری دیتا ہوں (فخریہ) کہئے اب آپ کیا کہتے ہیں!

م۔ (نہایت مسرور ہو کر) کیا واقعی! کیا واقعی! اس گنہگار کے لئے جو توبہ کر لے آسمان کے خزانے بے حد بے انتہا خوشیاں نچھاور کرتے ہیں (بریس کے پاس صدق دل سے نہایت عفو طلب لہجہ میں جاتے ہوئے) میرے بزرگ! کس قدر ارفع و اعلیٰ کام آپ نے کیا ہے! میں آپ سے تہ دل سے اپنے خراب خیالات کی معافی چاہتا ہوں (اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے) اب آپ کو کس قدر مسرت حاصل ہوئی ہو گی!۔ کیوں نا! کہئے کہئے کہ اب آپ کا دل بیحد پرجوش، بیحد مسرور ہے بلکہ آپ روحانی طور پر خوش تو اب نظر آتے ہیں۔

ب۔ (نہایت پژمردگی سے) ہاں خوشی تو ہے، بلکہ خوش تو ہونا ہی چاہئے، اور خصوصاً جبکہ تم اس بات کو دیکھ ہی رہے ہو لیکن خیر اب ضلع کی کونسل سے میرا معاہدہ تو طے ہی ہو گیا ہے (نہایت وحشیانہ پن سے) وہ ہرگز تیار نہیں تھے جبتک کہ میں اچھی تنخواہیں دینے کا وعدہ نہ کروں۔ برا ہو ان گدھوں کا کہ میرے معاملات میں دخل دیا ہے۔

م۔ (اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے نہایت مایوسی سے) تو یہ کہئے اس ڈر کے سبب آپ نے تنخواہیں بڑھا دیں۔ لاداسی سے

بیٹھ جاتا ہے)

ب۔ (سنجیدگی سے خوب اینڈ کر انگڑائی لیتے ہوئے، اور آخر میں کس لئے کرتا؟ لیکن جانتے ہو آخر اس سے ہوتا ہی کیا ہے؟ سوائے اس کے کہ مزدور شرابیں پی کر مست اور گستاخ ہو جاتے ہیں۔ (نہایت آن بان سے آرام کرسی میں سما کر بیٹھ جاتا ہے) لیکن جیمس تمہارا کام بہت اچھا ہے، تمہارا نام اخبارات میں آجاتا ہے اور تم بڑے آدمی ہو جاتے ہو لیکن جیمس دیکھو۔ تم کتنی بے انصافی کرتے ہو کہ ان مزدوروں کو اس قدر روپیہ دیدیتے ہو جو جانتے بھی نہیں کہ خرچ کس طرح کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے لے لیتے ہو جو اس کا بہت بہتر مصرف کر سکتے تھے۔

م۔ (نہایت گہری آہ بھر کر اور سرد مہری سے کہتے ہوئے) آج آپ میرے پاس آخر کس کام سے آئے ہیں؟ یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ محض عزیز دارانہ محبت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔

ب۔ (زور دے کر) ہاں، میں یوں ہی عزیز دارانہ طور پر آیا ہوں۔ کسی کام سے نہیں۔

م۔ (اطمینان اور خاموشی سے) مجھے آپ کی بات کا قطعی اعتبار نہیں ہے۔

ب۔ (نہایت غصہ سے اٹھتے ہوئے) جیمس میورہاریل! اب یہ پھر میری نسبت نہ کہنا۔

م۔ (بغیر کچھ اثر لئے) جتنی بار اس کی ضرورت ہوگی تمہیں معقول کرنے کے اتنی بار کہوں گا قطعی! کہ میں تمہاری بات کا بالکل اعتبار نہیں کرتا۔

ب۔ (نہایت مجروح ہو کر) خیر! اگر تم نے یہ طے ہی کر لیا ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں تو خیر۔ بہتر ہے کہ اب میں جاؤں (نہایت بیدلی سے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ ماریل کوئی اثر نہیں لیتا۔ وہ ذرا رکتا ہے) جیمس! مجھے امید نہیں تھی کہ تمہاری ایسی نہ معاف کرنے والی طبیعت ہوگی (ماریل پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ چند اور قدم بیدلی سے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ایک دم منھ پھلائے واپس آتا ہے۔ رونے لہجہ میں کہتے ہوئے) ہم ضرور با ہم دوست رہیں گے خواہ ہماری رائیں کتنی ہی خلاف کیوں نہ ہوں۔ یہ آخر آج تم اس قدر بدل کیوں گئے ہو؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں آج محض دوستانہ طور پر آیا تھا۔ تم سے لڑنے کیلئے نہیں میں! اور پھر میں تم سے لڑوں! میری بھتیجی بیٹی کے تم شوہر ہو! آؤ آؤ جیمس آدمی بنو اور ہاتھ ملاؤ (ماریل کے کاندھے پر محبت کے جذبہ سے ہاتھ رکھدیتا ہے)

م۔ (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) دکھو برگیس! کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ ہم تم ویسے ہی دوست ہو جائیں جیسے کہ پیشتر تھے یعنی اُس ٹھیکہ والے معاملہ سے پہلے؟

ب۔ ہاں جیمس! ہاں ویسے ہی بالکل ویسے ہی۔

م۔ تو اچھا پھر تم اپنا برتاؤ ویسا ہی کیوں نہیں رکھتے جیسا کہ پہلے تھا۔

ب۔ (نہایت احتیاط سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے) کیا مطلب تمہارا جیمس؟

م۔ مطلب یہ کہ پہلے تم مجھے نوجوان بیوقوف سمجھا کرتے تھے۔

ب۔ (مناتے ہوئے) میں تمہیں بیوقوف سمجھتا تو نہیں تھا، میں......

م۔ (بات کاٹتے ہوئے) تم واقعی سمجھتے تھے، اور میں تم کو کھوسٹ پاجی سمجھا کرتا تھا۔

ب۔ (مارتیل کی خود الزامی کو جوش سے رد کرتے ہوئے) نہیں تم ہرگز نہیں سمجھتے تھے جیمس، اب تم صاف صاف اپنے متعلق ناانصافی سے کام لے رہے ہو۔

م۔ نہیں میں واقعی سمجھتا تھا لیکن اس سے کوئی ہم لوگوں کی دوستی میں فرق نہیں آسکتا۔ تم کو ایسا ہی شخص بنایا جس کو میں نہایت پاجی کہتا ہوں۔ اسی نے مجھ کو ایسا شخص بنایا جس کو تم بیوقوف کہتے ہو۔ ہمیں اس کی مصلحت میں کیا چارہ! (اس بات کا یہ اثر ہوتا ہے کہ برگیس کے چہرہ پر وہ اخلاقی نقاب جسے وہ قائم کئے ہوئے تھا معدوم ہو گئی جسم زرد پڑ گیا اور مارتیل کی طرف نظر گڑ کے رہ گئی۔ خود کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے۔ مارتیل اپنے اسی اطمینان کے لہجہ میں کہتا چلا جاتا ہے) میری بھلا کیا مجال تھی اس کے معاملات میں دخل دیتا، نہ اپنے بارے میں کچھ کہہ سکتا تھا نہ تمہارے لئے بس اس وقت تک جب تک کہ تم یہاں نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ یقین کرتے ہوئے آؤ کہ تم نہایت پاجی اور کمینے آدمی ہو اور اپنے اس پاجی پن پر نازبھی کرتے ہو تو اس وقت تک میرے تمہارے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار تعلقات رہیں گے اور تم کو میں ہمیشہ خوش آمدید کہوں گا لیکن (اب مارتیل کا لہجہ تیز اور درشت ہو جاتا ہے۔ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کرسی پر نہایت زور سے ہاتھ مارتے ہوئے) میں اس کی قطعی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم چھچھورکرتے ڈینگیں مارتے یہاں آؤ کہ تم ایک مثالی مالک ہو گئے

ہو اور ظلم و ستم سے تائب ہو گئے ہو حالانکہ یہ ظاہری تبدیلی صرف ضلع کی یونین کے خوف سے واقع ہوئی ہے (وہ یہ بات اس کی طرف اہمیت دینے کے لئے سر جھکا کر کہتا ہے، پھر آتشدان کے قریب چلا جاتا ہے جہاں وہ نہایت اطمینان و شان سے جا کر بیٹھ جاتا ہے بیٹھ آتشدان کی طرف ہے اور سلسلۂ سخن جاری ہے) میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنے متعلق صداقت سے کام لے خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا خیر، تو مطلب یہ کہ یا تو آپ اپنا ہیٹ سنبھالئے اور چلد یجئے یا بیٹھئے یہ مان کر سچے دل سے کہ آپ نہایت پاجی آدمی ہیں اور پھر اپنی پاجیانہ جھمیں بتایئے کہ سچ مچ آخر آپ اب مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں (برگیس جس کے جذبات اب بہت کافی تھم چکے ہیں۔ اتنے کہ وہ ایک کھسیانی ہنسی اپنے ہونٹوں پر پیدا کر سکا ہے اس عملی تجویز سے نرم ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور آخر کار آہستہ آہستہ نہایت تمیز سے اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جو مارل نے اس کے واسطے خالی کی تھی) ہاں بس اب یہ ٹھیک ہے۔ اچھا اب بتاؤ۔

ب۔ (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) جیمس! تم بھی عجیب قسم کے جانور ہو۔ اس میں کوئی بھی شک نہیں لیکن ذرا جوش کے ساتھ، پھر بھی تمہاری باتوں پر پیار آ ہی جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ کسی کو بھی پادری کی باتوں کا زیادہ اثر نہ لینا چاہیئے ورنہ دنیا کا کوئی کام ہی نہیں چل سکتا (اپنے کو سنجیدہ گفتگو کے لئے خاموش کرتا ہے اور مارل کی طرف دیکھتے ہوئے خشک سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کرتا ہے) لیکن خیر میں تمہاری باتوں کو برا نہیں مانتا اور جبکہ تم چاہتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے آزادانہ ملیں تو میں اس بات کو چھپانا نہیں چاہتا کہ میں واقعی تم کو ایک زمانہ میں کچھ بیوقوف سمجھتا تھا لیکن اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ شاید میں اس بات کو قبل از وقت کہتا تھا۔

م۔ (ایکدم بشاش ہو کر) اہا ہا! آخر تم کو پتہ لگ گیا نا؟

ب۔ (فخر سے) ہاں! زمانہ بہت کافی گذر گیا۔ پانچ سال گذرے کہ تمہارے خیالات پر غور کرنے کا کوئی خیال تک نہ کرتا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ آخر تمہیں وعظ دینے ہی کیوں دیا جاتا ہے۔ مجھے ایک پادری کا حال معلوم ہے کہ اسے لندن کے اعلیٰ پادری نے عرصہ سے معتوب کر رکھا ہے حالانکہ وہ بیچارہ اسی قدر لامذہب ہے جتنے کہ تم ہو۔ لیکن آج اگر کوئی مجھ سے شرط کرے تمہارے متعلق کہ تم خود آخر عمر تک لندن کے

پادری اعلیٰ ہو جاؤ گے تو میں قطعی شرط کروں گا (نہایت جوش سے) میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اور تمہارے ساتھی نہایت مستعد اور با اثر ہو رہے ہیں اور کوئی نہ کوئی عہدہ تمہیں مل ہی کر رہے گا خواہ تمہاری زبان بندی ہی کیلئے کیوں نہ ہو۔ تم کو سوجھی اچھی! جو راہ تم نے اختیار کی ہے وہ آخر میں تم کو ضرور کچھ نہ کچھ دے کر رہے گی۔

م۔ (اپنا ہاتھ نہایت بجنگی سے بڑھاتے ہوئے) ہاتھ ملاؤ بوگس! اب تم سچی سچی اور رایا ندارانہ باتیں کر رہے ہو۔ خیر لندن کا پادری اعلیٰ تو میں نہیں بنایا جاؤں گا۔ اگر بنا دیا گیا تو میں تم کو تمام بڑے بڑے پاجی اور ظالم نیجروں سے ملا دوں گا جو میرے یہاں شب و روز دعوتوں پر آتے رہیں گے۔

ب۔ (نہایت بیگی ملی بنا ہوا اشتا ہے اور اٹھ کر ہاتھ ملاتا ہے) جیمس تمہارے مذاق نہ جائیں گے، خیر تو گویا اب ہم میں مصالحت قطعی ہو گئی ہے اور سب غلط فہمیاں رفع ہو گئیں۔ کیوں نا جیمس؟

ایک زنانی آواز: جیمس بلکہ کیوں نہیں دیتے کہ ہاں! ہاں!

(دونوں ایکدم چونک پڑتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کینڈڈا آ گئی ہے اور ان دونوں کی طرف گویا مادرانہ شفقت سے دیکھ رہی ہے جو اس کا خاص انداز ہے۔ تینتیس برس کی عورت، خوب مضبوط جسم، تندرست اور امید ہے کہ آگے چل کر گول مول ہو جائے لیکن خیر ابھی تو اپنے شباب پر ہے یعنی یہ کہ جوانی بھی ہے اور ماں ہونے کا فخر بھی۔ اس کے طریقے بالکل ایسی عورت جیسے ہیں جس نے بخوبی یقین کر لیا ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف بڑی آسانی، بڑی صفائی اور بلا کسی تکلف کے مرکوز کر سکتی ہے۔ خیر یہاں تک تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اُن خوبصورت عورتوں کی طرح ہے جو مردوں سے اپنی جنسی خوبی کی بدولت جو چاہیں کروا لیں، لیکن کینڈڈا کی متین پیشانی، باہمت نظریں، مستحکم ٹھوڑی اور منھ کی ساخت ظاہر کرتی ہیں کہ وسیع النظر، اعلیٰ کردار اور طبیعت کی ہمدرد ہے۔ ایک دور بین شخص ضرور سمجھ لے گا کہ جس کسی نے وہ مریم والی تصویر اس کے آتشدان کے اوپر لگائی ہو گی اس نے اس تصویر اور اس عورت میں ضرور کوئی روحانی شباہت دیکھی ہو گی۔ حالانکہ کینڈڈا یا اس کے شوہر کو اس کا تا ن گمان بھی نہیں ہے نہ اس کا کہ قدرت کا یہ شاہکار طیطیان کے اس شاہکار سے کچھ تعلق بھی رکھتا ہے۔ اس وقت وہ سر پر چھوٹی ہیٹ لگائے اور لبادہ اوڑھے ہوئے ہے ہاتھ میں ایک کمبل کا بنڈل ہے جس میں اس کی چھتری کھسی ہوئی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں ایک ہینڈ بیگ

ہے اور کچھ تصویر دار رسالے)

م۔ (اپنی کار پر یکایک چونک کر، کینڈڈا کیوں ۔ اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اس قدر دیر ہو گئی ہے۔ نہایت مضطرب ہو جاتا ہے) میری پیاری (تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہے اور کمبل کے بنڈل کو الگ رکھ دیتا ہے۔ ساتھ ہی افسوس ظاہر کرتا جاتا ہے کہ وہ اسٹیشن جانا کس قدر بھول گیا) میں نے سوچا تھا کہ تم کو اسٹیشن سے لے آؤں گا لیکن میں نے وقت کا کچھ خیال ہی نہیں کیا (کمبل کو صوفے پر پٹختے ہوئے) مجھ کو اس قدر باتوں میں لگا لیا۔ اس (اس کی طرف پھر آتے ہوئے) میں بالکل بھول گیا کینڈڈا پیاری! (دلگیر ہوتا ہے ایسے جذبات کے ساتھ تاکہ وہ اس کی فراموشی کو معاف کر دے اور بھول جائے)

ب۔ (کچھ شرمندہ ہو کر اور اپنی قدر و منزلت کو معرض خطر میں سمجھ کر) کہو اچھی تو ہو کینڈڈا! (وہ ابھی مارل کی آغوش میں ہے۔ لیکن اپنا رخسار رباب کی طرف بڑھا دیتی ہے اور وہ چوم لیتا ہے) میرے اور جیمس کے درمیان اب مصالحت ہو گئی ہے نہایت باعزت سمجھوتہ! کیوں نا جیمس؟

م۔ (جز بز ہو کر) اوہ ابا! ڈ اپنی مصالحت۔ مجھے تمہاری وجہ سے دیر ہو گئی کہ کینڈڈا کو نہ لا سکا (نہایت محبت سے) میری پیاری کینڈڈا تمہارا سب سامان کہاں ہے۔ تم کیسے یہاں تک ........

ک۔ (قطع کلام کرتے ہوئے اور خود کو چھڑاتے ہوئے) وہاں! وہاں میں اکیلی نہیں تھی یوجین اسٹیشن پر تھا اور وہاں سے میرے ساتھ آیا ہے۔

م۔ (خوش ہو کر) یوجین!

ک۔ ہاں؛ وہ باہر میرے اسباب کی دیکھ بھال میں الجھ رہا ہوگا۔ پیارے جلدی باہر جاؤ ورنہ وہ دام اپنے پاس سے گاڑی والے کو دیدے گا اور یہ میں چاہتی نہیں (مارل جلدی سے باہر جاتا ہے کینڈڈا اپنا ہینڈ بیگ فرش پر رکھ دیتی ہے اس کے بعد لبادہ اور ٹوپی اتارتی ہے اور صوفے پر رکھ دیتی ہے اور کمبل کا پارسل بھی۔ لیکن اس سلسلہ میں بات چیت جاری ہے) تو بابا گھر کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟

ب۔ کینڈی جب سے تم وہاں سے آئیں وہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایک دفعہ ادھر آؤ اور اپنی بہن سے مل جاؤ۔ یہ یوجین کون ہے جو تمہارے ساتھ آیا ہے؟

ک۔ یوجین ماریل کی ایک دریافت ہے۔ جوُن میں یہ ماریل کو ٹیمز کے پشتے پر سوتا ہوا مل گیا۔ کیا آپ نے ہم لوگوں کی نئی تصویر نہیں دیکھی؟ (تصویر مریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ اسی کی وہی ہوئی ہے۔

ب۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) ارے بس رہنے دو، بھی گویا تم مجھے۔ اپنے باپ کو یہ بتلا رہی ہو! ایک معمولی گاڑیبانوں کا دلال جو پشتے پر سوتا ہو۔ اور پھر وہ ایسی تصویر خریدے (سختی سے) مجھے دھوکہ نہ دو۔ یہ ایک بہت اعلیٰ مذہبی تصویر ہے اور جیمس کا اپنا انتخاب۔

ک۔ نہیں بابا، یوجین گاڑیوں کا دلال نہیں ہے۔

ب۔ پھر آخر وہ کیا ہے (طنزیہ) شاید کوئی امیر کبیر! کیوں نا؟

ک۔ (مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے) ہاں، اس کا چچا ایک لارڈ ہے۔ زندہ سچ مچ کا لارڈ۔

ب۔ (ایسی عمدہ خبر پر یقین نہ کرتے ہوئے) ارے نہیں!

ک۔ ہاں جب جیمس نے اسے بندر پایا۔ اس کی جیب میں ایک ہفتہ کا پچپن پونڈ کا بل پڑا ہوا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ اسے ایک ہفتہ سے پہلے کہیں روپیہ نہیں مل سکتا، کسی سے قرض لینے میں اسے شرم آتی تھی۔ وہ بڑا پیارا لڑکا ہے ہم لوگ اسے بہت چاہتے ہیں۔

ب۔ (اشرافیت کو حقیر دکھلاتے ہوئے لیکن پھر بھی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ) ہوُں! میرا تو خیال نہیں کہ کسی لارڈ کا بھتیجا اس طرف وکٹوریہ پارک میں آئے گا۔ ہاں جب تک کچھ بیوقوف نہ ہو (تصویر کی طرف پھر دیکھتے ہوئے) حالانکہ کینڈی مجھے یہ تصویر زیادہ پسند نہیں پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آرٹ نہایت اعلیٰ قسم کا ہے دیکھو تم اس سے میرا تعارف ضرور کرا دینا۔ بھول نہ جانا کینڈی (اپنی گھڑی کی طرف گھبرا کر دیکھتا ہے) میں اب صرف دو منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں۔

ماریل یوجین کو ساتھ لئے واپس آتا ہے، برگیس یوجین کو نہایت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے یوجین ایک نہایت عجیب قسم کا شرمیلا لڑکا ہے کوئی اٹھارہ برس کی عمر ہوگی، دبلا پتلا، نسوانیت لئے ہوئے بہت باریک بچوں کی سی آواز اور نہایت گھبرایا ہوا سا چہرہ، ڈری سہمی ہوئی سی باتیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز شباب کی آمد آمد سے گھبرا رہا ہے۔ نہایت نامستقل۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں کھڑا ہو یا کیا کرے

وہ برگیس یعنی ایک نئی صورت کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر موقعہ ملے تو فوراً کسی گوشہ میں بھاگ جائے۔ کسی غیر معمولی عام صحبت کا احساس بھی اس کے اعصاب پر بہت شدید ہوتا ہے۔ لیکن اس کے نتھنے، منہ اور آنکھیں سب کی بناوٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضدی بہت کافی ہے۔ اس کی کشادہ بھوؤں سے یہ بھی ہویدا ہے کہ طبیعت میں رحم بھی ہے۔ حلیہ اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس دنیا کا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ خشک اور سنجیدہ آدمیوں کو تو اس کی صورت تکلیف دہ معلوم ہوگی لیکن شاعرانہ دماغ والے اسے فرشتہ ہی سمجھیں گے۔ اس کا لباس بے تکا سا ہے۔ ایک پرانی نیلی سرج کی جیکٹ ہے جس کے بٹن کھلے ہوئے ہیں اس کے نیچے ادنیٰ ٹینس کی قمیص ہے ٹائی کا کام دینے کے لئے ایک ریشمی رومال بندھا ہوا ہے۔ پتلون جیکٹ ہی کے رنگ کا ہے۔ پیر میں بھورے کینویس کے جوتے ہیں۔ اس کی ہیئت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ غالباً پارکوں کی گھاس میں پڑے رہے ہیں۔ اور کہیں پانی مل گیا تو وہ بھی منجھایا ہے اور برش۔ خیر سے معلوم ہوتا ہے کبھی کرتے ہی نہیں۔

جیسے ہی یوجین ایک اجنبی کی شکل دیکھتا ہے رک جاتا ہے اور دیوار سے لگے لگے کمرے کی دوسری طرف جانے لگتا ہے)

م۔ (داخل ہونے پر) ادھر آؤ، اُدھر کہاں جاتے ہو، ابھی کچھ دیر ٹھہرو تو۔ آپ میرے خسر ہیں مسٹر برگیس اور آپ مسٹر مارچ بینکس۔

**یوجین مارچ بینکس** سٹپٹاتے ہوئے اور کتابدان کا سہارا لیتے ہوئے، جناب نہایت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔

**ب۔** (اس کے پاس جاتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے۔ ماریل اس عرصہ میں کینڈڈا کے پاس جو آتشدان کے پاس بیٹھی ہے چلا جاتا ہے) یقین جانیئے آپ سے مل کر بے انتہا مسرت ہوئی (اپنا ہاتھ بڑھاکر اسے گویا ہاتھ ملانے پر مجبور کرتے ہوئے) مسٹر مارچ بینکس کہئے آج کا موسم کیسا ہے؟ مجھے امید ہے کہ آپ جیمس کے احمقانہ خیالات سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔

**ی م۔** احمقانہ خیالات! اچھا آپ کا مطلب ان کے سوشلزم سے ہے؟ بالکل نہیں۔

**ب۔** ہاں یہ ٹھیک ہے (پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا میں اب جاؤں گا۔ مجبوری! سخت کام ہے۔ آپ کیا

میری طرف تو نہیں آ رہے ہیں مسٹر مارج بنیکس؟

ی م۔ کس طرف؟

ب۔ وکٹوریہ پارک اسٹیشن۔ وہاں سے ایک گاڑی شہر جانے کو بارہ بجکے پچیس پر ملتی ہے۔

م۔ جی نہیں میرا خیال ہے یوجین ہم لوگوں کے ساتھ اب کھانا کھا کر جائے گا۔

ی م۔ (گھبرا کر معافی چاہتے ہوئے) نہیں۔ میں۔ میں ــــ

ب۔ اچھا خیر میں آپ کو مجبور نہ کروں گا۔ میری بھی رائے یہی ہے کہ بہتر ہے آپ یہاں کینڈی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد تشریف لے جائیں لیکن کسی دن غریب خانہ پر بھی ماحضر تناول فرمائیں مجھے امید ہے آپ میرے کلب پر تشریف لائیں گے۔ فریین فاؤنڈرس۔ نارٹن فالگیٹ۔ دیکھئے آئیے گا ضرور کہئے آپ آئیں گے؟

ی م۔ شکریہ مسٹر برگیس لیکن یہ نارٹن فالگیٹ ہے کہاں؟ سرے میں نا!؟

(برگیس آنا سن کر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے)

ک۔ (یوجین کو اپنے پاپا سے نجات دلانے کے لئے آتے ہوئے) پاپا دیکھئے آپ کی گاڑی چھوٹ جائے گی اگر آپ فوراً وہاں نہ پہونچ جائیں گے۔ شام کو پھر آ کر مسٹر مارج بنیکس کو بتا دیجئے گا کہ آپ کا کلب کہاں ہے۔ اس وقت تاخیر مناسب نہیں ہے۔

ب۔ (ہنسی سے بے حال) سرے میں! ہا ہا ہا! خیال برا نہیں ہے! میں نے آج آپ ہی کو ایسا شخص پایا ہے جو یہ نہیں جانتا کہ نارٹن فالگیٹ کہاں ہے (اپنے عمل پر خود نادم ہو کر) خدا حافظ! مسٹر مارج بنیکس مجھے امید ہے کہ آپ میری اس ہنسی کو معاف فرمائیں گے اور کچھ اثر نہ لیں گے (پھر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے)

ی م (گھبراہٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے) نہیں نہیں کوئی بات نہیں!

ب۔ خدا حافظ کینڈی! پھر کبھی آؤں گا جیمس خدا حافظ!

م۔ تو کیا آپ جائیے ہی گا؟

ب۔ نہیں، تمہارے آنے کی ضرورت نہیں! (شاداں و فرحاں باہر چلا جاتا ہے)

م۔ میں تمہیں کچھ دور تو پہونچا آؤں (اس کے پیچھے جاتا ہے)

(یوجین ان دونوں کی طرف سہما ہوا دیکھتا رہتا ہے، سانس نہیں لیتا یہاں تک کہ بر گیس نظروں سے غائب ہوجاتا ہے)

ک۔ (ہنستے ہوئے) یوجین (یوجین چونک پڑتا ہے اور نہایت مشتاقانہ اس کی طرف آتا ہے لیکن اس کی ہنستی ہوئی نظروں کو دیکھ کر ایک دم رک جاتا ہے) میرے باپ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ی م۔ میرا۔۔ میں ابھی تک اُن کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا لیکن نہایت عمدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

ک۔ (ہلکے طنز سے) اور تم فری مین فاؤنڈرس کلب ان کی دعوت کھانے جاؤ گے ضرور۔ کیوں نا؟

ی م۔ (گھبراہٹ سے اور اس مذاق کو سنجیدہ بات سمجھتے ہوئے) ہاں! اگر آپ کی ایسی ہی خواہش ہے۔

ک۔ (متاثر ہو کر) تمہیں معلوم ہے کہ تم بہت ہی اچھے لڑکے ہو یوجین، بہت عجیب، اگر تم میرے والد پر اس وقت ہنسے ہوتے تو مجھے برا نہ معلوم ہوتا لیکن تم نے بہت اچھا کیا کہ تم ہنسے نہیں اور ان سے اچھی طرح پیش آئے

ی م۔ کیا مجھے ہنسنا چاہئے تھا؟ ہاں میں نے بھی یہ خیال کیا تھا کہ انھوں نے کوئی دلچسپ بات کہی تھی لیکن قصہ یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے میں اس قدر غیر مطمئن رہتا ہوں کہ مجھے کسی مذاق کا بھی پتہ نہیں چلتا مجھے بہت افسوس ہے (وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے، کہنیاں گھٹنوں پر اور سر کو مٹھیوں سے دبائے گویا بہت ہی تکلیف میں ہے)

ک۔ (اسے خوش کرتے ہوئے) اچھا ہوگا، خیر بڑے بچے! آج تو تمہاری حالت ہر روز سے زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے، کیا بات ہے؟ گاڑی میں اس قدر سست اور رنجیدہ کیوں بیٹھے رہے؟

ی م۔ وہ کچھ نہیں، میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ گاڑیبان کو کرایہ کتنا دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا سوچنا محض بیوقوفی ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ چیزیں میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہیں اور میں اجنبی لوگوں سے ملنے جلنے میں کس قدر الگ الگ جان چھپائے پھرتا ہوں (جلدی اور خجستگی سے) لیکن اب وہ تو سب قصہ ختم ہو گیا۔ گاڑیبان خوشی سے کس قدر پھول گیا تھا اور کس ادب سے اس نے اپنی ٹوپی

اٹھائی جب ماریل نے اسے دو شلنگ دئے۔ میں تو دس دینے والا تھا۔

(ماریل اندر واپس آتا ہے چند خطوط اور اخبار ہاتھ میں ہیں جو ابھی دوپہر کی ڈاک سے آئے ہیں)

ک۔ ارے جیمس، ڈیر! یو جیس گاڑیبان کو دس شلنگ دینے جارہا تھا۔ دس شلنگ صرف تین چار منٹ کے کرایہ کے لئے! اوہ، ڈیر!

م۔ (میز پر سے اپنے خطوط دیکھتے ہوئے) مارچ بینکس! ان کے کہنے کا تم خیال نہ کرو۔ زیادہ دینے کی طبیعت بہتر ہے بہ نسبت کم دہی کے یہ آج کل بہت شاذ ہوتی ہے۔

ی م۔ (ناامید ہوتے ہوئے) نہیں، یہ سب محض بزدلی اور کمزوری ہے۔ مسٹر ماریل بالکل حق بجانب ہیں۔

ک۔ ہاں واقعی ہیں (اپنا ہینڈ بیگ اٹھالیتی ہے) اچھا میں تمہیں جیمس کے پاس فی الحال چھوڑے جاتی ہوں میرا خیال ہے کہ تم اس قدر کافی شاعر ہو کہ شاید ہی محسوس کر سکو کہ ایک عورت میں اکیس دن بعد اپنے گھر واپس آتی ہے تو اسے اپنا گھر کیسا لگتا ہے۔ اوہ میرا کمبل کا بنڈل تو اٹھا دو (یوجین وہ پارسل کوچ سے اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے، وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیتی ہے اور بیگ دائیں ہاتھ میں) اچھا اب میرا لبادہ میرے ہاتھ پر لٹکا تو دو (وہ ایسا ہی کرتا ہے) اور میری ہیٹ! (وہ ہیٹ کو بیگ والے ہاتھ میں دیتا ہے) اچھا اب میرے لئے دروازہ تو کھول دو (وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتا ہے) شکریہ! (وہ باہر چلی جاتی ہے اور مارچ بینکس دروازہ بند کر لیتا ہے)

م۔ (اب بھی اپنی میز پر مشغول ہے) تو مارچ بینکس تم کھانا کھا کر جاؤ گے۔ سمجھ گئے؟

ی م۔ (گھبرا کر) نہیں، اب مجھے رکنا نہیں چاہئے (وہ ماریل کی نظروں کی طرف جلدی سے دیکھتا ہے لیکن اس کی مہربانی کی نظر بچا جاتا ہے اور نہایت ہی گو بڑ میں کہتا ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ میں رک نہیں سکتا۔

م۔ تمہارا مطلب یہ کہ تم رکو گے نہیں؟

ی م۔ (خلوص اور مستعدی سے) نہیں۔ میں رکتا تو ضرور قطعی۔ شکریہ، بہت بہت لیکن — لیکن

م۔ لیکن لیکن لیکن، لیکن چش! اگر تمہیں رکنا ہے تو رک جاؤ۔ اگر شرم معلوم ہوتی ہے تو جاؤ اور ذرا پارک میں دو ایک چکر لگا آؤ۔ ڈیڑھ بجے تک خوب شاعری کرو پھر اس کے بعد چلے آنا اور خوب پیٹ بھر کے کھانا کھانا

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کرتا لیکن مجھے واقعی ایسا کرنا چاہیئے؟ اصل یہ ہے کہ مجھ سے مسز ماریل نے کہدیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ انھوں نے کہا تھا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ مسٹر ماریل تم کو کھانا کھانے کے لئے روکیں گے لیکن اگر روکیں تو تم نہ رکنا کیونکہ وہ جی سے نہ کہیں گے (بھرائی ہوئی آواز سے) انھوں نے کہا تھا کہ تم سمجھ جانا لیکن میں سمجھ ہی نہیں پاتا ہوں کہ اب جیسا آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے رکنا چاہیئے کہ نہیں لیکن آپ مہربانی سے اون سے نہ کہیئے گا کہ میں نے آپ سے یہ بات کہدی۔

م۔ (ہنسی سے پھولتے ہوئے) اوہ، بس اتنی سی بات ہے، تو بس اب تم میرا ہی کہنا مانو کہ ذرا پارک میں دو چار چکر لگا آؤ تمہاری دقت رفع ہو جائے گی

ی م۔ کیسے ؟

م۔ (ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے) بڑے گدھے ہو لیکن اس قدر صفائی خود اسے اور یوجین کو ناگوار معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے کو روکتا ہے) نہیں میں اس طرح نہ کہوں گا۔ (وہ یوجین کے پاس نہایت بزرگانہ مہربانی سے آتا ہے) پیارے لڑکے ہم دونوں کی سی پر مسرت شادیوں میں بیوی کا گھر واپس آنا نہایت متبرک حیثیت رکھتا ہے (مارچ بینکس جلدی سے اس کی طرف دیکھتا ہے کچھ کچھ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے) اگر کوئی پرانا ساتھی یا درحقیقت کوئی واقعی ہمدرد بیتی ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن کبھی کبھی کا آنے والا ایسے موقعوں پر حارج ہوتا ہے۔ (یوجین کو جس بات کا ڈر تھا وہی کہی جاتی ہے چنانچہ اس کا چہرہ اس بات کو سمجھ کر ڈرجاتا ہے لیکن ماریل اپنے خیالات میں محو اس بات کو محسوس نہیں کرتا اور کہے جاتا ہے) کینڈ ڈا نے یہ خیال کیا کہ شاید میں تمہاری موجودگی یہاں پسند نہ کروں لیکن اس نے غلطی کی میں تمہیں بیحد چاہتا ہوں، چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی دیکھ لو کہ ہماری ازدواجی زندگی کس قدر پر مسرت ہے۔

ی م۔ پر مسرت! تمہاری شادی! تمہارا ایسا خیال ہے۔ آپ کو اس امر کا یقین ہے!

م۔ (خوشی سے) لڑکے میں اسے قطعی جانتا ہوں لارڈ شفٹ فوکالڈ نے لکھا ہے کہ اکثر شادیاں غنیمت ہو جاتی ہیں لیکن پر مسرت شادی کوئی نہیں ہوتی۔ لیکن تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کس خوشی سے ایسے چھوٹے، مکار کی افترا پردازی دیکھتا ہوں، ہاہا، اچھا اب تم پارک جاؤ اور، اپنی نظم لکھو۔ پورے ڈیڑھ بجے آجانا۔ اچھی طرح سمجھ لو

کہ ہم انتظار نہیں کیا کرتے۔

ی م۔ (غصہ سے) نہیں ذرا رک جائیے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے کھلوا لوں گا قطعی۔

م۔ (متعجب ہو کر) آئیں! آخر کیا چیز کھلوا لو گے؟

ی م۔ میں ضرور کہوں گا۔ ایک بات ایسی ہے جو ہمارے آپ کے درمیان قطعی طے ہو جانا چاہئے۔

م۔ (اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) ابھی؟

ی م۔ (نہایت جوش سے) ابھی قبل اس کے کہ آپ کمرے سے باہر جائیں (وہ چند قدم پیچھے ہٹتا ہے گویا کہ ماریل کو دروازہ کی طرف جانے دینا نہیں چاہتا)

م۔ (بغیر حرکت کئے۔ نہایت سنجیدگی سے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ واقعی کوئی خاص بات ہے) میں ابھی جاتا نہیں ہوں میاں صاحبزادے۔ بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ تم جا رہے ہو (یوجین اس کے پختہ لہجے سے اور بھی مشتعل ہو جاتا ہے لیکن مارے غصہ کے کانپ رہا ہے اور اس کی طرف بیٹھ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماریل اس کے پاس جاتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر نہایت محبت سے لیکن جا کے رکھتا ہے اور اس کا کچھ خیال نہیں کرتا کہ وہ اس کے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے) کیا بات ہے میاں؟ اطمینان سے بیٹھ تو جاؤ اور پھر بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے یاد رکھو کہ ہم لوگ تو آپس میں دوست دوست ہیں اس لئے ایک دوسرے کی بات صبر و توجہ سے سنیں گے وہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ی م۔ (گھوم کر منہ سامنے کرتے ہوئے) نہیں میں کچھ بھول نہیں رہا ہوں میں صرف (اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے) ڈر رہا ہوں (ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے اور اپنے منہ کو ماریل کی طرف نہایت غصہ سے بڑھاتے ہوئے اور چیخ کر کہتے ہوئے) تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ وقت صبر و توجہ کا ہے کہ نہیں! (ماریل بالکل پتھر کی طرح مضبوط ساکت بیٹھا اس کی طرف نہایت مہربانی سے دیکھ رہا ہے) مجھے ایسی مطمئن نظروں سے نہ دیکھو تم شاید سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ لیکن اگر تمارے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو میں تم کو چکرا دوں گا۔

م۔ (نہایت پختہ خود اعتمادی سے) مجھے چکرا دوگے؛ صاحبزادے بولو تو آخر کس طرح؟

ی م۔ پہلی بات تو یہ کہ ــــ

م۔ ہاں، پہلی بات تو یہ کہ؟

ی م۔ کہ میں تمہاری بیوی سے محبت کرتا ہوں۔

(ماریل کچھ رُکتا ہے اس کے بعد ایک لمحہ بھر اس کی طرف تکتا رہتا ہے اور پھر اس کے بعد ناقابل برداشت ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ یوجین چونک پڑتا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا اور جلد ہی غصہ اور حقارت سے بھر جاتا ہے)

م۔ (بیٹھتے ہوئے تاکہ اپنی ہنسی کو ختم کرے) ہاں ہاں! میرے پیارے بچے تم کو واقعی اس سے محبت ہو گی ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے بلکہ لوگ مجبور ہیں اس سے محبت کرنے کے لئے اور مجھے یہ چیز پسند ہے لیکن (اس کی طرف نہایت خوش مزاجی سے دیکھتے ہوئے) میں کہتا ہوں یوجین کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ ہر کسی سے کہا بھی جائے؟ تم ابھی بیس برس کے بھی نہیں ہوئے اور وہ تیس کے اوپر ہے۔ کیا دراصل تمہاری محبت ایسی نہیں معلوم ہوتی گویا طفلانہ محبت ہو؟

ی م۔ (گرج کر) کیا تم اس کے متعلق ایسے الفاظ کہہ سکتے ہو! وہ جس محبت اور جس جذبہ عشق کو پیدا کرتی ہے۔ اسے ان الفاظ سے تعبیر کرنا اس کی ہتک کرنا ہے۔

م۔ (نہایت تیزی سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اور بالکل بدلے ہوئے لہجہ میں) اس کی ہتک! یوجین! ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو، ابھی تک میں خاموش رہا اور مجھے امید ہے کہ خاموش رہوں گا لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن کی میں قطعی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھ کو اس بات پر مجبور نہ کرو کہ میں اپنا برتاؤ تمہارے ساتھ بالکل ویسا رکھوں جیسا کہ ایک بچہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ آدمی بنو! آدمی تم اب بچہ نہیں ہو۔

ی م۔ (ہاتھ کی ایسی حرکت سے گویا وہ چند چیزوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہے) اونھ! یہ سب تصنع اور بناوٹ چھوڑ دو میری روح کانپ جاتی ہے جب میں سوچتا ہوں کہ اس کو اتنے برس اسی قسم کی مصنوعی اور بناوٹی باتیں سننے میں برداشت کرنے پڑے جبکہ تم اپنی خود بینی اور آرام کے لئے اپنی اغراض پر اندھا دھند اس کو بھینٹ چڑھاتے رہے۔ تم (اس کی طرف منہ کرتے ہوئے) جس کا ایک خیال ایک احساس بھی اس کے

خیالات و احساسات سے لگا نہیں کھاتا۔

م۔ (فلسفیانہ طور پر) لیکن وہ ان سب باتوں کو اطمینان سے برداشت کر لیتی ہے (اس کے چہرے کی طرف بالکل سامنے دیکھتے ہوئے) یوجین، پیارے لڑکے تم محض اپنے کو بیوقوف بنا رہے ہو، بہت ہی بیوقوف۔ یہی لفظ تمہارے بالکل صحیح ہے اور اس وقت تمہارے حسب حال بھی۔ (اس بات کو اپنے پرانے طریقہ یعنی سر کو جھٹکا کر کہتا ہے اور آتشدان کے قریب چٹائی پر جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ سینکنے لگتا ہے)

ی م۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب میں جانتا نہیں ہوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ چیزیں جن کے متعلق لوگ اپنے کو بیوقوف بنا لیتے ہیں، وہ ان چیزوں کی بہ نسبت جن کے متعلق لوگ اپنے کو عقلمند بنائے رکھتے ہیں کم صحیح یا کم سچی ہوتی ہیں؟ (ماریل کا اطمینان پہلی مرتبہ غائب ہوتا ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے متحیر ہو جاتا ہے، اپنے ہاتھ سینکنا بھول جاتا ہے کھڑا سنتا رہتا ہے چوکنا۔ اور سوچ میں) بلکہ وہی چیزیں زیادہ سچی اور حقیقی ہوتی ہیں۔ تم اپنے کو بہت خاموش اور متحمل اور اپنے کو بہت عقلمند بنائے ہوئے ہو۔ کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ میں تمہاری بیوی کے متعلق بے وقوف بنا ہوا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ بڈھا شخص جو ابھی یہاں تھا نہایت عقلمند تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ تم سوشلزم کے متعلق نہایت بیوقوف بنے ہوئے ہو۔ (ماریل کی پریشانی نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے۔ یوجین اپنی بات بڑھتی دیکھ کر گفتگو بڑھاتا ہے اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے) کیا اس سے تمہیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کہ نہیں؟ کیا یہ آپ کی انتہائی متانت اور ظاہری سکون اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں؟

م۔ مارچ بینکس۔ شیطان تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا کر رہا ہے۔ ایک شخص کے جذبۂ خود اعتمادی کو متزلزل کر دینا بہت آسان بات ہے۔ نہایت ہی آسان! لیکن اس سے فائدہ اٹھا کر آدمی کی روح کو برباد کر دینا یہ شیطانی کام ہے۔ اس لئے غور کرو اور دیکھ لو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔

ی م۔ (درشتی سے) میں جانتا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں سب یہ دیدہ و دانستہ کر رہا ہوں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں جکڑا دونگا (دفعتاً ایک دوسرے کے مدمقابل آ جاتے ہیں اور ایک لمحہ تک

حریفانہ نگاہیں بدلتی رہتی ہیں اس کے بعد ماریل کو اپنی غلطی کا پھر احساس ہوتا ہے)

م۔ (نہایت شریفانہ، عنایت و محبت کے لہجہ میں) یوجین سنو، کسی نہ کسی دن مجھے امید کیا قطعی یقین ہے کہ تم بھی میری طرح ایک نہایت خوش و مطمئن آدمی ہو جاؤ گے (یوجین نہایت بے چینی سے بھرتا ہے جیسے کہ وہ خوشی اور اطمینان سے قطعی التفات نہیں رکھتا۔ ماریل اس پر بڑی ذلت محسوس کرتا ہے لیکن پھر بھی نہایت خوبصورتی سے اپنے کو قابو میں رکھتا ہے مستقل مزاجی اور نہایت خوبی سے اپنے طرز تقریر کو قایم رکھتا ہے) تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم اپنی تمام کوششوں سے، دنیا کے چپہ چپہ میں اپنے گھر کی ایسی خوشی و مسرت پھیلانے کی کوشش کرو گے۔ دنیا کو جنت بنانے والوں میں سے ایک تم بھی ہو گے۔ ممکن ہے تم مجھ سے بھی بڑھ جاؤ اور ایک بڑے تعمیری شخص نکلو اور میں محض ایک معمولی مسافر۔ تم ابھی نوجوان ہو لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم میں خوبیاں اور لیاقت مجھ سے بڑھ کر ہیں۔ تم شاعر ہو اور شاعری کے اندر خدا اپنی تمام الوہیت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس وقت تم کو اتنی بڑی بات سن کر کانپ جانا چاہئے یہ سوچ کر کہ ایک بہت بڑا بار امانت تم کو اٹھانا ہے اور اتنے بڑے عطیہ کا حامل ہونا ہے۔

ی م۔ (بغیر متاثر ہوئے اور بیدردی سے۔ اس کے لڑکپن کا بے ڈھنگا جوش ماریل کی بلاغت کے سامنے ایک واضح تضاد پیش کرتا ہے) میں اس بات کو سن کر نہیں کانپتا۔ ہاں البتہ جب اس الوہیت کے فقدان کو دوسروں میں دیکھتا ہوں تب البتہ کانپ جاتا ہوں۔

م۔ (اپنی فصاحت و بلاغت کو دو آتشہ کرتے ہوئے سچے جوش اور یوجین کی ضد سے متاثر ہو کر) اچھا اگر ایسا ہی ہے تو وہ الوہیت اُن لوگوں میں، مجھ میں پیدا کر دو اسے ختم کرنے کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ آئندہ جب تم بھی اتنے ہی خوش ہو جاؤ گے جتنا کہ میں ہوں تو میں تمہارا دینی بھائی بن جاؤں گا۔ میں تم کو اس اعتقاد میں مدد دوں گا کہ خدا نے ہمیں ایک دنیا دی ہے جسے ہم محض اپنی بیوقوفی کے باعث جنت نہیں بنا پاتے۔ میں تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہارا ہر فعل خوشی و مسرت کے بیج بو رہا ہے اور جس سے تمام دنیا، معمولی لوگ بھی رہتی دنیا تک فائدہ و مسرت اُٹھاتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں تم کو تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہاری بیوی تم سے

محبت کرتی ہے اور تمہارے گھر میں نہایت خوش و خرم ہے۔ ایچ بینکس ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کی استقامت کی ضرورت رہتی ہے۔ بلکہ بے انتہا رہتی ہے اور ہمیشہ۔ دنیا میں بہت سی چیزیں اور باتیں ایسی ہیں جو ہمیں شک میں ڈالنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں اگر ہم ذراسی ڈھیل دیں تو یہ ہم پر فوراً یورش کر دیں گی۔ اپنے گھروں میں بھی ہم ایسے رہتے ہیں جیسے کسی میدان میں خیمہ ڈالے پڑے ہوں اور چاروں طرف شک کی فوجیں گھیرا ڈالے ہوئے ہوں۔ کیا تم غداری کر کے ان فوجوں کو میرے گھر میں داخل کر کے مجھے تباہ کر ڈالو گے؟

ی م۔ (وحشت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے) کیا وہ اسی طرح کے لفظی گورکھ دھندے تمہارے ہاں سنا کرتی ہے ایک عورت جس کا دل اعلیٰ، دماغ ارفع اور جس کی روح حق، سچائی اور آزادی کی طلبگار رہا اسے تشبیہ و استعارات، وعظ، فرسودہ تقریروں اور محض لسانی کے خالی گھونٹ دئے جاتے ہیں۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ عورت کی روح محض ان تقریروں پر زندہ رہ سکتی ہے؟

م۔ (جل کر) ایچ بینکس! ابھی تک تو میں کچھ بولا نہیں لیکن اب تم مجھے بے اختیار کئے دے رہے ہو۔ میری لیاقتوں میں اسی قدر حقیقت موجود ہے جتنی کہ تمہاری لیکن اظہار حقیقت کے لئے صحیح اور مناسب الفاظ مہیا کرنا یہ ایک عطیہ فطری ہوا کرتا ہے۔

ی م۔ (غصہ سے) یہ محض چرب زبانی کا عطیہ ہے اور کچھ نہیں۔ تمہاری لفاظی کے عطیہ کو حقیقت بیانی سے کیا نسبت اور اگر ہے تو بس اسی قدر کہ جتنا ایک باجہ بجانے کے لئے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہارے گرجے میں کبھی نہیں گیا ہوں لیکن میں تمہارے سیاسی جلسوں میں گیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ واقعی تم مجمع کو اس قدر متاثر کر لیتے ہو گویا وہ سب شراب پئے ہوئے ہوں اور ان سب کی بیویاں اپنے اپنے شوہروں کا منہ تکتی رہتی ہیں کہ یہ کس قدر بیوقوف ہو گئے ہیں۔ ہاں! خوب یاد آیا یہ قصہ تو پرانا ہے تم کو انجیل میں بھی مل جائے گا۔ وہ یہ کہ داؤد علیہ السلام کو جوش برانگیختہ کرنے میں تمہاری طرح کمال حاصل تھا لیکن نہایت ذور دے کر کہتے ہوئے) ان کی بیوی دل میں ان سے نفرت کرتی تھیں۔

م۔ (بڑے غصہ سے) اچھا، میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ، سنا تم نے؟ (وہ اس کی طرف نہایت غصہ سے بڑھتا ہے)

ی م۔ (صوفے سے چپکتے ہوئے) مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مت چھوؤ (ماریل نہایت مضبوطی سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑتا ہے۔ یوجین صوفے میں دبک جاتا ہے اور زور سے چیخنے لگتا ہے) چھوڑ دو ماریل! دیکھو اگر تم نے مجھے مارا تو میں اپنے کو مار ڈالونگا میں اسے برداشت نہیں کر سکتا (منہ بسورتے ہوئے) مجھے جانے دو۔ ہٹاؤ اپنا ہاتھ!

م۔ (حقارت سے آہستہ لیکن زور دے کر کہتے ہوئے) بزدل، رونا بلا (اسے چھوڑتے ہوئے) جا قبل اس کے کہ تو ڈر کر رونے لگے۔

ی م۔ (صوفے پر گہری سانسیں لیتے ہوئے لیکن ماریل کی دست کشی سے مطمئن ہو کر) میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ دراصل تم مجھ سے ڈرتے ہو۔

م۔ (اطمینان سے اس کے سر پر کھڑے ہوئے) یہ تو ظاہر ہی ہے، بالکل صاف ظاہر ہے۔ یہ تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔

ی م۔ (بڑبڑاتے ہوئے ضد سے) ہاں یہ بالکل صاف ظاہر ہے (ماریل حقارت سے منہ پھیر کر آگے بڑھتا ہے۔ یوجین کوشش کرکے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے جاتا ہے) تم یہ سمجھتے ہو چونکہ میں مار کھانے سے ڈرتا ہوں (آواز رونی ہو جاتی ہے) چونکہ میں کچھ کر نہیں سکتا سوائے اس کے کہ میں رو دوں جب میرا مقابل کوئی طاقتور شخص ہو جائے۔ چونکہ میں گاڑی کی چھت سے اتنا بڑا اور بھاری بنڈل نہیں اٹھا سکتا جتنا کہ تم اٹھا سکتے ہو چونکہ ایک مدہوش مزدور کی طرح تمہاری بیوی کی خاطر تم سے لڑ نہیں سکتا۔ ان سب باتوں سے تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے ڈرتا ہوں لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ اگرچہ مجھ میں جسے تم برطانوی ہمت کہتے ہو نہیں ہے تو مجھ میں برطانوی بزدلی بھی نہیں ہے۔ میں ایک پادری کے خیالات کو شکست دیدوں گا۔ قطعی اور فاش۔ میں خود اپنے خیالات ان کی جگہ قائم کروں گا اور اُس کو تمہارے خیالات کی غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ تم مجھے گھر سے باہر نکالے دے رہے ہو اس لئے کہ تم اُسے میرے اور اپنے خیالات میں اپنی مرضی کے مطابق پسند کرنے کی اجازت اور آزادی دینا نہیں چاہتے اور اسی ڈر کی وجہ سے اب مجھے اُس سے ملنے نہیں دینا چاہتے ہو (ماریل غصہ سے ایک دم اس کی طرف مڑ پڑتا ہے۔ یوجین مارے ڈر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے) مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں جا رہا ہوں۔

م۔ (حقارت آمیز نفرت سے) نہیں، تھوڑی دیر رک جاؤ اب میں تمہیں چھوؤں گا بھی نہیں، ڈرو مت۔ جب میری

بیوی واپس آئے گی، وہ مجھ سے پوچھے گی کہ تم کیوں چلے گئے اور جب اس سے کہا جائے گا کہ اب تم کبھی ہماری دہلیز پر قدم نہیں رکھ سکتے تو وہ پوچھے گی کہ کیوں ؛ پھر مجھے تشریح کرنا ہوگی اور میں تمہارے پاجی پن کا قصہ سنا کر اسے غمگین کرنا نہیں چاہتا۔

ی م۔ (تازہ جوش سے پھر واپس آتے ہوئے) نہیں تم کو بتانا چاہئے، بلکہ بتانا ہوگا اور اگر تم ذرا بھی جھوٹ بولے تو میں تمہیں نہایت بزدل جھوٹا اور فریبی سمجھوں گا۔ اس سے وہی کہنا جو کچھ میں نے کہا ہے اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے اپنی طاقت اور پامردی دکھا کر مجھے ایسا جھنجھوڑا کہ جیسے کتا چوہے کو جھنجھوڑتا ہے اور کس طرح میں دبک گیا اور ڈر گیا۔ اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے مجھے بزدل رونا اور رکتے کا پلّا بنایا اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ اگر یہ سب اس سے نہ کہو گے تو میں خود کہہ دوں گا بلکہ اسے سب حالات لکھ کر بھیجدوں گا۔

م۔ (حیران ہوکر) یہ آخر تم یہ سب باتیں کیوں اسے بتانا چاہتے ہو؟

ی م۔ (شاعرانہ بشاشت کے ساتھ) کیونکہ وہ مجھ کو سمجھ جائے گی اور یہ بھی سمجھ جائے گی کہ میں بھی اس کو سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی اسے بتانے میں چھوڑا، اگر تم حرف بحرف سچا واقعہ اس کے سامنے رکھنے کے لئے تیار نہیں ہو جیسا کہ میں چاہتا ہوں تو سمجھ لو کہ آخر زندگی تک تمہیں اس کا احساس رہے گا کہ دراصل وہ میری ملکیت ہے نہ کہ تمہاری پس خدا حافظ! (جاتے ہوئے)

م۔ (نہایت پریشان ہوکر) رکو! میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔

ی م۔ (دروازہ کے قریب گھومتے ہوئے) بہر حال جب میں چلا جاؤں گا تو تم اس سے کچھ تو کہو گے ہی —— یا سچ کہو گے یا جھوٹ —— بہر حال دونوں میں میرا فائدہ ہے۔

م۔ (مصالحت کے لہجہ میں) مارچ بینکس! بسا اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے ——

ی م۔ (بات کاٹتے ہوئے) ہاں میں جانتا ہوں کہ جھوٹ بولا جائے لیکن یہ سب بیکار ہوگا۔ خدا حافظ پادری۔ (جیسے ہی یوجین جانے کیلئے دروازہ کھولتا ہے۔ ادھر سے کینڈڈا آجاتی ہے۔ جو گھر کے کام کاج کا لباس پہنے ہوئے ہے)

ک۔ یوجین کیا چلدئے؟ (اس کی طرف بہت غور سے دیکھتے ہوئے) اوہ۔ خدا کی پناہ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ اس

حالت میں باہر جا رہے ہو۔ واقعی تم بڑے شاعر ہو جیمس ذرا اس کو دیکھو تو (وہ اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر اس کو سامنے لاتی ہے اور ماریل کو دکھلاتی ہے) ذرا آپ کا کالر تو دیکھئے، ٹائی دیکھئے اور ذرا بالوں کی حالت دیکھئے کوئی دیکھے تو کہے کہ خدا نخواستہ جیسے کسی نے گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے (یوجین اب ماریل کے چہرہ کی حالت دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کینڈڈا اسے پھر گھسیٹتی ہے) جس اب ذرا سیدھے کھڑے رہو، چپ چاپ (وہ اس کے کوٹ کے بٹن ایک ایک کر کے بند کرتی ہے، ٹائی کی گرہ باندھتی ہے اور بالوں کو سدھار دیتی ہے) ہاں، اب تم ٹھیک معلوم ہوتے ہو۔ ایک اچھے لڑکے کی طرح۔ ایسے کہ اب میں تم سے کہہ سکتی ہوں کہ بہتر یہ ہے تم ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر جاؤ۔ حالانکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ ایسا نہ کرنا۔ کھانا بس آدھ گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ (وہ اس کی ٹائی کی گرہ کو آخری بار ٹھیک کرتی ہے اور یوجین اس کا ہاتھ چوم لیتا ہے) اونھ، بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔

ی م۔ میں رکنا واقعی چاہتا ہوں اگر آپ کے شوہر صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

ک۔ جیمس، اگر یوجین ایک اچھے لڑکے کی طرح رہنے کا وعدہ کرے اور میرے کام میں مدد دے تو اس کو رکنے کی اجازت ہے؛

م۔ (مختصراً) ہاں ہاں ضرور (وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنے کاغذات مشغول ہونے کا بہانہ کرتا ہے)

ی م۔ (اپنا بازو کینڈڈا کی طرف بڑھاتے ہوئے) آئیے میز پر کھانا چن دیں (وہ اس کا بازو قبول کر لیتی ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں جب باہر جاتے ہیں تو یوجین کہتا ہے) اس وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ مسرور شخص ہوں۔

م۔ میں بھی تھا۔ ایک گھنٹہ ہوا۔

(پردہ) (باقی آئندہ)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

# شاعر خدا کے حضور میں

## شاعر

اے الٰہ العالمیں!

اے کہ تجھ سے رونق روئے فلک، روئے زمیں! اے کہ تیرے نور سے روشن ہے گیتی کی جبیں!
اے کہ پہنائے دو عالم ہے ترے زیر نگیں! اے مرے معبود! کوئی بھی ترا ہمتا نہیں!!

اے الٰہ العالمین!

اپنے درد و غم کا تجھ سے ماجرا کہنے کو ہوں روح پر جو جھیلتا ہوں بر ملا کہنے کو ہوں
جانے اب حرف روا یا نا روا کہنے کو ہوں خون میں ڈوبا ہوا ہے میرا حرف آتشیں

اے الٰہ العالمیں!

لعل و یاقوت و گہر سرمایہ داری کیلئے مخملوں کی زرنگاری اشہریاری کیلئے
حور و غلماں اہرمن کی بیش کاری کیلئے تیرے بندوں کے لئے آب خنک نان جویں

اے الٰہ العالمیں!

عشرتیں ہی عشرتیں ہیں اہرمن کے واسطے جنتیں ہی جنتیں ہیں اہرمن کے واسطے
تیری ساری نعمتیں ہیں اہرمن کے واسطے جو بچارے ہیں ترے ان کے لئے کچھ بھی نہیں!

اے الٰہ العالمیں!

اہل حق کے واسطے زخم جگر، رنج و محن! اہل حق کے واسطے زنداں ہے یا دار و رسن!
اہل حق کی نیتیں ہیں خوار، بے گور و کفن! ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے دل اندوہگیں

اے الٰہ العالمیں!

بے کسوں کے پاس محنت کے سوا کچھ بھی نہیں ان کی قسمت میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اک تری رحمت کی حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں　　ڈر ہے یہ بھی تجھ سے برگشتہ نہ ہو جائیں کہیں!!

اے الٰہ العالمیں!

غمزدوں کی سرد اور خاموش آہوں کی قسم　　پھیکی پھیکی صورتوں، غمگیں نگاہوں کی قسم

تیری خاموشی کی، تیرے داد خواہوں کی قسم　　ڈگمگا جاتا ہے میرا بھی کبھی پائے یقیں!

اے الٰہ العالمیں!

## خدا

کارزارِ دہر میں شمشیر اٹھانا چاہیے　　زخم بڑھ بڑھ کر لگانا اور کھانا چاہیے!

باغِ ہستی میں اگر ہے شوق گل چینی تجھے　　خار چبھنے پر بھی تجھ کو مسکرانا چاہیے

زندہ لاشیں ہیں جنھیں کہتے ہیں مزدورو کسان　　زندہ رہنے کا سبق ان کو سکھانا چاہیے

دیکھ کیسے ٹوٹتا ہے سحرِ زرداری کا فسوں!　　خفتہ بختوں کا ذرا شانہ ہلانا چاہیے

خود بھی گر جانے کو ہے دیوارِ استبداد کی　　اس کو گرنے کا مگر کوئی بہانا چاہیے

ریزہ ریزہ ہو کے پیوندِ عدم ہو جائے گی　　ق　　ضرب کاری "نامِ حق" لے کر لگانا چاہیے

اُلٹی اور بے حسی کا نام مذہب ہے اگر　　صفحۂ ہستی سے مذہب کو مٹانا چاہیے

زندگی ہی زندگی ہے، آگہی ہی آگہی　　حق کو راہِ زیست میں مشعل بنانا چاہیے۔

حق ہی حق تجھ کو نظر آئے گا ہر سو جلوہ گر　　اک ذرا باطل کے پردے کو ہٹانا چاہیے

اہرمن نے کر دیا تیرا گلستاں پائمال　　پھر اسی اجڑے گلستاں کو بسانا چاہیے

میں مٹا سکتا ہوں دم بھر میں وجودِ اہرمن　　لیکن اے شاعر! تجھے خود ہی مٹانا چاہیے

اہرمن ہو سرنگوں، میری مسرت ہے یہی

تیرے ہاتھوں پہ گرے میری مشیت ہے یہی

## نغمۂ شاعر

مرا پیورش ہوا اہرمن کی بلند حق کا نشاں رہے گا!　　رہے گا جب تک بھی نقش باطل کا مردِ حق تیغ راں رہیگا

مری نوا بانگ صورِ حق ہے مری ضیا شمعِ نورِ حق ہے ہزار ہو برق و باد و باراں، رواں مرا کارواں رہیگا!

رہے گا وہ دورِ کامرانی چلے گا وہ دورِ شادمانی کشاکشِ خیر و شر رہے گی، نہ فکرِ سود و زیاں رہیگا!

دلوں میں ہوگا ظہورِ یزداں فضاؤں میں ہوگا نورِ یزداں رہے گا نام اہرمن کا باقی نہ اہرمن کا نشاں رہیگا!

رہے گی باطل کی شہریاری نہ اہلِ باطل کی فتنہ کاری رہے گا فرمانِ حق ہی جاری کہ حق ہی حق کامراں رہیگا!

نہ شوکتِ خواجگی رہے گی نہ نخوتِ سروری رہے گی نہ سطوتِ قیصری رہے گی نہ غرۂ حکمراں رہیگا!

نہ ہوگی بےکاریوں کی کلفت نہ ہوگی ناداریوں کی آفت نہ شکوۂ آسماں رہے گا نہ گریۂ خوں فشاں رہیگا

رہیں گی پامال آرزوئیں نہ رائگاں جائیں گی وفائیں نہ حسن دامن کشاں رہے گا نہ عشق گرمِ فغاں رہیگا

رہے گا دل شادِ عشق دائم رہے گا شاداب حسن دائم رہے گا بلبل کو شکوۂ گل نہ گل کو خوفِ خزاں رہیگا

اِدھر سے ہوگی دعائے الفت ادھر سے ہوگا نزولِ رحمت نہ حق سے ہم سرگراں رہیں گے نہ ہم سے حق سرگراں رہیگا

رہیں گی معصوم عرش والوں سے روز و شب صحبتیں ہماری رہے گا کوئی حجاب باقی، نہ آسماں درمیاں رہیگا

اتر کے عرشِ بریں سے ہوگا ہماری جنت میں جلوہ فرما خدائے حق بن کے نورِ الفت ہمارے ہی درمیاں رہیگا

شجر حجر سے، شب و سحر سے نجوم و خورشید سے قمر سے سرائے گیتی کے بام و در سے سدا یہ نغمہ رواں رہیگا

"خلیفۂ حق" نے اہرمن کو جہاں سے آخر مٹا کے چھوڑا

اور اپنے اجڑے ہوئے گلستاں کو رشکِ جنت بنا کے چھوڑا!"

(اثر صہبائی)

# ڈرائنگ رُوم

(سانیٹ)

یہ سینری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں

یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے

یہ ریڈیو ہے، یہ قمقمے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے

یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں!

——ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے یہ!

——ہاں اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے!

ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے!

سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے۔ ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ!

——اتنی جلدی مزدور عورت! آخر یہ گلے میں باہیں کیوں!

لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے!

اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے!

اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں——؟؟

——میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل میں

میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخییل کے میلے آنچل میں

(سلام مچھلی شہری)

# ہمارے یتیم خانے

یتیم بچوں کی پرورش بھی قوم کا ایک اہم فریضہ ہے مسلمانوں کے ہاں بھی یتیم خانے موجود ہیں مگر ان کی حالت اس قدر زبوں ہے کہ بیان سے باہر ہے بعض لوگوں نے تو اس کو معاش کا ذریعہ بنا لیا ہے. چار پانچ اندھے لولے یتیم بچوں کو لے کر اور ایک رسید بک چھپوا کر گلی گلی پھرایا جاتا ہے اور یتیم بچوں سے بھیک منگوا کر اپنا حلوا مانڈا سیدھا کیا جاتا ہے. کچھ باقاعدہ یتیم خانے بھی ہیں جن کی آمدنی کا دار و مدار کچھ وقف شدہ جائداد اور چندوں پر منحصر ہے. چندہ کرنا کچھ عیب کی بات نہیں ہے مگر جو طریقہ ہمارے یتیم خانوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ یتیم بچوں کی آئندہ زندگی کے لئے بھی مضر ہے. اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو دو تین تین یتیم بچے چندہ کا ایک مقفل بکس ہاتھ میں لئے ریلوں کے ڈبوں میں آتے ہیں اور اپنی درد بھری کتھا سنا کر مسافروں سے چندہ کی درخواست کرتے ہیں. اس کے علاوہ یتیم بچوں کو لے کر شہر در شہر کوچہ بہ کوچہ پھرایا جاتا ہے۔

اگر یتیم خانوں کے اندرونی حالات دیکھے جائیں تو اور زیادہ مایوس کن ہیں، نہ کوئی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے نہ یتیم بچوں کو کام کاج سے لگانے کی کوشش ہوتی ہے. مسلمانوں میں فقیروں کی کثرت کا باعث خود ہمارے یتیم خانے بھی ہیں جو انھیں بچپن ہی سے بھیک مانگنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

میرے خیال میں مندرجہ ذیل اصولوں پر یتیم خانوں کی تنظیم کی جا سکتی ہے :-

۱۔ ایک شہر میں صرف ایک یتیم خانہ ہو جو شہر کے معزز متمول حضرات اور تعلیم یافتہ حضرات کے تحت میں چلے لوگوں کو تلقین کی جائے کہ وہ ایسے لوگوں کو جو یتیم بچوں اور بچیوں کو لے کر ان کے گھروں پر آتے ہیں ہرگز چندہ نہ دیں۔

۲۔ یتیم خانے کی ایک عمدہ خوبصورت اور کشادہ عمارت ہو جس میں بچوں اور بچیوں کے رہنے کا باقاعدہ انتظام ہو عموماً یہ عمارت شہر کے باہر ہو. اس کے قریب کھیتی وغیرہ کے پارک ہوں تاکہ بچے کھیل کود کیلئے انھیں استعمال کر سکیں۔

۳- آمدنی کے ذرائع (۲) جو جائدادیں یتیم خانوں کے نام ہیں انھیں کمیٹی اپنے تحت میں کرے۔

(ب) اگر شہر میں ایسی مسجدیں ہوں جن کی آمدنی بہت زیادہ ہو تو ان کی منتظمہ کمیٹی کو مجبور کر کے ایک آدھ جائداد یتیم خانے کے نام وقف کرالی جائے۔

(ج) یتیم خانے کی کمیٹی کے معزز ممبران اپنی جیب سے کچھ ماہوار چندہ مقرر کردیں لیکن یہ رقم متعین نہیں کیجائے

(د) چندہ کے خوبصورت بکس بنوا کر مسلمان تاجروں کی دکانوں اور متمول ملازم پیشہ حضرات کے مکانوں میں لٹکائے جائیں تاکہ وہ روزانہ یا ہفتہ واری یا ماہواری اس میں کچھ چندہ ڈالدیا کریں۔ ہر ماہ یتیم خانہ کا ایک ملازم ان بکس میں سے باقاعدہ رسید دے کر رقم لے آئے۔

(ر) عموماً شہر کی میونسپل کمیٹیاں یتیم خانوں کو کچھ رقم سالانہ دیا کرتی ہیں اسے وصول کیا جائے۔

(س) بارہا سنا ہے کہ مسلمانوں کا لاکھوں روپیہ جو بینکوں میں سود کی شکل میں ملتا ہے ہر سال عیسائی مشنریوں کو چلا جاتا ہے۔ جس حد تک ہوسکے اس رقم کو وصول کیا جائے۔

یتیم خانے کا اندرونی انتظام | عموماً یتیم خانوں میں اس بات کا انتظام کیا جاتا ہے کہ بچوں کو کچھ قرآن شریف کی تعلیم اور کچھ لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس کے علاوہ چند یتیم خانوں میں بعض دستکاریاں سکھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے یہ چیزیں اپنی جگہ بہت اچھی ہیں مگر ان کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں نکل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر مندرجہ ذیل طریقہ ہے۔

(۱) بجائے خود پرائمری تعلیم کا انتظام کرنے کے بچوں کو میونسپل کمیٹی کے پرائمری اسکولوں میں تعلیم دلوائی جائے۔ اس سے یتیم خانے کو خواہ مخواہ تعلیم کے خرچ کا زیر بار نہیں ہونا پڑے گا۔

(ب) پرائمری تعلیم کے بعد جو چند لڑکے خوب ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتے ہوں ان کو ہائی اسکول میں داخل کرادیں۔ ان کے کھانے اور رہائش کا انتظام یتیم خانے میں ہو۔

(ج) عموماً ہر ایک صوبے میں صوبے کی حکومت کی طرف سے دستکاری سکھانے کا مفت انتظام ہوتا ہے۔ مثلاً دہلی میں محلہ چوڑی والان میں سرکاری دست کار انسٹیوٹ ہے۔ جہاں کپڑا بننا، کپڑا رنگنا۔ موزہ بنیائن بنانا، نواڑ بننا دری بننا وغیرہ وغیرہ کا کام مفت سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال عموماً جنوری فروری کے مہینے میں شہد کی

کھیاں پالنے کے طریقہ کی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ حکومت کی طرف سے اس قسم کا انتظام ہوتے ہوئے یتیم خانوں کا خود بخود اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا نہ صرف فضول خرچی ہے بلکہ بچوں کے لئے مضر ہے کیونکہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یتیم خانے خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکتے صرف معمولی انتظام پر اکتفا کرتے ہیں جو بچوں کو عمدہ دستکار نہیں بنا سکتا۔ برخلاف اس کے سرکاری دستکاری انسٹیٹیوٹ میں بخوبی انتظام ہوتا ہے سخت افسوس ہے کہ حکومت روپیہ صرف کرے دوسری قومیں فائدہ اٹھائیں ہم فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس واسطے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسی دستکاری انسٹیٹیوٹوں میں داخل کرایا جائے تاکہ یتیم بچے عمدہ دستکار ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

(د) اکثر بڑے لوگ جب کبھی کچھ بڑی دعوت کرتے ہیں تو یتیم بچوں کی دعوت بھی کر دیا کرتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یتیم خانے کے لوگ یتیم بچوں کی لین ڈوری بنا کر بازاروں میں سے گذارتے ہوئے دعوت کے مقام پر لیجاتے ہیں اس طریقہ کو بالکل بند کیا جائے کیونکہ یہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ بچوں کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔

(و) اکثر بڑے کارخانوں اور ریلوے ورکشاپ میں دس دس بارہ بارہ سال کے بچے بطور شاگردی (Apprentice) کے رکھے جاتے ہیں جنھیں چار پانچ سال تک کارخانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ شاگردی کے زمانے میں کچھ اجرت بھی دیجاتی ہے شاگردی کی مدت کے بعد انھیں وہاں پر باقاعدہ ملازم رکھ لیا جاتا ہے مثلاً حال ہی میں این۔ ڈبلیو۔ ریلوے کے ورکشاپ میں تین سو لڑکوں کی بطور تنخواہ دار شاگردوں کے ضرورت تھی جنھیں پانچ سال تک ٹریننگ دیجائے گی۔ ٹریننگ کے زمانہ کی اجرت پانچ آنے یومیہ پہلے سال۔ سات آنے یومیہ دوسرے سال۔ بارہ آنے یومیہ پانچویں سال مقرر تھی۔ اس کے بعد چودہ آنے یومیہ یا ایک روپیہ یومیہ پر انھیں باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائیگا۔ یتیم خانوں کو چاہئے کہ جب کبھی اس قسم کے اعلانات آئیں تو کچھ بچوں کو ورکشاپ میں داخل کرا دیں۔ وقتاً فوقتاً یتیم خانہ کا کوئی ممبر ان بچوں کی ورکشاپ میں جاکر دیکھ بھال کر لیا کرے۔

(ہ) جو نوجوان بچے کمانے کے لائق ہو جائیں ان کی شادی کا انتظام یتیم بچیوں سے کر دیا جائے یتیم بچیوں کو کشیدہ کاری اور دیگر گھریلو دستکاریاں سکھانے کا انتظام کیا جائے کچھ یتیم بچیوں کو دایہ پیشہ کی تعلیم دلائی جائے تاکہ وہ عمدہ اور قابل دایہ بن سکیں۔

(ی) اگر سرمایہ اجازت دے تو یتیم خانے کی حدود کو وسیع کیا جائے یعنی یتیم خانہ نہ صرف بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا انتظام کرے بلکہ شہر کے ان غریب مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت و پرورش کا انتظام بھی کرے جو غربت کے باعث اپنے بچوں کو نہ تعلیم دلا سکتے ہیں نہ کوئی دستکاری سکھا سکتے ہیں۔

محمد یونس صاحب متعلم ایم اے دہلی

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**سوگوار شباب** :۔ از مجنوں گورکھپوری۔ ایوان اشاعت گورکھپور، سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۱۳۶ قیمت عہ مجلد ۱۲ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ ایک طویل افسانہ ہے جسے مجنوں گورکھپوری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے۔ پلاٹ ہارڈی کے ایک مشہور ناول سے لیا گیا ہے اور ہندوستانی ماحول میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ آصف پور کا حاتم ایک جاہ نیاں جہاں گشت زمیندار سندیلہ کی ایک پڑھی لکھی خوبصورت مہذب گھرانے کی لڑکی سائرہ سے شادی کر لیتا ہے اور تین سال بعد پھر رگ دیوانگی پھڑکتی ہے اور وہ غائب ہو جاتا ہے۔ واقعاتِ قصہ اس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب اسے لاپتہ ہوئے آٹھ سال گذر جاتے ہیں اور سائرہ اٹھارہ برس کی حسینہ سے ۲۶ برس کی پختہ کار اور اپنی زمینداری کا انتظام کرنے والی بڑی منتظم بی بی ہو جاتی ہے۔ مشتاق اس کا ایک دور کا نوجوان رشتہ دار جو اپنی تعلیم صرف ایف۔ اے تک پوری کر کے اسے ختم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے، اس کی املاک کے ایک بوسیدہ اور شکستہ قدیم عمارت کنور کوٹ کو اپنی لائبریری بنانے کیلئے اجازت حاصل کر لیتا ہے۔ سائرہ بھی وہاں آنے جانے لگتی ہے اور محبت کے تماشے شروع ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ تمام رومانیت اور شعریت محض ایک جذبہ (جسے جنسی جبلت کہتے ہیں) کی کرشمہ سازیوں کا نام ہے جہاں یہ پورا ہوا یا عقل کو کسی طرح موقعہ مل گیا وہیں یہ جوش یہ آندھی محض ایک خوشنما لیکن بے بنیاد ڈھکوسلا معلوم ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اسی تلخ حقیقت کا ظاہر کرنا مجنوں صاحب کا مقصد اولین ہے۔ واقعات کچھ ایسے پلٹا کھاتے ہیں کہ مشتاق کو اس کا چچا پھر تعلیم کے لئے بھیج دیتا ہے۔ سائرہ کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی محبت محض ایک خود غرضی ہے ورنہ درحقیقت مشتاق کی جائز معشوقہ اور مشتاق سے کم عمر اس کی چچازاد بہن زینب ہے۔ اس حقیقت کا احساس اسے روکتا ہے کہ وہ مشتاق کو اپنی خود غرضی کا شکار نہ ہونے دے۔ چنانچہ شیخ حاتم کی وفات کی خبر سن کر ایک بہت معمولی آدمی سے شادی کر لیتی ہے اور اپنی کچھ جائداد مشتاق کے نام لکھ دیتی ہے اور ان تمام باتوں کی اطلاع مشتاق کو دیدیتی ہے۔

مشتاق کئی سال گھر نہیں آتا اور بالا بالا علی گڑھ سے ولایت چلا جاتا ہے اور وہاں کئی سال بعد سائرہ کے شوہر کی وفات کی خبر سن کر سائرہ سے شادی کرنے کی غرض سے واپس آتا ہے۔ سائرہ یہ مژدہ سنتے ہی جاں بحق ہو جاتی ہے۔

مجنوں صاحب میں رومانیت زیادہ ہے اور ہارڈی کی سی قنوطیت بہت کم ہے۔ اسی لئے اس افسانے میں وہ پہلو کمزور ہیں جہاں قدرت کی سفاکی اور بیرحمی جتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی مقامی حالات کی کم واقفیت نے اس ناول کو ایک رومانی دنیا میں ہی رکھا ہے اور ہارڈی کی طرح مفصل مقامی رنگوں کی تشریح سے جو دنیا ربت پیدا ہو جاتی ہے وہ اس میں کمتر پائی جاتی ہے۔ اس کا بہت کچھ ذمہ دار مجنوں صاحب کا فضیلت نما شاعرانہ خطابت کا اسلوب بھی ہے ممکن تھا کہ وہ چیز پیدا ہو جاتی اگر یہ افسانہ ناول کی شکل میں مفصل لکھا جاتا اور اسی اختصار کی وجہ سے ہارڈی کی طرح قدرت کے سامنے اس بےبسی کا اظہار نہیں ہو پایا جس میں انسان گرفتار نظر آتا ہے۔ البتہ مصنف کا مقصد واضح ہو گیا ہے کہ تمام شعریت اور رومانیت محض ایک جذبہ جنسی کی کرشمہ سازیوں کا ایک رنگین خواب ہے اور بس۔ اردو داں طبقے کی رومانیت سے حد سے زیادہ انس کیلئے تو یہ اچھا زہر ہے ورنہ شعریت بھی اپنی اقدار رکھتی ہے۔ امید ہے کہ مجنوں صاحب کا یہ افسانہ بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

**شہر خموشاں:**- از سید محمود مورخ بی۔ اے گلفروش پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۱۵ قیمت ۸ر۔ کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

یہ محمود صاحب کے سات سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں شاہد صاحب مدیر ساقی کا ایک مختصر تعارف نامہ بھی ہے۔ سائنٹفک افسانوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ افسانے فرضی سائنس کے مفروضوں پر مبنی ہیں مثلاً کسی کو آب حیات مل گیا ہے اور کوئی نظروں سے غائب ہونے کے راز سے واقف ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے فرضی سائنس کی کہانیاں محمود صاحب نے عوام کی تفریح طبع کے لئے لکھی ہیں اس لئے انہیں موجودہ معنی میں افسانے نہ سمجھا جائے بلکہ طلسم ہوشربا کی سی کہانیاں۔ جن لوگوں کو دلچسپی ہو اور جو دنیا کے کاروبار اور عقلی تیقن سے لمحہ بھر کے لئے آزادی حاصل کرکے ایک خیالی و فرضی دنیا میں پہونچ جانا چاہتے ہوں وہ ضرور پڑھیں۔ قیمت ذرا زیادہ ہے۔

(م۔ ح)

# جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۵ --- نمبر ۲ | بابتہ ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ آٹھ آنہ

## فہرست مضامین



(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

# مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

**مکتبہ جامعہ، نئی دہلی**

# اقبال

بروں زیں گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے | کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحرگاہے
پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند | جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے!

(اقبال)

(یہ غنائیہ، نظر اور خیال کا ایک سفر ہے جو کلام اقبال کی روشنی میں بارگاہِ تجلی تک کیا گیا ہے
اس میں میں نے اقبال کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام دکھانے کی کوشش کی ہے
اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کو دیکھنے اور دکھانے کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ میں نے ان میں سے وہی
پہلو لیا ہے جسے میں سب پر حاوی اور اہم سمجھ سکا۔ یہ غلط نہیں کہ فکر اقبال کی گہرائیوں تک پہونچنا
دشوار ہے۔ یہ شاید توفیق ازلی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائی تمثیل لکھنے
کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس "سعی دشوار پسند" پر رائے زنیاں ہوں گی لیکن اقدام اولین کی توقیر سے
سے قطع نظر، اگر اس میں ناظر کو شاعر مشرق کا پیام نظر آ جائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا)

# پہلا منظر

## میلادِ آسمانی

(جنت کے ایک رنگین ترین حصہ میں جہاں شاعروں کی روحیں اپنے بلند تخیل اور دلی تمناؤں کو پھولوں کی طرح کھلتا ہوا دیکھتی ہیں اور ان کی آزادی کے ساتھ آبیاری کر سکتی ہیں غالب کی روح ایک بلند مقام پر کھڑی ہوئی مسرور نظر آرہی ہے، اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

**روحِ غالب۔** نور ایوانِ تصور، مری بے پرواں نگہی | برقِ طوفانِ تجلی، میری پروانۂ خیال
آج آشفتہ ہوئے گیسوئے شبگونِ فراق | آج بیتاب ہوا شاہدِ رنگینِ وصال
قابلِ رشک ہے اندازِ جنوں کا انجام | ہو گیا جنتِ اسرار بیابانِ خیال
سجدہ ریزی میں ہے مصروف مری لوحِ جبیں | محوِ آئینہ فردا ہے مرا ذوقِ جمال

**ایک فرشتہ۔** ہمرو طائرِ سدرہ ترے ارمان بلند | رنگ بیتابیِ فطرت ترے دل کے احوال

**دوسرا فرشتہ۔** بحرِ فردا پہ مچلنے لگی تیری امید | بھر گیا بادۂ الفت سے ترا جامِ سفال

(جنت کے پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہاتھ میں لئے ہوئے روحِ حالی آتی ہے اور غالب کو پیش کرتی ہے)

**روحِ حالی۔** میرے اشکوں نے دیا تھا جسے اک رنگ نمو | اس گلستانِ تمنا میں بہار آئی ہے
خشک تھی وادیِ ناشادِ محبت کی زمیں | آج اس دشت پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے

ارمغاں یہ اسی گلزار کا لایا ہے غریب
آپ کے ہاتھ میں بیدار ہوں اس کے نصیب!

(سامنے سے گوئٹے کی روح ایک عجیب و غریب شیشہ سنبھالے ہوئے گذرتی ہے۔ اس میں چند حسین جلوے نظر آتے ہیں بعض انسان بعض پھول بعض پریاں بعض ستاروں اور چاند سے ملتی جلتی ہیں کبھی کبھی ایک عجیب و غریب شکل بھی اس میں سے جھانکتی ہے۔ چلتے ہوئے گوئٹے کی روح غالب کو دیکھ کر مسکراتی ہے)

**گوئٹے کی روح۔** جام افلاک میں رقصاں مری صہبائے نظر | فرشِ انجم پہ درخشاں مری مخلوقِ خیال
عشق نے توڑ دیا بندِ نقابِ ماضی | آج رنگیں نظر آتا ہے سراپردۂ حال

(ایسے میں حافظ اور عراقی کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے آتی ہیں گوئٹے کی روح ان کے لئے تھوڑا سر جھکاتی اور گذر جاتی ہے)

حافظ۔ دوشش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند ۔۔۔ گلِ آدم بہ سرشتند و بپیمانہ زدند

عراقی۔ نخستیں بادہ کاندر جام کردند ۔۔۔ زچشمِ مستِ ساقی وام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش ۔۔۔ عراقی را چرا بدنام کردند

(اس گلشن سے دور ایک چٹان پر رومی اور دانتے کی روحیں کھڑی ہوئی باتیں کر رہی ہیں ان کے ایوبی چہروں پر بھی خوشی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالب اور حالی یہ نظارہ دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں تھوڑی دور چلنے کے بعد انھیں ایک وسیع میدان ملتا ہے اور اس میں ایک بلند فصیل نظر آتی ہے۔ اس پر دو روحیں چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک شوپنہار اور دوسری حکیم نطشے کی ہے۔ دونوں کچھ تھکی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کے چہروں پر غیر معمولی شگفتگی ہے)

شوپنہار کی روح مستی عقل و ہوش سے گرمیٔ شش جہات ہے ۔۔۔ میرا جنون و بیخودی زینۂ کائنات ہے

وہم وجود ہے نقاب فطرتِ بے نیاز کا ۔۔۔ مرحلۂ حیات پھر مرحلۂ حیات ہے

نطشے کی روح گنگناتی ہے)

لذت وہم وگماں چھائی ہر غم خانوں میں ۔۔۔ گونج اٹھا نغمۂ غم میرے صنم خانوں میں

میری بیباکیٔ افکار نے ڈالے رخنے ۔۔۔ دہر کے خالق و مخلوق کے افسانوں میں

شکر ہے چھائے گا اک شاعر بیتاب کا رنگ ۔۔۔ زندگی آئے گی کچھ دہر کے ویرانوں میں

(غالب اور حالی کی روحیں ایک ایسے مقام پر پہونچتی ہیں جہاں سیکڑوں قسم کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں سارا باغ عالیشان ایوانوں سے مزین ہے۔ سامنے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں نظر آتی ہیں۔ اتنا سایہ دار مقام ہے کہ روح کو نیند سی آنے لگتی ہے چشموں میں بجلیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نور کے آبشار نگاہوں کے سامنے گرتے ہیں۔ باغ کی ایک زرنگار محراب سے پیرزادے کا تاج پہنے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہ اقبال کا ہاتھ تھامے ہوئے فرشتوں کے آگے چل رہے ہیں۔ پیچھے فرشتوں کا نغمہ رہتا ہے)

**فرشتوں کا نغمہ**

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور — خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں زشبستان ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

---

## دوسرا منظر

### کوہ ہمالہ

(کوہ ہمالہ کی سر بہ فلک چوٹیاں کہر اور بادلوں کا ایک پرشکوہ نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت عمیق وادیوں میں جھومتے ہیں۔ کہر، بادل، برف اور چنار اپنا اپنا حال دل بیان کرتے ہیں)

**کہر۔**
اس نیلگوں فضا میں سردی جمی ہوئی ہے — یا چتر آسماں کو جالا لگی ہوئی ہے!
اک وحی زندگی ہے رنگ نزول میرا — شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا

**بادل۔**
کتنا اجلا ہے مرا ذوق تجلی یارب! — ماہ و خورشید بناتے ہیں مجھے اپنی نقاب
ایک پیمان تسلی ہیں مرے اشک حزیں — ایک طوفان تماشا ہے مرا رنگ حجاب!

**برف۔**
دہشت ہے زندگی کی جوش زوال میرا — کہسار کی جبیں پر ہے انفعال میرا
تعمیر سے کسی کی گرتی ہوں آہ بن کر — دل وقت سنگدل کا ہے پائمال میرا

(زور کا طوفان آتا ہے۔ چنار کے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جلتے ہوئے درخت پکارتے ہیں)

**چنار کے درخت۔**
ہوا اور پانی سے ہم جل رہے ہیں — یہ رحمت کے اضداد میں پل رہے ہیں
فرشتہ اجل کا ہمارا دروں ہے — یہ جنگل ہے یا موت کا ارغنوں ہے
ہماری صداؤں کی آتش نوائی — کئے جا رہی ہے لگائی بجھائی!
محبت کی گرمی سے پامال ہیں ہم — خدا رکھے شاید جواں سال ہیں ہم!

(فطرت کی اس ہم نوائی کا ساتھ ہمالہ نہیں دیتا۔ سب حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ہمالہ جواب دیتا ہے)

**ہمالہ۔**
مری خاموشیوں میں میری فطرت کی نوازش ہے — بلندی فطرت خاموش کی اک آزمائش ہے

شنا اے ہمنوا! وا مجھ سے اپنی ہو نہیں سکتی
مری جاں اپنا گنج خامشی یوں کھو نہیں سکتی

گر جو طائر بام فلک اسباح انجم سے
بپا بحر ازل میں فکر کا جس کے تلاطم ہے

صدا اس کی سرور روح تصور جھوم جائے گی
نظر اک فطرت عالی کی نغمہ بن کے آئے گی!

(اس وقت ہمالہ کی خاموش اور بلند چوٹیوں پر فضائے آسمانی میں یہ نغمہ گونجتا ہے)

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر، دل سمجھتا ہے تری آواز کو! (بانگ درا)

---

## تیسرا منظر

### نغمۂ کائنات

(کرۂ ارض کی ایک پر سکون وادی۔ آبت آبت رگرتا ہوا آسمان پر ستارہ زہرہ جگمگا رہا ہے۔ اقبال کی روح اس میں کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان روح اور ہے۔ یہ دنیا میں کسی دن پیدا ہونے والے شاعر کی ہے اقبال اسے زمین کی طرف رخصت کر رہے ہیں۔ نوجوان روح اقبال کو سلام کر کے آگے بڑھتی ہے اور سطح ارض پر اتر آتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر روح ارضی یہ ترانہ گا رہی ہے)

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ[1]
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو جلوؤں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

---

[1] بانگ درا ص۳۱، بال جبریل ص۱۴۱

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے — پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

(شاعرِ مستقبل کی روح جب گذرتی ہے تو اقبال فلکِ زہرہ سے مسکراتے ہیں۔ اتنے میں عالمِ ناسوت ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے)

عالمِ ناسوت۔ مجھ پہ کھلا وہ عکسِ جاں آئینۂ حیات کا — میں بھی تو ایک شعر ہوں محفلِ کائنات کا
میرے یہ باغ و راغ ہیں حسنِ ازل کی داستاں — محفلِ نازِ دوست میں رنگ ہوں التفات کا

(روحِ اقبال عالمِ ناسوت سے کہتی ہے)

عالمِ[1] آب و خاک و باد، سرّ عیاں ہے تو کہ میں — وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک و خود نگر — کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

(اس کے اثر سے افلاک میں نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ چند آوازیں اس طرح آرہی ہیں)

ستارے۔ کسی کی شوخیٔ غم دل کی آہ بن کے رہی — کسی کی روح ہماری نگاہ بن کے رہی
ہمارے آگے بھی پہونچا خیالِ حسن پرست — شعاعِ منزلِ جاں خضرِ راہ بن کے رہی

چاند۔ لے رہا تھا میری بستی کا سکوں انگڑائیاں — سوزِ خاموشی میں جلتی تھیں مری تنہائیاں
میرے غاروں میں اداسی تھی عدم آباد کی — میرے کہساروں میں وحشت تھی دلِ برباد کی
کس نے روحِ آسماں کو اپنی منزل کر دیا — کس نے مجھ کو سینۂ آفاق کا دل کر دیا

خورشید۔ میری نگاہ دلگداز آگ کی بر تسگاں تھی — میری فضائے آتشیں ہیبتِ ذوالجلال تھی
خنجرِ برق آشنا میری تجلیوں میں تھا — دشنۂ خیظِ کبریا میری تسلیوں میں تھا
آتشِ دل بڑھا سی دی کس کی صدا نے درد لے — سوزشِ عشق بخش دی، کون فلک نورد نے؟

---

[1] بالِ جبریل ص ۵۴

فضائے آسمانی۔ کون کہتا ہے کہ طے کرتی ہو اک جست نگاہ — یہ طلسم برق و رنگ و نور کی جانسوز راہ

رضواں۔ مری نگاہِ محبت کا آشنا ہے کوئی — مجھے خیال عبادت سے دیکھتا ہے کوئی

فردوس۔ یہاں نہ روحوں میں تشنگی تھی — نہ ان کی بیتاب تھیں نگاہیں!

نہ کانپتی تھیں نظر سے اُن کی — عروس فطرت کی بارگاہیں!

یہ کون بولا مرے مکانوں — میں فکر و ذوقِ عمل نہیں ہے؟

یہ کون بولا کہ عشق انساں — کا دو جہاں میں بدل نہیں ہے؟

دو جہاں۔ شکر ہے ہم بھی آ گئے ایک نگاہ ناز میں — پردۂ چشم ہٹ گیا محفل امتیاز میں

وقت۔ کس نے دیکھی تھی مرے رنگ سیاست کی بہار — کس نے سمجھا تھا مرے دور حکومت کا خمار؟

کس نے ظلمت سے نکالا تھا شبستانوں کو — کس نے انجم سے اُجالا تھا گریبانوں کو؟

ساقی۔ محبت سو دل کو گرما گئی — وہ آواز تشنہ دہن آ گئی

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا

بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر

تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

ملائکہ۔ نغمۂ اللہ ہو کے پاسباں رہتے تھے ہم — بینوائے سوز دل تسبیح خواں رہتے تھے ہم

کس نے ہم کو آشنائے درد انساں کر دیا — کس نے ہم کو رازدار سوز ایماں کر دیا

جبریل۔ نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

سروش۔ لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

---

۱؎ بال جبریل کی اس نظم میں اشعار مختلف مقامات سے انتخاب کر کے جمع کئے گئے ہیں - انگریزی لفظ WHITEN کا ترجمہ

# چوتھا منظر

## مسجد قرطبہ

(روح اقبال مسجد قرطبہ میں ہے۔ ہسپانی آسمان کا چاند مسجد کے مینار سے کہتا ہے)

چاند۔ موج ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے — رنگ عالم مری منزل سے نکل کر دیکھے
کس قدر اوج پہ ہے قیس محبت کا جنوں — میری لیلیٰ مجھے محمل سے نکل کر دیکھے
لا الہ کی جو صدا مسجد و محراب میں ہے — ایک ایمان بھرے دل سے نکل کر دیکھے
عہد اسلام کے ماضی پہ تمنا بن کر — آہ غم سینۂ بسمل سے نکل کر دیکھے

مینار۔ نظر اٹھائی تو برباد تھا جہان عمل — میں سرفراز ہوا یا گنا ہگار ہوا
گیا نہ کھنچ کے دل تک مری نگاہ کا تیر — سمجھ رہا تھا کہ اس کے جگر کے پار ہوا
سنی تھی میں نے بڑی شان کی صدائے بلال — وہی نشہ مرے افکار کا خمار ہوا
نظر نہ آئے گا شاید کبھی زمانے میں — جو انقلاب کہ عالم پہ آشکار ہوا

مسجد قرطبہ۔ روح اسلام کبھی دہر سے ہو گی نہ فنا — ایک پُر درد کی سن اب بھی صدا آتی ہے

(روح اقبال عالم محویت میں)

کافر[1] ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق — دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے ذوق مری نے میں ہے — نغمۂ اللہ ہو، میری رگ و پے میں ہے
تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور — تیرا منار بلند، جلوہ گہ جبرئیل

(پھر اٹھ کر وادی الکبیر کی طرف جاتی ہے اور کہتی ہے)

آب[2] روان کبیر، تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

ایسے میں زندگی اقبال کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے وہ اس سے لانگ فیلو کی نظم "نغمۂ حیات"[3] سنانے کی

---

[1] بال جبریل ص۱۲۶ [2] بال جبریل ص۱۳۲ [3] بانگ درا ص۲۹۲

فرمائش کرتے ہیں۔ زندگی مسکراتی ہے اور چند خوبصورت لڑکوں کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کہتی ہے
لانگ فیلو کی نظم انھیں یاد نہیں رہی۔ ایک اور نظم سنئے)

## لڑکوں کی سنگت

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی میں تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

(”عہدِ مسلم“ سامنے آتا ہے اور کہتا ہے)

اے حکیمِ مرد و دل اور لطفِ خلیلِ سوزِ جاں — تیری چشمِ شوق پہ روشن زمین و آسماں
تیری فطرت رازدانِ شوکتِ اہلِ حجاز — تیری حکمت امتِ مرحوم کی آئینہ ساز
تیرے دل میں مرتعش نورِ محمدؐ کا چراغ — تیرے ہاتوں میں منورِ علم و عرفاں کا ایاغ
قومِ مسلم نیم جاں ہے ہیچ و بے انجام ہے — ان غریبوں کے لئے اب تیرا کیا پیغام ہے؟

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا[1] — میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری
میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو — میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری
دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی — غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

(عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں سے آمین کی صدائیں آتی ہیں۔ اور پھر چند شہر کہتے ہیں)

مکہ۔ یاں گرمیٔ طواف تو ہے سوزِ جاں نہیں — لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں
مدینہ۔ گم سیاست میں پیامِ مصطفیٰؐ — ہے دماغوں میں مقامِ مصطفیٰؐ

---

[1] بانگِ درا صفحہ ۲۸۴۔

درس اب دیتی نہیں اُم الکتاب
انقلاب اے دورِ ہستی انقلاب!

قسطنطنیہ۔ ماتم جورِ زمانہ میں سنا کرتا ہوں
پاکیٔ حسنِ عمل کی میں دعا کرتا ہوں

دستِ جمہوریت آزاد قیادت بیدار
اک نئی لذتِ ایماں میں جیا کرتا ہوں

بغداد۔ کاش کے سارے اہلِ دل کام لیں اعتماد سے
یاں کی زمین پاک ہے لذتِ اعتقاد سے

دمشق۔ اے وائے انقلاب سے اوندھی ہوئی ہوں میں
کن قدسیوں کے پاؤں کی روندی ہوئی ہوں میں

مصر۔ ہر چیز پہ چھایا ہے اب ذوقِ شہنشاہی
مذہب نے سکھائے تھے آدابِ خود آگاہی

ایران۔ عرب کی تہذیب سے ملا تھا عجم کی تعمیر کو سہارا
نہیں ہے اب دہر دو زباں کو یہ صلح و آشتی گوارا

شام۔ نغمۂ اغیار ہوں نغمۂ اغیار ہوں
کتنی دل افگار ہوں کتنی دل افگار ہوں

میری زمین پاک تھی میری جبیں پاک تھی
آج اُس عہد کی دل سے طلبگار ہوں

ایک سے بڑھ کر ہے ایک میرے لئے دشنۂ تیز
کفر کی آغوش میں تیری غدار ہوں

فلسطین۔ جورِ یہود و جورِ نصاریٰ کسے دکھاؤں
بہتا ہے خونِ مسلمِ ناداں کیا بتاؤں!

ہندوستان۔ الفاظ شوخ و شنگ کی تلوار چل گئی
قاسم کی روح میرے بدن سے نکل گئی

(روحِ اقبال ان آوازوں کو سن کر دعا کرتی ہے)

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

(نوجوان شاعرِ مستقبل کی روح پُراسرار طریقے سے مسجد کے ایک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے)

شاعرِ مستقبل۔ روحِ فردا سے بنا ہے دلِ نالاں میرا
وقت آتے ہوئے لائے گا گلستاں میرا

میری جاں روشنیٔ عشق پہ رقصاں ہوگی
حُسن بن جائے گا جس روز بیاباں میرا

دل مرے رہبرِ عالی پہ فدا ہوتا ہے
اس کے الہام میں پوشیدہ ہے ایماں میرا

روز بڑھتی ہی رہی تشنگیٔ ذوقِ صدا
ایسے نغموں سے ہوا درد کا درماں میرا!

شاعرِ مستقبل روانہ ہوتا ہے۔ روحِ ابلیس ایک زاہد کے لباس میں نمودار ہو کر راستہ میں حائل ہوتی اور کہتی ہے:

روحِ ابلیس۔ آ بتا دوں تجھ کو اپنے دل کی بات  فکر کی آزادیوں میں ہے نجات
دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اگر  ہیچ ہے یہ انتظامِ کائنات
غور سے خود پڑھ کلامِ اقبال کا  رائگاں ورنہ یہ صبح و شام ہے
کر خودی پیدا کہ مل جائے خدا  تیرے شاعر کا یہی پیغام ہے

(شاعرِ مستقبل ایک عالمِ فکر اور اندیشہ میں پڑ جاتا ہے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ روحِ ابلیس پرستارانِ اقبال کے ذوق و شوق کا جائزہ لینے جاتی ہے کئی جگہ آزمائش کے بعد خوشی خوشی واپس آتی ہے کہ اس کے وسوسوں کو ہنوز دھکا نہیں پہونچا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں وہ اطمینان کا سانس لیکر کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ شکر ہے علم نے کی میری تسلی ورنہ  میں بھری بزم میں بے چین ہوا جاتا تھا
شورِ ہستی کا بھلا ہو کہ مٹا یا اس کو  نعرۂ حق و یقیں مجھ سے سنا جاتا تھا!
میں نے دکھلائی زمانہ کو دغاؤں کی بہار  شاعرِ دل مری تعریف کئے جاتا تھا!

---

# چھٹا منظر

## بارگاہِ فطرت

(ایک دن بارگاہِ فطرت میں مظاہرِ حیات کی ایک مجلس گرم ہوتی ہے۔ ہوا، پھول، شبنم، صبح، نور، روحِ رقص، فوارہ، لالۂ صحرا، سمندر، موج، شمع، پروانہ، جگنو، ہر کوہسار، نسیمِ سحری، امید، وجود، نگاہ، جمال، جلال، جدت، تخلیق کے حسین پیکر سب جمع ہوتے ہیں۔ ہوا کی پری پاؤں میں شبنم کے گھنگرو باندھ کر رقص کرتی ہوئی آتی ہے اور یوں نغمہ سرا ہوتی ہے)

ہوا کی پری۔ چھنن چھنانن، چھنن چھنانن  چھنن چھنانن، چھنن چھنانن
سحر[1] مرا دل نظر مری جاں  اثر مرا غم خطر مری شاں

---

[1] یہ بحرِ موسیقی کی ایک خوبصورت لیکن مشکل تال "ہولی" یا "چاچر" پر قائم کی گئی ہے۔ بول ہیں۔ دھا دھِن دھا دھا تن تا تن دھا دھا دھِن اور تقطیع ہوگی۔ فَعَل فَعِلُن فَعَل فَعِلُن۔

## پانچواں منظر

### وسوسۂ شیطانی

(روح ابلیس عالم تنہائی میں بے قرار نظر آ رہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روح ابلیس۔ آہ تیرہ سو برس پہلے جو گونجی تھی صدا — کیا غضب ہے پھر وہی روحوں کو گرمانے لگی
گم گیا تھا جس کو میں نے خوابہائے زیست میں — پھر وہی تعبیر میرے سامنے آنے لگی
کروٹوں میں زندگی کی میں نے ٹالا تھا جسے — بے قراری پھر وہی آفاق پر چھانے لگی
کیوں ہوا محراب جاں میں نور کا روشن چراغ — ظلمت قلب و نظر کیوں دل سے شرمانے لگی
یا الٰہی کیوں مٹا جاتا ہے مغرب کا فسوں — روح مشرق کس لئے پھر ہوش میں آنے لگی؟
کیوں ہوا پیدا دیار ہند میں اک بے قرار — کس لئے روح غلاماں جھوم کر گانے لگی؟
نعرۂ جذب قلندر سے لرز جاتا ہوں میں — کیوں صدائے حق دلوں میں پھر جگہ پانے لگی؟
خیر اب بھی اک تسلی ہے کہ شاید اہل ہوش — سن کے آواز جرس ہوں گے بیاباں میں خموش
جا کے بزم زیست میں یہ راز دیکھوں تو سہی — عظمت شاعر کو دیوانوں سے پوچھوں تو سہی

(اتنے میں شاعر مستقبل کی روح ایک شفاف چشمہ کے کنارے کلام اقبال کا مطالعہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہہ رہی ہے)

شاعر مستقبل۔ کیسے نظر آئے گا اس کا مقام بلند — جو ہے ستاروں سے دور جو ہے تصور سے دور
عقل و خرد جس کے پر ذوق جنوں جس کی روح — بزم یقیں کے قریب چشم تحیر سے دور
چاہتا ہوں جاننا اس کے سخن کا پیام — نغمۂ ذات و صفات جس کی صداؤں میں ہو
چاہتا ہوں منکشف مجھ پہ ہو اس دل کا راز — تاب و تب کائنات جس کی اداؤں میں ہو

(اس وقت حضرت خضر سامنے آ کر شاعر مستقبل کو ایک صحیح رہبر کا پتہ نشان بتاتے ہیں جو ہنگامۂ ہستی سے دور ایک خانقاہ میں اقبال پہ خاموشی کے ساتھ فکر کر رہا ہے)

حضرت خضر۔ اے خوش خیال بزم محبت نہ فکر کر — جا اور اس کی محفل علم و ہنر کو ڈھونڈھ
ہر گام پہ خیال رہے راہ راست کا — ہو طالب پیام ازل یا بشر کو ڈھونڈھ

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

وفا کا فلک دعا کی زمیں — خضر ہے کہیں سفر ہے کہیں

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

وطن میں کبھی چمن میں کبھی — چمک میں نہاں گگن میں کبھی

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

فلک سے پرے زمیں پہ سفر — ملک سے ملوں خدا پہ نظر

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

چھنن چھنا نن، چھنن چھنا نن — چھنن چھنا نن چھنن چھنا نن

(ہنستے ہوئے پھول شبنم پری سے کہتے ہیں)

**پھول** شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا — اے قاصدِ افلاک نہیں دور نہیں ہے
ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن — یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

(صبح اٹھلاتی ہوئی آتی ہے)

**صبح۔** مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ — آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے
ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش ولیکن — ہاتوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

(اتنے میں آفتاب کی کرنیں نور برساتی ہوئی مسکراتی آتی ہیں)

**ایک کرن۔** مرے نزول میں جاں بخشیوں کی فیض و عطا — مرے خرام میں ارواحِ آسماں کا جمال
میں چھن رہی ہوں کہ فطرت میں ہو نمود مری — میں جل رہی ہوں کہ گردش میں آئے جامِ سفال

(اسے دیکھ کر شبنم پری گاتی ہوئی اڑ جاتی ہے۔ کرن کہتی ہے)

**کرن۔** دل آئینے کی طرح صاف ہے مغنی کا — نگاہِ صاف کو عالم میں کوئی باک نہیں
نوا کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(اتنے میں سمندر کی گونجتی ہوئی آواز آتی ہے)

سمندر۔ میں بھی ہوں[1] روحِ یزداں — مجھ میں ہے زورِ طوفاں
تاروں کا میں افسانہ — جلوؤں کا میں دیوانہ
عالم میں میری شوکت — ہستی میں میری عظمت
آئینہ نورِ جاں کا — گنجینہ میں ایماں کا
شورش ہے میرے دل میں — میں بھی ہوں آب و گل میں

(موج دریا لہریں مارتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے)

موج دریا[2]۔ میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے — جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(شمع نور کا تاج پہنے ہوئے آتی ہے اور کہتی ہے)

شمع۔ پوچھتا ہے مجھ سے یہ ایک شاعرِ رنگیں نوا — کس کی ممنون کرم ہے میری فطرت کی ضیا
از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی — کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی؟

(جگنو چمک کر کہتا ہے)

جگنو۔ کس طرح میرا جلوہ کوئی دکھا رہا ہے — آتی ہیں سن صدائیں فطرت کی انجمن میں
جگنو[3] کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک؛ درتال "جھومرا" پر ہے۔ بول ہیں۔ دھن دھن نا۔ دھاگے ترکٹ دھن نا   نن تن نا۔ دھاگے ترکٹ دھن نا۔ تقطیع ہوگی: مفعولن، مفعولات   مفعولن، مفعولات۔ [2] بانگ درا ص۹۵ [3] بانگ درا ص۸۳۔

(پروانہ آواز دیتا ہے)

پروانہ۔ پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو     کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو؟

(جگنو جواب دیتا ہے)

جگنو۔ اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں     دریوزہ گرِ آتش بیگانہ نہیں میں

(ایک آواز آتی ہے)

اے[1] کرمکِ شب تاب سراپائے تو نور است
پرواز تو یک سلسلۂ غیب و حضور است     آئین ظہور است
مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم
دیدیم تپیدیم نہ دیدیم تپیدیم     جائے نہ رسیدیم

(نگاہ کی پری مسکراتی ہوئی آتی ہے اور گنگناتی ہے)

نگاہ کی پری۔ بہار[2] و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی     شباب و مستی و ذوق و سرود و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی     یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں     طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں     کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

(روح اقبال اس روح پرور بارگاہ میں لب جو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی اپنا گیت گا رہی ہے۔ پہاڑوں سے آواز ٹکرا کے ساری فضا میں گونجتی ہے۔ پریاں حسین پیکر اور ساری مجلس رقص کرتی اور خوشیوں کی بانسریاں بجاتی ہے)

روح اقبال۔ میری[3] نوائے شوق سے شور حریم ذات میں     غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں     میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود     گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا     میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

---

[1] پیامِ مشرق۔ [2] ضربِ کلیم ص١٢١۔ [3] بال جبریل ص۵۔

(آواز سروش پر اسرار طریقے سے گونجتی ہے۔ روح اقبال اسے سن کر)

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مے لا الہ الا ہو
نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شور چنگ و رباب
سکوت کوہ و لب جوئے و لالۂ خودرو!

---

# ساتواں منظر

## خانقاہ

(شاعر مستقبل کی روح حضرت خضر کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے اور خاموش مفکر کی خانقاہ کی طرف جا رہی ہے راستے میں اسے کالج، فوجی تربیت گاہیں، سیاسی دفاتر، دار المباحث ملتے ہیں یہ ان کی طرف سے منہ پھیر کے گذر جاتی ہے۔

شہر کی سرحد پر پر فضا جنگل اور گنجان درختوں کی چھاؤں میں ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے۔ اس کے کنگرے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا روح شاعر کا استقبال کرتا ہے۔)

پرندہ۔ اے گلستان عشق کے راہی خوش آمدی
اے پیکر حسین نگاہی خوش آمدی

گلشن میں آمد آمد فصل بہار ہے
عالم تمام رحمت پروردگار ہے

ہنگامۂ حیات سے خاموش ہے فضا
مستیٔ جاں سے میکدہ بردوش ہو فضا

آشفتگی فکر و تماشا یہاں نہیں
اک نور منتظر ہے زمیں آسماں نہیں

ہر موجۂ نسیم میں ہیں خوشگواریاں
ہر پردۂ نگاہ میں ہیں یادگاریاں

پرواز میں طیور کے طوفان زندگی
ہر برگ گل کی چھاؤں گلستان زندگی

یاں عزم مطمئن ہے یہاں فکر پرسکوں
ہر جنبش خیال محبت کا ارغنوں

شہرت کی دھوپ سایہ مٹاتی نہیں کبھی
گرمی نشاط نگاہ کی چھاتی نہیں کبھی

خوش ہوں کہ تیری روح میں اک رنگ تلاش ہو
خوش ہوں کہ تجھ میں جرأت فکر و تلاش ہے

یاں آ کے اپنے دل کی تمنا مٹائے گا
خاموشیٔ حیات سے کچھ فیض پائے گا!

(شاعر کی روح پرندے کا یہ گیت سن کر محو ہو جاتی ہے پھر کہتی ہے)

**شاعرِ مستقبل۔** اے مطربِ خیال ابھی نغمہ سنائے جا — اس منزلِ سکوں کا ابھی گیت گائے جا

(طائر پھر نغمہ سرا ہوتا ہے)

**پرندہ۔** منزلگہِ سکون کی تمنا خدا گواہ — تسکینِ آرزو کا تقاضا خدا گواہ

اک زندگی ہے دولتِ کون و مکان ہے — اک جنتِ خیال ہے ہفت آسمان ہے

اس سرزمینِ پاک کے نزدیک آ کے دیکھ — یہ خاکِ بے نیاز جبیں سے لگا کے دیکھ

یاں کھڑکیاں ہیں جلوۂ حسن و جمال کی — چھن چھن کے گر رہی ہیں شعاعیں خیال کی

(یہ گا کر پرندہ اڑ جاتا ہے۔ شاعر کچھ سوچ کر خانقاہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں ایک درویش کتابوں کا انبار لگائے ہوئے کچھ لکھ رہا ہے روحِ شاعر اجازت مانگ کے یوں گویا ہوتی ہے)

**شاعرِ مستقبل** اے رہنمائے فکر و نظر، خضرِ بے نیاز — جس کی نگاہِ پاک پہ ظاہر دلوں کا راز

اک بے قرارِ زیست ہوں آشفتہ نگاہ — کرتا ہوں فکرِ شعر کا ہر سانس میں گناہ

اقبال کے کلام سے مجھ کو نیاز ہے — اقبال میری زیست، مرا فخر و ناز ہے

کرتا ہوں اس کے ساتھ تماشائے زندگی — پاتا ہوں اس میں اپنی تمنائے زندگی

لیکن بہت عمیق یہ بحرِ خیال ہے — مجھ سے بہت بلند یہ اوجِ کمال ہے

آتا نہیں ہے فہم میں اس زور کا کلام — سمجھائیے مجھے مرے اقبال کا پیام!

(درویش کچھ تبسم کر کے اور تھوڑی سی فکر کے ساتھ عینک کتاب پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال کے پیام سے پہلے انھیں ایک نصیحت کرنی ہے)

**مفکر درویش۔** سن پہلے کہ آتا ہے تجھے بزمِ جہاں میں — کر غور کہ تاثیر ہے کچھ تیری زباں میں

نزدیک ہے آزاد خیالی کا زمانہ — بن جائے گی یہ بزمِ جہاں غم کا فسانہ

تو ہو نہ کبھی بادہ کشِ محفلِ اغیار — برباد نہ کر دہر میں آزادئ افکار

آفت ہے دل و جاں کیلئے دہر کا جادو — اک آگ ہے ارماں کے لئے دہر کا جادو

عظمت کے تلاطم میں بہے جاتا ہے انساں — ہر بات پہ رائی ہی کہے جاتا ہے انساں

پھیلا ہے تیرے سامنے مستقبل خاموش — وا تیرے دل و جاں کیلئے وقت کی آغوش
ہوگا تیرے ہاتھوں میں زمانے کا تخیل — آئے گا ترے سامنے قوموں کا تجاہل
عظمت کی مے ناب سے بھر ساغر الہام — لے شاعر عالی سے دل پاک کا انعام
اس میں مگر آزادی فطرت نہ بہا دے — کونین کو اپنا کوئی پیغام سنا دے

**شاعر مستقبل۔** اپنی کمزوری تعظیم کو پہچان گیا — واہ کیا بات بتائی ہے کہ دل مان گیا

(مفکر درویش پھر کہتے ہیں)

اے نوجوانِ شوق ترے درد کے نثار — اقبال کے پیام کا اب کر نہ انتظار
کھول آنکھ اور دیکھ نگاہ نیاز سے — آتے ہیں کون کون حریم مجاز سے؟

(شاعر مستقبل دیکھتا ہے کہ چار خوبصورت پیکر جن کے چہروں پر آسمانی تجلیاں برس رہی ہیں زرنگار تاج پہنے ہوئے داہنے ہاتھوں میں تاروں کی شمعیں لئے اور اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے سے ملائے ہوئے رقص کناں آ رہے ہیں۔ ان پیکروں کے تاجوں پر سنہری حروف میں "عشق" "یقین" "خودی" اور "عمل" لکھا ہوا ہے۔ جلوس یہ ترانہ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

**عشق۔** ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
**خودی۔** قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
**یقیں۔** اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
**عمل۔** تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
**سب مل کر۔** اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں[1]

(درویش کہتے ہیں)

**مفکر درویش۔** اس گوشۂ تاریک میں ہم اہل نظر ہیں — اک مشعل رہ، روشنی راہ گذر ہیں
سمجھاتے نہیں آنکھوں دکھاتے ہیں مسائل — رہتے نہیں الفاظ و بیاں دید کے حائل
اقبال کے پیغام کے یہ چار عناصر — احساس پہ تیرے ہوئے اس شان سے ظاہر

---

[1] بال جبریل صفحہ

اللہ کرے دل ہو ترا ان کا پرستار　　اللہ کرے ان کا ہو نزدیک سے دیدار

(صدائے الہام آتی ہے)

عشق و خودی یقین و عمل چار عکس ہیں　　یہ ایک آئینہ ہیں تری جلوہ گاہ ہیں
ان چار موتیوں کو پرو ایک ہی جگہ　　اک رشتۂ خیال ہو تیری نگاہ میں

**شاعرِ مستقبل۔** قربان اس نگاہ کے جس نے بہ یک نگاہ　　اقبال کے پیام کو آنکھوں دکھا دیا
کوندائیں بجلیاں مرے وہم و گمان پر　　گویا مرے خیال کو عارف بنا دیا

(پھر یوں دعا کرتا ہے)

رواق فلک پر کھلی ہیں نگاہیں　　نظر آ رہی ہیں تری بارگاہیں
الٰہی مجھے ذوقِ فکر و عمل دے　　الٰہی مجھے قوتِ بال و پر دے
سرافراز ہے انقلابِ زمانہ　　تلاطم میں ہے زندگی کا فسانہ
ملے مجھ کو اس بزم میں راہ راہی　　تجلی سے پیدا ہو روشن نگاہی
میں جذباتِ عالم کو رستہ دکھاؤں　　نظر کی طرح ساری دنیا پہ چھاؤں
مرے دل پہ روشن ہو پیغامِ شاعر　　دل و جاں ہیں آسماں کے مسافر
ہو جوشِ محبت مری رہنمائی　　مرے دل پہ چھا جائے رنگِ خدائی!

---

(باقی آئندہ)

**عبدالقیوم خاں صاحب باقی**

# علامہ اقبال کا فلسفہ

(جوہر صاحب نے اس مضمون میں علامہ اقبال کے فلسفہ کو ان کی تقاریر سے اخذ کر کے اور ان کے کلام سے ان کی تشریح کر کے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ضمناً وہ ابہام بھی ظاہر کیا ہے جو دل اور عقل کے مقامات پیش کرنے میں علامہ کی تقریروں میں پیدا ہو گیا ہے "تن کی دنیا" اور "من کی دنیا" کی کشمکش کو بھی واضح کیا ہے۔ علامہ اقبال من کی دنیا کے قائل ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تمام صوفیا من کی دنیا کے قائل رہے ہیں لیکن علامہ تصوف کے خلاف ہیں کیونکہ یہ خودی کو فنا کی طرف لے جاتا ہے حقیقت کو منفی طور سے حاصل کرنے کی بجائے وہ مثبت طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی خودی کو طاقتور بنا کر لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ علامہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں لیکن عشق کا جذبہ اگر بغیر عقل کے ہو تو وہ فنا کی طرف لے جاتا ہے عشق کی انتہا خود کو دوسرے میں محسوس کرنا ہے لیکن اس انتہا تک پہنچنے کے یہ معنی ہیں کہ فرد اپنی خودی سے ہاتھ دھو بیٹھے اس طرح پر خودی اور عشق خود متضاد چیزیں ٹھہریں۔ خودی کی ترقی کیلئے عقل و عدل کی زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت عشق کے، کہتے ہیں کہ عشق کا جذبہ عمل کی طرف راغب کرتا ہے لیکن خود تعمیری اور خودی کو ترقی کرنے کا جذبہ بھی عمل اور تڑپ کی طرف مائل کرتا ہے عشق دوسروں کی تعمیر میں خود کو فنا کر دینے پر مائل کرتا ہے خود تعمیری کا جذبہ اپنی اور دوسروں دونوں کی تعمیر کی طرف راغب کرتا ہے بغیر خود کو فنا کئے۔ یہیں علامہ کے بیان میں ابہام پیدا ہو گیا ہے ایک طرف وہ صوفیوں کے عشق کو سراہتے ہیں دوسری طرف وہ خود تعمیری کے جذبہ کو اتنا ابھارتے ہیں کہ خود کو بھی خدا میں جذب کرنا نہیں چاہتے بلکہ یزداں گیری کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

عشق، دل، من کی دنیا، روح اور ضمیر کا کرب و اضطراب جب سکون پذیر ہوتا ہے تب کچھ اصول بنا لیتا ہے تاکہ من کی دنیا مطمئن رہے۔ غار حرا اور وحی کے نزول نے اسی "من کی دنیا" کی خاطر بنیادی اصول مقرر کر دئے تاکہ امت انسانی مزید کشمکش میں نہ پڑے اس لئے اب من کی دنیا کا ذکر کرنا ہی عبث ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اب اگر فکر کی جائے تو "تن کی دنیا" کی کیونکہ یہی ہماری زندگی ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی اسلامی اصولوں کی۔ من کی دنیا یا عشق یا تصوف میں پڑنا ایک سعی لا حاصل ہے۔

چنانچہ اس مضمون میں انھیں باتوں کی طرف جوہر صاحب نے اشارہ کیا ہے اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کچھ اور لکھنا چاہیں تو شکریہ کے ساتھ ہم اسے قبول کریں گے) (مدیر)

اختر۔ آداب عرض یوسف صاحب! کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟

یوسف۔ آئیے اختر صاحب! علامہ اقبال کے لکچر کتابی شکل میں نکل آئے ہیں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

اختر۔ خوب کیا کچھ ادق کتاب ہے۔ پہلا باب کس موضوع پر ہے۔

یوسف۔ وہی موضوع جس سے مرحوم کی شاعری پُر ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے　　　خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　　چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　　چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اختر۔ جی ہاں۔ یہ امام غزالی کا فلسفہ ہے۔ ضرب کلیم میں علامہ نے امام صاحب کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن　　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن　　　عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

یوسف۔ پہلے لکچر کا موضوع بھی یہی ہے کہ کیا حقیقت کو صرف عقل سے سمجھ سکتے ہیں؟ علامہ کا خیال ہے کہ خدا یعنی حقیقت کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کا صرف تجربہ کر سکتے ہیں اور وہ تجربہ بھی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے وجدان یعنی عشق یا نظر کی ضرورت ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات　　　علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات　　　علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

علامہ کے نزدیک خرد سے تو حقیقت کو جزوی طور پر سمجھا جاتا ہے لیکن دل یا عشق یا نظر سے کُل حقیقت کا مجموعی طور پر احساس یا تجربہ کیا جاتا ہے۔ خرد حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناکمل ہے لکھتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　　اُس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ کے نزدیک خرد و نظر ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و مددگار ہیں۔ علامہ برگساں کے اس خیال سے متفق ہیں کہ عشق یا نظر یعنی وجدان بھی اعلیٰ قسم کی خرد ہوتی ہے۔

اختر۔ میں کچھ سمجھا نہیں یوسف صاحب!

یوسف۔ آپ کیا نہیں سمجھے۔ برادر یہ وہی خیال ہے جس کا علامہ بار بار اظہار کرتے ہیں۔ بال جبریل میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں　　راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

اختر۔ یوسف صاحب! میں خرد اور نظر کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں اگر خرد اور نظر میں وہی فرق ہے جو عقل اور تیز عقل میں ہوتا ہے تو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ حقیقت زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ اس شکل میں حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نئی شے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے جس کو علامہ نے کبھی دل کبھی عشق کبھی نظر کہا ہے۔ نہ صرف یہی کہ علامہ عشق و نظر کے قائل ہیں بلکہ عقل کو باغی اور کم مایہ خیال کرتے ہیں کبھی فرماتے ہیں ؎

سبو و تازہ برانگیزم از ولایت عشق　　کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

کبھی فرماتے ہیں ؎

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور　　ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

جیسا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے علامہ کے نزدیک نظر اور خرد کی نوعیت میں فرق ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نظر کو تیز عقل کہنا غلطی ہوگی۔

یوسف۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نظر سے حقیقت کے اس پہلو کا شعور ہوتا ہے جس کو خرد سے نہیں سمجھ سکتے۔ علامہ کے نزدیک دل بھی مشاہدہ کرتا ہے اور اگر اس مشاہدہ کی درست ترجمانی کے بعد عمل کیا جائے تو انسان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کی سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے مشاہدات اسی طرح حقیقی تجربہ ہوتے ہیں جس طرح خرد کے تجربات۔ البتہ دل کے مشاہدات کو تحلیل کر کے نہیں بتا سکتے ؎

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ　　معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اختر۔ کیا علامہ کا یہ خیال ہے کہ تجربہ دو طرح ہوتا ہے ایک دل سے اور دوسرا دماغ سے اور یہ دل ہی ہے جو بیک وقت کل حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے؟

یوسف۔ علامہ کا یہ خیال ہے کہ دل کی نظر سے حقیقت کو دیکھنے اور تجربہ کرنے سے انسان کو وہ الہامات ہوتے ہیں جن سے خرد بے بہرہ ہے۔ آپ خرد کے ذریعہ سے مجموعی حقیقت کا دیدار نہیں کر سکتے لیکن دل بسا اوقات دہوکا کھا بھی جاتا ہے اور غیر حقیقت کو حقیقت اور غیر حقیقت کے پیغام کو حقیقت کا پیغام یعنی وحی والہام سمجھنے لگتا ہے ہاں بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل حقیقت کے پیغام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے غلط راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دماغ صرف جزوی حقیقت معلوم کر سکتا ہے اور جزوی اور مجموعی حقیقت میں وہی فرق ہے جو باجے کے ایک سر اور ایک راگ میں ہوتا ہے۔ راگ اگرچہ سروں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن وہ اثر اور نوعیت میں کسی ایک سر سے مختلف ہوتا ہے بعینہٖ مجموعی حقیقت جزوی حقیقت سے اثر اور نوعیت میں جدا ہوتی ہے

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام بھی      نقش گر ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اختر۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ درست علم حاصل کرنے کے لئے عشق پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

یوسف۔ جی ہاں۔ علامہ نے یہ لکھا ہے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے لئے بھی شیطان کی پیش کردہ حقیقت اور پیغام اور اصل حقیقت اور پیغام میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ علامہ نے اس خیال کی تائید میں کلام مجید کی ایک آیت بھی پیش کی ہے۔

ترجمہ "تم سے قبل بھی ہم نے رسول اور پیغمبر بھیجے جن کی خواہشات میں شیطان نے غلط خواہش داخل کر دی لیکن خدا شیطان کے چاہنے کو پورا نہیں ہونے دے گا"

بال جبریل میں سالک راہ کو اس طرح خبردار کرتے ہیں ؎

دل ہے غلام خرد یا کہ امام خرد      سالک راہ ہوشیار سخت ہے یہ مرحلہ

اختر۔ تب تو یوسف صاحب اول بنیا بھی خرد چالاک کی طرح ہو گیا غلطی کا امکان دونوں جگہ ہے خرد بھی غلطی کر سکتی ہے اور نظر بھی۔

یوسف۔ نظر بھی غلطی کر سکتی ہے لیکن خرد تو صرف جزوی حقیقت دیکھ سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اختر۔ لیکن یوسف صاحب یہ تو فرمائیے کہ جب آپ نے دل کا غلطی کرنا تسلیم کر لیا تو یہ معلوم کرنے کا کیا معیار رہا کہ دل کا فلاں مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا یا غیر حقیقت کا۔ پھر علامہ ایک اور بات بھی فرماتے ہیں کہ بعض دل مشاہدات کی درست ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اس شکل میں یہ کس طرح فیصلہ ہوگا کہ دل مشاہدہ کی درست ترجمانی کر رہا ہے یا غلط۔

یوسف۔ اختر صاحب علامہ نے وہ معیار بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا لکچر ان معیاروں کی بات ہے۔ علامہ نے دو معیار مقرر کئے ہیں۔ ایک عقلی دوسرا افادی۔ عقلی معیار سے یہ مراد ہے کہ حقیقت وہ ہے جس کی نوعیت کو عقل قبول کر لے۔ افادی معیار یہ ہے کہ انھیں پیغامات کو حقیقی سمجھا جانا چاہئے جن پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے بر آمد ہوں۔

اختر۔ یوسف صاحب! علامہ نے یہ معیار قائم کر کے اپنے 'دل بینا' کے نظریہ کی تردید کر دی۔ علامہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے نہ مجموعی حقیقت کا شعور کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغامات سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے چاری عقل پر حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز کرنے کا بار ڈالتے ہیں اگر علامہ کے نزدیک عقل میں یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقت اور اس کے پیغامات اور غیر حقیقت اور اس کے پیغامات میں تمیز کر سکے اور ان کو جانچ سکے تو گویا علامہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل چالاک دل بینا سے کہیں زیادہ بیدار ہے کہ وہ دل کی محسوس کردہ حقیقت اور پیغام کو پرکھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افادی معیار بھی عقلی معیار ہے عقل تو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ حقیقت کے کسی خاص پیغام پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے نکل رہے ہیں یا برے۔

یوسف۔ اختر صاحب آپ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نظر یا دل بھی غلطی کر سکتا ہے تو دل کو دماغ سے الگ علم حاصل کرنے کا ذریعہ مان لینے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

اختر۔ یوسف صاحب میرے خیال میں عقل میں ہر حقیقت سمجھنے کی اہلیت ہے۔ صرف فکر و جستجو درکار ہے۔

حقیقت کے جن پہلوؤں کو ہم فی الحال نہ سمجھ سکیں ان کی طرف ہمارا غیر جانبدارانہ رویہ ہونا چاہئے نہ ان کا انکار اور نہ اقرار کرنا چاہئے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ چونکہ کاملین کے بہت سے بنیادی تخیلات عقل میں نہیں آتے لیکن ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان مفکرین کو جنھوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی تخیلات کو درست ثابت کرنے کے لئے عقل کو معذور اور دل کو روشن بتائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہدیں کہ دل جو علم حاصل کرتا ہے وہ عقل کے احاطے میں نہیں آسکتا۔ علامہ پہلے تو فرماتے ہیں کہ دل ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے عقل انسانی مجموعی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ دل حقیقت کا تجربہ تو کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ اس کو متاشبہ لگ جاتا ہے اور وہ غیر حقیقت کو حقیقت تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں عقل اس کی مدد کرتی ہے اور تجربہ کی صحت اور غیر صحت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب عقل دل کے تجربات کے حقیقی و غیر حقیقی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے تو وہ خود اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔

یوسف صاحب اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو یہ عرض کردوں کہ دل بینا کے فلسفہ نے دنیا کو عام طور پر اور ایشیا کو خاص طور پر جتنا نقصان پہونچایا ہے شاید ہی کسی دوسرے فلسفہ نے پہونچایا ہو۔ دل کو عقل پر ترجیح دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق نے عقل کو معطل قرار دے دیا جس کی وجہ سے فکری اضمحلال پیدا ہو گیا اور بجائے زندگی میں جدوجہد کرنے اور عقل سے کام لے کر قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے اور ان کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کے ایشیا والے مراقبہ، تصوف اور علم باطن کے پیچھے پڑ گئے جس کے نتائج ہماری غلامی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

**یوسف**۔ لیکن اختر صاحب علامہ کے فلسفہ میں عقل کے لئے بھی کافی میدان ہے عقلی جدوجہد کو کسی نے منع نہیں کیا بلکہ اس سے بھی جزوی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ جس قسم کے تصوف کے آپ خلاف ہیں علامہ بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ علامہ کے نزدیک وہ مراقبہ۔ تصوف اور علم باطن باطل ہے جس سے عمل پیدا نہ ہو۔ شاعر مشرق کے نزدیک مراقبہ وغیرہ سے انسان میں جرأت عمل پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ریاضت بیکار ہے۔ اختر صاحب جہاں تک میں سمجھا ہوں علامہ نے خرد و عشق میں تمیز صرف اس بنا پر

کی ہے کہ خرد انسان کو عمل پر مجبور نہیں کرتی۔ اکثر صاحب کے دماغ بے عمل ہوتے ہیں یہ عشق کا کام ہے کہ وہ انسان کو عمل پر مجبور کرتا ہے

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

علامہ ضرب کلیم میں تصوف کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کے درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی اقبال کی اصطلاح میں انفرادیت کا نام ہے جو انسان کے اپنے ماحول پر عمل کرنے سے مستحکم ہوتی ہے۔ توحید کے عنوان سے علامہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے ؛ فقط اک مسئلہ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلا نہ فقیہ — وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

خرد اگر عمل بھی پیدا کرتی ہے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف خرد کے تابع ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر عشق کے تابع ہو کر عمل کیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتیجے برآمد ہوں۔ خرد کو عشق کے تابع رکھ کر عمل کرنا چاہیے۔

اختر۔ حسن اتفاق سے ایسی دنیا میں یورپ اور امریکہ موجود ہیں جہاں کے انسان بلا "دل و عشق" کی مدد کے صاحب عمل ہیں۔ دل نہیں بلکہ خرد ان کے تمام تر عمل کی محرک ہے۔ ان کی خرد نے آپ کی دل کی دنیا کی تحلیل کر کے رکھ دی۔ اس حقیقت کے سامنے آپ کا دل کا فلسفہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ دل بینا کا فلسفہ اپاہجی کا فلسفہ ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ جب یہ ان لیا کہ کل حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا طریقہ عقل سے جدا ہے اور انسان کا مقصد حیات حقیقت کا مجموعی دیدار ہے جس سے زندہ و پائندہ علم حاصل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کل حقیقت کا دیدار اور زندہ و پائندہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور حقیقت کا دیدار ایک دو روز کے مراقبہ سے تو ہو نہیں سکتا اس کے لئے عمر درکار ہے

جس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان تمام عمر ریاضت اور مراقبے میں گزار دے۔ یوسف صاحب! ایشیا کی غلامی اسی عشق و نظر کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ یورپ کی زندگی اور ترقی سے متاثر ہو کر اقبال اس پر تو مجبور ہو گئے کہ ذوقِ کردار کا پیام دیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے عشق و نظر کا نظریہ پیش کر کے ایسا کیا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ کر اس کو عمل کی تلقین کی جائے۔ مسلمانوں میں عشق و نظر کا افیونی فلسفہ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ اب ان کو افیونی فلسفہ کی خوشبو بھی پینک میں لانے کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ ہی کی ہستی تھی کہ جس نے وقتی تقاضہ کو سمجھا اور اردو شاعری کو نیا رنگ دیا اور گل و بلبل اور خط و خال سے ہٹ کر عمل کا پیام دیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ نے دل کی دنیا کا راگ الاپ کر اپنے پیام کو کالعدم کر دیا۔

**یوسف**۔ اختر صاحب یہ تو آپ درست فرماتے ہیں کہ باطن کی کشاد اور مراقبے کے ذریعہ سے حقیقت کی جستجو کی آڑ لے کر ایشیا اپاہج بن گیا۔ مشرق من کی دنیا میں پھنس گیا اور تن کی دنیا سے اتنا بے نیاز ہوا کہ ایک عرصہ سے یورپ کا غلام ہے لیکن اختر صاحب جیسا میں عرض کر چکا ہوں علامہ اس قسم کے تصوف سے بہت بیزار ہیں اور اس کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں:۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

**اختر**۔ یوسف صاحب یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ میں کردار پر از حد زور دیا گیا ہے لیکن علامہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ خرد کے علاوہ عشق و نظر کو مانتے ہیں اور ان کو جوشِ کردار پیدا کرنے کا سبب بتاتے ہیں۔ عشق و نظر کے فلسفہ پر کسی تمدن کی بنیاد رکھ کر افراد کو کردار کا پیام دینا ایسا ہے جیسے پیاسے آدمی کا گلا دبا کر اس کو پانی پلانے کی کوشش کرنا۔ یورپ اس فلسفہ کی مجسم تردید ہے یوسف صاحب میں تو ایشیا کے زوال کا یہی سبب سمجھتا ہوں کہ ایشیا والوں نے فکر و جستجو سے کنارہ کر لیا اور عقل سے بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو معجزات کے سمندر میں ڈال دیا جہاں توہمات کی مچھلیوں نے

انھیں ہڑپ کرلیا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کو صاحب جذب وسوز ومستی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صاحب عقل کی ہے جو جستجو وتجربہ سے کام لے کر حقیقت کو پہچانے۔ علامہ اگرچہ دنیا کو پیام عمل دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تلقین بھی جاری ہے۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز ومستی جذب وشوق　　تن کی دنیا تن کی دنیا سود وسودا مکر وفن

من کی دولت ہاتھ جب آتی ہے تو جاتی نہیں　　تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

ایشیا والوں کی ساری عمر من کی دولت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اور تن کی دولت اغیار کے حصہ میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تن کی دنیا میں آلودہ رہنے والے من کی دنیا میں غرق رہنے والوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یوسف صاحب آپ کو یہ تو علم ہوگا کہ علامہ رہبانیت اور خانقاہی کے بہت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر　　یہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

علامہ ہر بات میں کچھ مذبذب معلوم ہوتے ہیں

**یوسف۔** اختر صاحب۔ دراصل ایشیا والوں کی تباہی اس لئے ہوئی کہ مولانا روم نے من کی دنیا میں رہنے والوں اور دل بینا کے دعویداروں کے لئے جو کسوٹی بتائی تھی جس کے علامہ بھی قائل ہیں۔ اس کسوٹی کو ہم نے فراموش کر دیا ہے

**اختر۔** وہ کسوٹی کیا ہے؟

**یوسف۔** آں کہ برافلاک رفتارش بود　　بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مولانا فرماتے ہیں کہ جو افلاک پر چل سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے جب ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں شخص واقعی بزرگ یعنی حقیقت آشنا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ باطن کی تلاش کا اسی کو حق ہے جو ظاہر کو اپنے تابع کر چکا ہو۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے　　بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

ایشیا میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب دنیا کے طمانچے نہ سہہ سکے تو تارک الدنیا ہو کر مراقبہ کرنے لگے۔ جو تن کی دنیا پر قابو نہ پا سکا وہ من کی دنیا میں کیا کر سکتا ہے۔ مجھے علامہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور　　کہ معرکے ہیں شریعت کے دست بدست

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی　　اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اختر۔ خیر آپ نے یہ تو مانا کہ پہلی حقیقت تن کی دنیا ہے اور من کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے مادی دنیا کو مسخر کرنا ضروری ہے معاف کیجئے گا میں من کی دنیا کے فلسفہ ہی کو ایشیا کی تباہ حالی کا باعث خیال کرتا ہوں یورپ والے بلا جذب و شوق و عشق و مستی اور من کی دنیا کے پیچھے پڑے ہر اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہیں۔

یوسف۔ اختر صاحب یورپ میں جو کشت و خون ہو رہا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یورپ کی نظر صرف تن کی دنیا تک محدود ہے

شرق حق را دید عالم را نہ دید　　غرب در عالم خزید از حق رمید

چشم بر حق باز کردن بندگی است　　خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اختر۔ یوسف صاحب یورپ کی نظر تن کی دنیا تک محدود سہی لیکن وہ ایشیا سے تو بہتر ہے جس کی نظر خلا میں دیکھتی ہے۔ مشرق کو ترقی کرنے کے لئے دونوں دنیائیں فتح کرنی ہوں گی لیکن یورپ نے تن کی دنیا فتح کر لی ہے اور علم نفسیات کے ذریعہ سے من کی دنیا بھی قریب نصف کے فتح کر لی ہے رہا یورپ کا کشت و خون تو وہ تباہی نہیں ہے

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے　　جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جس طرح بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کو درد و کرب برداشت کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب "جہان کہن" کے بطن سے "جہان نو" پیدا ہوتا ہے تو تمام دنیا میں تشنج پیدا ہوتا ہے یہ جنگ وہی تشنج ہے جس کو آپ تباہی و بربادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یوسف۔ عصر حاضر را خرد زنجیر پاست　　جان بے تابے کہ من دارم کجاست

اختر۔ مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں انھیں　　پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انھیں

م۔م۔ جوہر صاحب میرٹھی

# جدید تعلیمی نظریہ

**تعلیم کی تعریف** | تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کے بالغ ممبروں کی سعی اور جد وجہد ہے جس سے آنے والی نسلوں کی نشوونما اور تشکیل، زندگی کے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سچ ہے کہ اکثر تعلیم کا لفظ اس سے وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جان اسٹوارٹ مل نے تعلیم کے دائرہ میں ان تمام چیزوں کو شامل کرلیا ہے جو "نوع انسانی کے تعمیر میں ممد و معاون ہوتی ہیں"۔ اور شاعرانہ حیثیت سے ہم تمام بنی نوع انسان کی تعلیم بھی مراد لیتے ہیں لیکن یہ تمام استعمالات خطیبانہ ہیں جو عامیانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں ذاتی ہدایت اور تربیت ایک ضروری عنصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی اسکیمیں تمامتر پڑھے لکھے لوگوں کے تجربات سے بنائی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام تجربات (بچے کے لئے) سبق آموز ہوتے ہیں۔ آیا ایک تجربہ ایک فرد (یعنی بچہ) کی تعلیم کا جزو ہے یا نہیں؛ اس کا جواب اس وقت دیا جا سکتا ہے جب ہم یہ معلوم کرلیں کہ تعلیم کا طریقہ ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کی آغوش تربیت میں پلا تھا اور وہ اسی کا تجربہ تھا۔ اگر وہ بچہ کا تجربہ تھا تو تعلیم کا جزو ہوگا ورنہ نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم خواہ اچھی ہو یا بری، اس کی اچھائی یا برائی کا انحصار معلم کی حسن سیرت، دانائی اور ذکاوت پر ہوگا۔ وہ اچھی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس سے صحیح نتیجہ نکلے اور اس کیلئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر موزوں و مناسب ہوں کہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکے۔ نیز وہ عقلمندی، یک رنگی اور ثابت قدمی سے کام میں لائے جاسکیں۔

یوں تعلیم معین طور پر ایک انفرادی فعل ہے اور ہر سوسائٹی میں اس کی وسیع تاثیر اور وقعت کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ تمام زمانوں اور تمام مقامات میں ان لوگوں کی فضیلت، دانائی اور صلاحیت کے متعلق اختلافات ہیں جن کے ہاتھوں میں بچوں کی ذمہ داری اور نشوونما ہے۔ تاہم باوجود ان اختلافات کے ہر معلم اپنے عہد اور ملک کے رائج تصور اور نظریہ کو کم و بیش مکمل اور واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس بنا پر کامیاب تعلیمی جد وجہد کیلئے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کو بہ حیثیت مجموعی تعلیم کی فطرت اور قیمت کا بخوبی اندازہ کرنا چاہئے۔

بہرکیف اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک بیدار اور حساس قوم میں معلمین کا جو قوم کی حاجتوں کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں یہ طے کرنا بہت ہی عام اصطلاحات کے سوا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دیں کیونکہ جب ہم ان افراد پر نظر ڈالتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو افلاطون سے متفق ہونا چاہیئے کہ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے جسم و روح میں ان تمام خوبیوں اور کمالات کی نشوونما ہو جن کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ اس سے ان خوبیوں اور کمالات کی فطرت سامنے نہیں آتی اور ان نقطہ ہائے نظر پر کبھی عالمگیر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ ہر عہد میں اندازے کے بیّن اختلاف رہے ہیں۔ انفرادی حسن و کمال کا مظہر حقیقی زندگی اور صرف حقیقی زندگی ہے۔ اور ایسی زندگی زمان و مکان، تہذیب و تمدن، قومی جذبات اور مادی حالات پر دسترس کے معین حالات میں بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے افلاطونی عہد کے ایتھنز کا کمال زندگی، موجودہ لندن، پیرس اور نیویارک سے بہت مختلف تھا۔ لہذا جہاں تک کوئی تصور تعلیم عملی طریقے کی رہبری کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرہ کی حالت ترقی اور تعلیم میں ہر لحاظ سے تعلق ہو جس میں وہ دی جاتی ہے۔

<u>تعلیم اور قوم</u> | ایک لحاظ سے قوم کے آئین اور عام نظریہ کا اس کی تعلیمی سیرت پر خاص اثر ہوتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے تحفظ و تکمیل میں سرگرم رہے لیکن وہ زندگی انفرادی ممبروں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ایک مثالی قوم میں انفرادی اور اجتماعی اغراض و مقاصد کی مماثلت ہونی چاہیئے لیکن تاریخ مثالی اقوام کے وجود پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی اور اس کے حالات کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہیں۔ عملاً اختلافات کا دور دورہ ہمیشہ رہا ہے جس کا نتیجہ کہیں جالب منفعت اور کہیں انسداد ترقی ہوا ہے۔ مختلف زمان و مکان میں معاشروں کا باہم اختلاف رہا ہے۔ ہر ایک کی دلچسپیوں اور انفرادی ترقی کے دعووں میں مصالحت یا موخر کو مقدم کا تابع بنانے میں سوسائٹیوں کی رغبت بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہے، اور ان کے تعلیمی تصورات میں اختلافات کی جھلک فطرتاً نمایاں ہوتی ہے۔ اقوام کا ابتدائی رجحان افراد کی شخصیت کو مکمل طور سے تابع بنانا ہے لیکن مغربی قبائل میں عیسائیت کی آمد کے وقت سے، انفرادی زندگی کی اہمیت بڑھ جانے کے سبب اس رجحان کو روکا گیا اور لطیف بنا کر منعطف کیا گیا۔ ذہنی طور پر متناقض لیکن واضح واقعہ ہے کہ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) نے اپنی بہت وسیع صنف کے حیرت انگیز کھلم کھلا مظاہرے سے گھر سے، قرب بنے اور جدید اجتماعی تنظیم کے وسیع الجہاد

نے واقعتاً قدیم رجحان کے خلاف ردعمل پیدا کیا۔ اور تعلیمی خیالات میں اس کو ظاہر کیا۔ تعلیمی نظریہ کو ہمیشہ کم و بیش مرکزیت طفل پر مبنی ہونا چاہئے یعنی پہلے ایک ہی بچہ پر ساری توجہ منعطف کرنی چاہئے اور ان فطری صلاحیتوں اور خلقی قوتوں کو جو اس کو تعلیم یافتہ بناتی ہیں مرکز توجہ بنانا چاہئے۔ لیکن موجودہ میلان اس سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اس کی رو سے فرد کی تکمیل تعلیمی جدوجہد کی علت غائی ہے۔ اس میں اجتماعی مطالبات سے بے پروائی شامل نہیں ہے اور نہ اس سے معاشرتی انتشار ہی مراد ہے بلکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ قومی زندگی کی بہترین تشکیل ایسی تعلیم سے ہوگی جس میں معاشرتی سرگرمیوں کو انفرادی زندگی کے اعلیٰ درجوں تک ترقی کرنے کا ایک ضروری واسطہ خیال کیا جائے۔ یہ بہتر ہے اس چیز کی بہ نسبت جس کے ماتحت انفرادی نشو و نما کے مطالبات کو قرار دیا جائے۔ یہ تصور کم و بیش صاف طور پر محسوس ہوکر امریکہ، برطانیہ اور دیگر متمدن ممالک میں نشو و نما کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا رہا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے اس کی روشنی میں متمدن قوموں نے عملی ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔

نظریہ کے تغیر کی حیرت انگیز علامت ترقی کرنے والے ملکوں میں جمہوری تعلیم کی ازسرنو تشکیل تک منتج ہوتی ہے۔ اس کی امتیازی صفت قدیم تصور کو مٹاکر جدید کو لانا ہے جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس، اہم معاشرتی طبقات سے مطابقت رکھیں۔ اس خیال سے ہر طبقے کے بچے ایسی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع پائیں جس میں طفلانہ ضروریات بہم پہونچانے کا سامان موجود ہو۔ نیز اس میں ثانوی تعلیم عنفوان شباب کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ابتدائی تعلیم کی عمارت اسی ستون پر قائم ہے۔ اس لئے وہاں جونیر اور سینیر ہائی اسکول موجود ہیں جو ۱ تین تین اصول پر قائم ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء میں تعلیمی بورڈ کی کمیٹی نے عنفوان شباب کی تعلیمی رپورٹ اسی اصول پر شائع کی ہے۔ جرمن ریخ بھی ان تعلیمی تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک حد تک یہ ترقیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ جدید صنعت و حرفت اور آئین حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اوسط درجہ کے شہری کا قدیم شہریوں سے زیادہ بلند معیارِ علم و تربیت ہونا چاہئے لیکن اس کی اصولی تشریح اس تصور میں موجود ہے۔

---

۱ امریکہ میں قدیم آٹھ سالہ نصاب تعلیم ختم کردیا گیا ہے اور اب اس کے بجائے چھ سال کا ایک جدید نصاب تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے تین سال تک جونیر ہائی اسکول کورس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں بچوں کے حیاتیاتی، نفسیاتی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور تین سال کا سینیر ہائی اسکول کورس عنفوان شباب کیلئے مرتب کیا گیا ہے جس میں ان کی نفسیاتی ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے

کہ ایک قوم کا فرض ہے کہ وہ ذاتی ترقی اور خود فہمی کے بہترین مواقع تمام افراد کی دسترس میں دیدے جو اُن سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

نصاب | ان اعتبارات سے نصاب تک خیال کا پہونچنا فطری بات ہے۔ بچوں اور بچیوں کو کیا پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح جواب اُس اصول میں ہے جو مقصد تعلیم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسکول کا یہ کام ہے کہ وہ ترقی تکملہ اور خاندانی زندگی کے اثرات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بچوں پر ان روحانی قوتوں کا اثر ڈالے جو اس قوم یا جماعت کی خصوصیات میں سے ہو اور ان کو اس لئے تیار کرے کہ وہ قوم کی زندگی کی محافظت اور ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس کام کے انجام دینے میں اسکول کے لئے ضروری ہے کہ وہ (۱) حقیقی معاشرہ ہو جس میں قومی سیرت کے بہترین نصب العین موجود ہوں اور اس لئے اس قابل ہو کہ بچوں کے رگ وریشہ میں وہی خصلتیں اور سیرتیں منتقل ہو کر مستحکم ہو جائیں۔ انگلستان کے نام نہاد پبلک اسکولوں کی شہرت کا دارومدار انھیں اصول کو کامیابی کے ساتھ چلانے پر ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان اسکولوں کے معاشرتی نصب العین میں جسمانی قوت اور جرأت، نیک اخلاق، قومی روح، ضبط نفس اور آزادی وحکومت خود اختیاری کے لئے تربیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کسی شہری کی تخلیق کے لئے یہ تمام باتیں قیمتی عناصر ہیں اور اس لئے ان کا وجود ہر قسم کے اسکولوں کی زندگی میں لازمی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبا کو متعدد مضامین کی تعلیم دیں۔ یہاں پر ہم جس اصول کی پیروی کرتے ہیں اس کے گوناگوں مفہوم ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص قوم کی زندگی اور ضروریات کا وسیع یا محدود نقطۂ نظر رکھے۔ محدود نقطۂ نظر کی رو سے قوم کو کسی وقت کسی قسم کے علم وحذاقت کی ضرورت پیش آتی ہو تاکہ وہ اپنی اقتصادی اور دوسرے قسم کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسکولوں کا یہ کام ہے کہ وہ ایسے نوجوان طلبا پیدا کریں جو اُس علم وحذاقت سے بہرہ ور ہوں۔ وسیع نقطۂ نظر کے لحاظ سے حال کی افادی ضروریات کو کم اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے بجائے طلبا کو ان عناصر سے روشناس کرایا جاتا ہے جو لوگوں کی تاریخی زندگی میں نہایت دائمی اور بنیادی طور پر وقیع خیال کئے جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے تباین سے صنعتی اور لبرل (عام تعلیم جو تہذیب نفس کے لئے دی جائے) تعلیم اور جدید اور کلاسکل تعلیم میں اور کم واضح طور پر اس تعلیم میں جو علم کی قیمت پر زور دیتی ہے اور اُس میں جو ذہنی تربیت اور تادیب پر زور دیتی ہے تناقض پیدا ہو گیا ہے۔

ان متصادم خیالات میں جو مذکورہ بالا تناقضات میں شامل ہیں ہم کو ایک معقول نصاب تعلیم کا تعین لازمی ہے ایسے نظریہ کی بنیاد یقیناً اس پر قائم ہونا چاہئے جس کو وسیع نقطہ نظر کہا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے خاص اصول یہ ہوں گے کہ اسکولی معاشرہ اپنے تخلیقی اثرات میں ان ذہنی، جمالیاتی اور عملی سرگرمیوں کی کیفیتوں کو شامل کرے جنھوں نے انسانی روح کے ارتقا میں اہم حصہ لیا ہے اور جن کی وجہ سے عصر جدید کے دماغ کی تشکیل ہوئی، ادب اور آرٹ، موسیقی و صنعت ریاضی اور سائنس، جغرافیہ اور تاریخ مکمل نصاب کے ضروری جوہر ہیں لیکن یہ چیزیں صرف گوناگوں طریقوں سے نصاب میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ داخل ہو سکتی ہیں اگر مختلف قسم کے طلبا کی گوناگوں ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب ہوں مثلاً کسی مخصوص صنعت کے لئے تیار کرنا کسی خاص اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اس کا مقصد صرف اوزار کے استعمال کی حذاقت یا تجربی صنعتی علم نہ ہو بلکہ متعلم کو اسکول میں کسی ایسے ضروری پیشہ یا فن کے اخلاقی، سائنٹفک یا جمالیاتی روایات کے اندر رکھا جائے جس نے ہمارے تمدن و تہذیب کی ترقی میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور برابر لے رہا ہے۔ اس طرح عمل کرنے سے صنعتی تربیت آبادی کے بڑے حصوں کے لئے حقیقی لبرل تعلیم کی تکمیل اور ہمواری کا موزوں طریقہ ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جو زیادہ تر قدیم کلاسکس (ادب القدما) کے مطالعہ پر مبنی ہو لبرل کہلانے کی مستحق نہیں ہے جب تک کہ وہ ایسی نہ ہو کہ اس سے ایک طالب علم موجودہ دنیا میں آزاد انسان نہ بن سکے۔ اس کے خیالات حساس ہوں اور وہ اس تربیت کی ذہنی اور معاشری تحریکات کی اہمیت سے باخبر ہو۔

اس نقطہ نظر سے ذہنی تربیت یا تادیب کا ترقی دینا اور سنوارنا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے تعلیمی نظریہ اور عمل پر وہ اتنا گہرا اثر برابر ڈال رہا ہے کہ اس کی پر احتیاط تحلیل کی ضرورت ہے۔ اسی خیال کو لطیفے کے طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو وہ اسکول میں سیکھنے اور پھر بھلا دینے کے بعد یاد رکھتا ہے لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کیا یاد رکھتا ہے؟ خام نقطہ نظر کے مطابق اسکولی مطالعوں سے بعض قابلیتیں اور دماغی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور وہی ترقی ان کو جاری رکھنے کا اصلی باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً نظمیں جو بچہ روزانہ سیکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکول چھوڑتے ہی وہ بہت جلد نسیاً منسیاً ہو جائیں لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے اس کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے اور یہی اس کی کافی تائید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی بھی اپنے حاصل کردہ علم طبیعات اور علم کیمیا کے استعمال کرنے کا موقع نہ ملے لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس نے ان علوم سے

قوت مشاہدہ اور قوت استدلال حاصل کرلی ہوں جن کی قیمت عالمگیر ہے اور اس نے تمام بحث طلب امور میں سائنٹفک طریقے کے استعمال کی عادت ڈال لی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی رائج ہے کہ علم ہندسہ سے قوت تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور جبر و مقابلہ سے دماغی درستی۔ ان مثالوں میں نفسیاتی قوت ذہنی یا نظریہ نقل تربیت ذہنی کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی فطری قوت کو ایک موضوع پر تربیت دینے میں دوسرے موضوع کی تربیت کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جدید نفسیاتی تجربات نے اس خیال پارینہ کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان سے یہ ثابت ہے کہ ایک انسان جو اشعار کے یاد کرنے میں طویل مشق سے اپنی قوت حافظہ کو تربیت کرتا ہے وہ کسی حالت میں نثر کے ٹکڑوں کو اس سے کم محنت میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قابل یقین نہیں کہ علم نباتات اور علم طبقات الارض کا ایک ذکی ناظر جس نے اپنی تربیت سے آنکھ کی سرعت اور اعتماد کے اوصاف حاصل کر لئے ہیں وہ ان کو دہلی کی شاہراہوں پر موٹر چلانے میں مدد دیں گے۔ ان یقینی واقعات اور عمومی اعتبارات سے دماغی تربیت کا خیال باطل ثابت ہو رہا ہے لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ وہ ذہنیات جو جان لاک اور دیگر قابل اور تجربہ کار معلموں کی کاوش کا نتیجہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "تعلیم" میں صحیح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکولی مطالعوں کی قدر علم اور قدر تربیت کا تناقض بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اپنے طلبا کو ایسے علم سے روشناس کریں جو بیش قیمت ہے یعنی وہ علم جس کی امور زندگی کے منضبط کرنے میں ناگزیر عملی قیمت ہے تو ہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین ممکن دماغی تربیت کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے کہ بہترین قسم کے علم کی تلاش سے بہترین دماغی تادیب نہیں ہو سکتی۔ اس دلچسپ عقیدہ کو جہاں تک اسپنسر کا ذاتی تعلق ہے مسئلہ ارتقا کے ماننے والے کے عقیدے کا ایک جزو سمجھنا چاہئے لیکن اس کو مذکورہ بالا عام اصول نصاب کا نتیجہ بھی خیال کرنا چاہئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ بہترین تعلیمی سرگرمیاں وہ ہیں جنھوں نے تمدن کی ترکیب اور ترقی میں ضروری اور مستقل مدد پہنچائی ہے۔ ان امدادوں کا حقیقی سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو قوم کے نابغہ (Genius) تھے۔ مثلاً بڑے بڑے آرٹسٹ، صناع، شعرا، ادبا، مغنی اور سائنٹسٹ، ارباب سیاست، یہی لوگ ایوان تمدن کے نقاش اور معمار ہیں اور انھیں لوگوں نے سرگرمیوں کی تشکیل اور شائستگی کی ہے۔ ان کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی اور اس طرح سرگرمیوں کی روایات — ذہنی جمالیاتی اور عملی کی تخلیق ہے جن کی معین اور مخصوص شکلیں آج ہمارے سامنے

ہیں۔ اسی طرح شعری اور نفیس ادبی روایات کی نشو و نما عالمگیر عادت نطق ارتباط سے ہوئی ہے۔ فن تعمیر اور صنعت مادی زندگی کی عالمگیر ضروریات سے بڑھے ہیں۔ سائنس کی ترقی عالمگیر عطیۂ تجسس اور بے پایاں عملی مقاصد کے لئے قطعی علم کی ہمہ گیر ضرورت سے ہوئی اور اسی طرح دوسری بنیادی سرگرمیوں کی جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں نشو و نما ہوئی جس قدر، ایک طالب علم کا مطالعہ ان روایات سے اس کا قریبی تعلق پیدا کر دیتا ہے یا اس میں ان کو جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی قدر اس کا دماغ ان اعلیٰ دماغوں کا پرتو اور آئینہ ہو جاتا ہے جنھوں نے ان کو وضع کیا تھا اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کا دماغ منظم بھی ہو جاتا ہے۔ الغرض اسکولی زندگی کے نظم اور مطالعہ سے یہ مراد ہے کہ بچوں میں یہ قوت و صلاحیت چھوٹے پیمانے پر پیدا ہو کہ وہ جلیل القدر شعراء کے ہم جلیس، ماہرین فن کے ہمسر، حکما اور فلاسفہ کے ہم رتبہ ہو سکیں۔ ان میں وہ دقت نظر پیدا ہو کہ فطرت اور کائنات کا مطالعہ ایک سائنسداں کی عینک سے کریں اور ایسے شہری ہوں کہ ان کے پیش نظر عظیم الشان شہریوں کی مدنی زندگی کا نصب العین ہو۔ اس قسم کی تادیب و تربیت مستحکم ہوتی ہے نہ کہ بادِ ہوا اور اس کی قیمت ہمہ گیر ہے کیونکہ جو سرگرمیاں اس کی تشکیل کرتی ہیں وہ متمدن زندگی کی بنیادی سرگرمیاں ہیں۔

ابھی تک مدرسہ کے نظام میں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے لکھنا ممکن نہیں۔ کچھ تو یوں کہ مذہب کی اصطلاح بہت ہی پیچیدہ اور بے پایاں مظاہر پر مشتمل ہے اور کچھ یوں کہ لوگوں کا اندازہ مذہب کے متعلق اس قدر گوناگوں ہے کہ بعض حالتوں میں بالکل متضاد ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں بہت سے لوگ متناقض معتقدات کے پیرو ہیں جو اخلاقیات کی تعلیم بغیر مذہب کے جائز اور لازم خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک مذہب ایک روحانی مرض ہے یا یوں سمجھئے کہ تہذیب کے عہد طفولیت کا فریب محض ہے جس کو موجودہ زندگی میں ناپید ہو جانا چاہئے۔ جو لوگ انتہائی نقطۂ نظر کے علمبردار ہیں وہ نصاب سے مذہبی تعلیم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں وہ قوموں کی زندگی میں کسی اہم اور مستحکم قیمت والے عامل کی نمائندگی نہیں کرتی۔ باوجود اس کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتہا پسند بھی ایمان رکھتے ہیں جن کے پیش نظر متعین نصب العین کی اعلیٰ قیمت ہوتی ہے۔ یہ معترف ہیں کہ وہ نصب العین بحاطور پر خدمت کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اصلاح باطن پر کچھ اثر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ایمان یقیناً مذہبی کہلائے گا کیونکہ وہ تمام صحیح اور سچے مذاہب کا لب لباب ہے تو یہ شبہ کہ آیا نصاب تعلیم کا عام

اصول مذہبی تعلیم پر منطبق ہوتا ہے۔ رفع ہوجاتا ہے، کیونکہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مذہب اس وسیع مفہوم میں انسانی جماعتوں کی بقا اور ترقی کا ایک بنیادی عامل ہے اور اس لئے......اُس مذہبی تعلیم کو لازماً اسکولی معاشرہ کا ایک عامل ہونا چاہئے۔ لیکن یہاں پر مذہبی تعلیم (بہت عام مفہوم میں) اور مخصوص معتقدات کے مابین رشتہ کا سوال باقی رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر کوئی اتفاق بآسانی نہیں ہوسکتا۔ غالباً دماغی ترقی کے عام خط و خال کے متعلق سب لوگ متفق ہوں گے یعنی مذہب اعتقادی عناصر (جن کی فطرت اس منظم نظریہ کی مائل ہے جو مذہبی عبادت کے مقاصد اور سرچشموں سے متعلق ہے) ان پر عنفوان شباب سے پہلے کم زور دینا چاہئے۔ لیکن اگر یہ رائے تسلیم بھی کرلی جائے تو اس کی تطبیق مباحثے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

اسکولی حکومت | اسکولی نظم حکومت کے متعلق اسی قسم کی کچھ نظری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسکولی معاشرہ کا دارومدار اس مصنوعی مجبوری پر ہے جس کی نوعیت اُس بڑی سوسائٹی کے دبانے والے اثرات سے مختلف ہوتی ہے جن سے ایک شہری ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکولی حکومت کا حاصل بزرگوں کے منتخب مقاصد کی روشنی میں بچوں کی زندگی کا انضباط ہے تاہم چونکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ بچے اور بچیاں بہ حیثیت مرد اور عورت کے بڑی سوسائٹی کی عمومی زندگی میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنا سیکھیں اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے بنیادی خط و خال اسکولی معاشرہ میں موجود ہوں۔ جہاں جہاں جمہوری عقائد کا دور دورہ ہے وہاں اس اصول کو کام میں لانا غیر یقینی ہے۔ موجودہ دور میں انگلستان، امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسکولی نظام حکومت کو مکمل جمہوری بنیاد پر چلانے کے تجربات کئے گئے ہیں جن کی رو سے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بحیثیت قانون ساز اور حاکم عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے تجربات بچوں کی نشو و نما کی روایات سے متناقض ہیں اس لئے ان کی عملی کامیابی میں بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ تجربات کامیابی حاصل کرتے ہیں جہاں قصوروار طلبا کو بداخلاقی سے زیادہ ارباب بست و کشاد کی بدنظمی اور بدعملی سے نجات دلانے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں اسکولی حکومت کی باگ ڈور اسکولی معاشرہ کے بالغ ممبروں کے سپرد کردی جاتی ہے۔ انگلستان میں خاصکر موجودہ اسکولوں اور گزشتہ صدی کے اسکولوں کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک نمایاں عام ترقی اسی جانب میں ہوئی ہے جس کو زیادہ دلیر مصلحین بہت آگے

بڑھا سکتے ہیں۔ اساتذہ کا استبدادی رویہ جو ایک زمانہ میں ان کا طرۂ امتیاز تھا محسوس طور پر معتدل ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ حاکم مطلق کی طرح اپنی مرضی کا اثر ڈال کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کی حیثیت ایک نظریہ' فطری مربی کی ہے جس کے قائم رکھنے میں ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اب اسکولوں میں یہ خیال عام طور پر پھیل رہا ہے کہ اسکول کی حکومت کا بوجھ ان بالغ طلبا کے کاندھوں پر رکھا جائے جو اسکولی افادے کو سمجھ سکتے اور اس کی ذمہ داریوں کو برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ اس طریقے سے طلبا کی مرضی کے مطابق کام ہوگا۔ خود اختیاری اور ذمہ داری کا احساس ہوگا اور نیز اس سے اخلاق کی نشو و نما بھی ہو سکے گی۔

سزا — سزا کا قدیم نظریہ بھی اسکولی حکومت کے نظریہ کی طرح بدلنا ہوگا کیونکہ سزا حکومت کا ایک آلہ ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کسی زمانہ میں سزا اسکولی حکومت کا ایک اہم آلہ تھا لیکن آج کل کوئی معلم اس کا استعمال اس تشدد سے نہیں کرتا جیسا کہ پہلے معقولیت اور درستی کے خیال سے کرتا تھا۔ اس کی وجہ موجودہ مذہب انسانیت نہیں ہے کیونکہ موجودہ تعلیمی نظریہ کی روشنی میں استاد بے چینی اور پریشانی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ سزا کی ضرورت اس بات کی علامت ہے کہ طلبا کی حقیقی ضروریات اور اسکولی زندگی کے حالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اس ہم آہنگی کے نہ پائے جانے کا ذمہ دار خود استاد ہی ہے۔ اسی لئے وہ اصلاح شر کے لئے سزا کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ ان حالات کی درستی کی سعی کرتا ہے۔ ایسی پالیسی عام اصول کے مطابق ہے جس کی وجہ سے اسکول کا کام صحت بخش اور قیمتی قسم کی قطعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی اہم ہے کہ دماغی تادیب کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب صحیح کام کو صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول میں خودسری نمودار ہو جائے گی۔ چاہے وہ کتنا ہی سائنٹفک طریقہ سے چلایا جائے کیونکہ معلم کا فرض نہ صرف طلبا کے غلطی کرنے کے انسانی رجحان کا جانچنا ہے بلکہ والدین کے غیر دانشمندانہ سلوک کا معاوضہ کرنا ہے جو انھوں نے بچوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے ساتھ کیا۔ غلط کاری اور اس کے متعلق سزا کے انسداد کی جتنی بھی خواہش کی جائے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے بچوں کے ساتھ حکیمانہ برتاؤ، کورانہ استبدادی ضابطہ سے زیادہ اصلاح کا حامل ہو سکتا ہے۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی بی۔اے

# تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟

ہندوستان میں موثر تعلیم کے نتائج کا ریکارڈ شاذونادر ہی کسی مدرسہ میں ملے گا۔ ابھی ہم اس اسٹیج پر نہیں پہونچے ہیں۔ ہماری تنخواہوں کی کمی اور ہماری سستی اس قسم کے تجربوں میں مانع ہے۔ ہم میں سے اکثر معلمی کے کام کو کوئی اچھا درجہ نہیں دیتے اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھانے والے اکثر استاد فخر کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے ان میں اور اُن کی تنخواہ میں ایک کشمکش سی رہتی ہے جس کا بالآخر نتیجہ مایوسی یا تنخواہ بڑھانے کے وسائل کا تلاش کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں صورتوں میں تجربہ کی یادداشت محفوظ ہونا اور اسے ملک کے افادہ کے لئے پیش کرنا امر محال رہا ہے۔ ہمارے قابل مفکرین نے بھی جو کم و بیش کسی تجربہ کو دیکھنے رہے ہیں باہر کی کتابوں کے ترجموں سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔ یہ سب سے بڑا قومی نقصان ہے۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ ذاتی بے اعتمادی ہے۔ ہم یا ہمارے ساتھی جو کچھ تجربہ کرتے ہیں اس کے درست ہونے میں انھیں ہمیشہ شک ہوتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کا کیا ہوا تجربہ بالکل صحیح اور بالکل اصولوں کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ بے اعتمادی کی وجہ سے ہم اپنا کیا ہوا تجربہ خواہ وہ کتنا ہی اصولوں کے مطابق کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے اعتراض اور اپنی کم مائگی کا خیال ہر وقت دامنگیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اچھی سے اچھی چیز بطور یادداشت کے محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے لوگوں کے سامنے نہیں آتی۔

بے شمار تعلیمی مسائل ہیں جن پر تجربہ کیا جا سکتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے کیا نتائج ہوتے ہیں یہاں کے حالات کے مطابق کس قسم کے ردوبدل کی ضرورت ہے۔ مثلاً طلبا میں اچھی عادتیں کیسے پیدا کی جا سکتی ہیں؟ اس کے لئے کیا کیا عملی وسائل اختیار کئے گئے؟ طلبا مختلف مضامین میں کیوں کمزور رہ جاتے ہیں؟ کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں؟ تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟ کون کون سے مواقع پر طلبا نے موثر طریقہ پر سیکھا؟ حاضری بہتر بنانے کے لئے گاؤں یا شہر میں کون کون ذرائع اختیار کئے گئے؟ کون کون سی صورتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں؟ چھوٹے بچوں کو کوئی حرفہ سکھانے کے دوران میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں؟ اُن پر کس طرح قابو پایا

جاتا ہے؛ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں جو تجربہ کرنے کے بعد لوگوں کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری امداد ہوگی خواہ اس میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں۔ اس خیال سے تو کوئی تجربہ پیش ہی نہ کرنا چاہئے کہ یہ تجربہ اور اس کے نتائج سو فی صدی صحیح اور درست ہوں گے۔ تعلیم میں کوئی بات بالکل آخری نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یا اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں تجربوں کو دل سے کرنا چاہئے اور بغیر کسی قسم کے فرضی اور خیالی اضافہ کے اس کے نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر دینا چاہئے۔ اس مضمون میں میں اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا تجربہ "تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟" کے متعلق چند باتیں اور اس کے نتائج پیش کرتا ہوں۔

جامعہ ملیہ کے قرول باغ کے مدرسہ میں جسے تعلیمی مرکز بھی کہتے ہیں بچوں کے کام کے ریکارڈ رکھنے کی برابر کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایک ریکارڈ روم ہے جہاں بچوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ، بچوں کی لکھائی کے نمونے، بچوں کے مضامین۔ بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں، بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں اور بچوں کے قلمی رسالے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ ان رسالوں میں بچوں کی کسی مسئلہ کے متعلق جو مدرسہ یا ان کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ آزادرائے کی یادداشت بھی محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ادھر جب سے ہم نے حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینا شروع کی ہے۔ بچوں کے بنائے ہوئے کاغذ، ابری اور کارڈبورڈ کے نمونے بھی یہاں رکھے جاتے ہیں۔ اس تمام کام میں ہم بچوں کی طبیعتوں کے رجحان کا اندازہ کرتے رہتے ہیں اور معلوم کرتے رہتے ہیں کہ بچے کہاں موثر طریقہ پر سیکھتے ہیں۔ کہاں ان کی توجہ سب سے زیادہ ہوتی ہے؛ کہاں وہ بے توجہی کی وجہ سے نقصان کر بیٹھتے ہیں؛ کام کتنے عرصہ دلچسپ رہتا ہے اور کب سے اس کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے؛ ایک موٹی سی بات اس تمام کام میں یہ سمجھ میں آئی ہے کہ تعلیم اس وقت تک موثر نہیں ہوتی جب تک وہ طالب علم کا اپنا مقصد نہیں ہو جاتی خواہ وہ کسی قسم کی تعلیم ہو۔ ہم استاد اسی بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کام کھیل اور کسی بات کے بتلانے اور سکھانے کو طالب علم کا مقصد بنا دیں۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ اس بات کو ہم اپنی ضرورت سے سیکھ رہے ہیں۔ بغیر سیکھے ہماری ضرورت نہیں پوری ہوگی۔ اگر آپ تعلیم اور کام کو طلبا کے لئے بامقصد بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ تعلیم خود بخود موثر ہوتی چلی جائے گی۔ آپ کو طریقہ تعلیم سے بھی کم مدد لینی پڑے گی۔ طالب علم اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے

جو بات سیکھنا چاہے گا اُس کے لئے وہ خود طریقہ تعلیم معلوم کرے گا اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ سیکھنے کے تمام درجے طریقہ تعلیم کے متعلق طے کر رہا ہوگا۔

تعلیمی مرکز میں جہاں باغبانی، کارڈ بورڈ، ابری بنانا اور کاغذ بنانا سکھلایا جاتا ہے اور اس کام کی دلچسپی کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہاں لین دین اور حسابی مشق کے لئے بچوں کے بنک، بچوں کی دوکان اور شعبہ مصنوعات کی اشیاء فروخت کرنے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے میں نے جن مواقع کا اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر ان جز و ں اور مقاصد سے متعلق ہیں۔ ہم نے زیر بحث بات اس وقت پیش کی جب طلبا نے اُس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی، جب وہ آمادہ نظر آئے، جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ بات اُن کا مقصد ہو چکی ہے۔

۱- بچوں کے بنک کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے جن بچوں کی رقمیں بنک میں جمع ہیں ان کو اس موقع پر ان کی رقم پر منافع ملے گا۔ بنک کے تین سو ممبر ہیں، ۲½ فی صدی سالانہ کے حساب سے منافع دیا جائے گا۔ ابتدائی ششم کے طلبا جو بنک کا کام کرتے ہیں ہر طالب علم کا منافع اس کی رقم پر لگانا چاہتے ہیں۔ استاد ان کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منافع یا سود پھیلانے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ بچے اس کو سیکھتے ہیں اور تمام ممبران کا منافع پھیلاتے ہیں۔ منافع کے رجسٹر میں درج کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو طلبا نے شوق سے سکھا انھیں اس کی ضرورت تھی۔

۲- گل دیوار کے کئی پودوں کو باغبانی میں دیمک نے خراب کر دیا۔ موتیا کے کئی پودے بھی دیمک کی نذر ہو چکے ہیں، طلبا چاہتے ہیں کہ کسی طرح دیمک کا خاتمہ ہو جائے تاکہ باقی پودے بچ جائیں۔ کتابوں اور رسالوں سے دیمک کو تباہ کرنے کے کئی نسخے انھوں نے معلوم کئے، اپنی کاپیوں میں لکھے۔ ان نسخوں میں سے دو کا استعمال کرکے دیمک کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات بہت موثر طریقہ پر ان کو معلوم ہوگئی۔ دیمک کا حال اپنے شوق سے پڑھا۔

۳- نیا سال شروع ہوا ہے۔ بچوں کی دوکان میں بچوں کی ضروریات کی تمام چیزیں خریدی جا چکی ہیں۔ ابتدائی پنجم کے طلبا جو بچوں کی دوکان کا کام کرتے ہیں، یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس چیز پہ دوکان کو کتنا فی صدی منافع لینا چاہئے؛ وہ عملی طور پر فی صدی نکالنا جاننا چاہتے ہیں۔ انھیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ سو فی صدی اس کیلئے

تیار ہیں جو کچھ ان کو بتلایا گیا انھوں نے سو فی صدی موثر طریقہ پر سیکھ لیا ہے۔

(۴) ابتدائی ششم کے طلبا ردی کا غذ بنا رہے ہیں۔ کچھ لگدی کچل رہے ہیں، کچھ کاغذ اٹھا رہے ہیں، کچھ چکنا کر رہے ہیں، کچھ چوکور بنا رہے ہیں۔ استاد اس دوران میں ان کو یہ بتلاتا ہے کہ سب سے پہلے ہاتھ سے کاغذ کن ملکوں میں بنتا تھا اور اس کو سیاحوں نے کس طرح دوسرے ملکوں میں پہونچایا؟ سیاحوں کی کہانیوں سے کچھ سیاحوں کے حالات بتلائے گئے۔

(۵) پانچویں جماعت کے طلبا چھ پہلو والی کشتی بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بنانے کا طریقہ انھیں نہیں معلوم ہے۔ وہ استاد سے پوچھتے ہیں۔ استاد چھ پہل کشتی بنوانے سے پیشتر طلبا کو چھ پہل شکل بنانا سکھلاتا ہے۔ طلبا اسے خوشی سے سیکھتے ہیں۔

(۶) ابتدائی اول کے طلبا ابری بنانے کے دوران میں لئی ایک دوسرے کے لگا دیتے ہیں، دری میں پوچھ دیتے ہیں، ہاتھ نہیں دھوتے یا دھوتے ہیں تو کرتے یا شیروانی کے دامن میں ہاتھ پوچھ لیتے ہیں۔ استاد سب کو جمع کرکے صاف رہنے کے متعلق بتلاتا ہے، رفتہ رفتہ اس کی عادت پیدا کراتا ہے۔ طلبا اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، صاف رہنا سیکھتے ہیں۔

(۷) لئی پکانے کے لئے ابتدائی پنجم کے طلبا انگیٹھی میں کوئلہ جلانا چاہتے ہیں۔ کوئلہ، کاغذ اور ماچس منگائی جاتی ہے۔ استاد لئی پکانے کے دوران میں ماچس کے متعلق تھوڑی سی واقفیت دیتا ہے۔ لئی پکنے کے بعد کمرۂ جماعت میں ماچس پر ایک سبق ان کی کتاب سے پڑھاتا ہے۔ سبق کا مطالعہ پوری دلچسپی سے ہوتا ہے۔ اسی موقع پر پہلی جماعت کا ایک استاد لئی پکنے کے دوران میں بچوں کو بتلاتا ہے کہ بہت پہلے جب ماچس وغیرہ کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ آگ کس طرح جلاتے تھے اور اس طرح بچوں کو ابتدائی انسان کی کہانی سناتا ہے۔

جستہ جستہ تصویروں سے مدد لیتا ہے۔

(۸) ابتدائی اول اور دوم کے بچے لئی اور پانی کی ابری بناتے ہیں۔ یہ دو طرح کی ابریاں ہیں ایک لئی اور رنگ سے بنائی جاتی ہے، دوسری پانی پر روغنی رنگ چھڑک کر) اور فروخت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ کا ایک فل اسکیپ تختہ فروخت کرتے ہیں۔ وہ روزانہ گننا، پیسوں سے آنے بنانا اور آنوں سے روپے بنانا سیکھتے ہیں

اور اس کی مشق کرتے ہیں۔ روزانہ اپنی آمدنی کا حساب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بامقصد طریقہ پر اس کی مشق کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔

(۹) آج کل ٹیوب کے رنگ سے ابری نہیں بنوائی جاتی۔ بچے مصر ہیں کہ ٹیوب کے رنگوں سے ابری بنائی جائے اس لئے کہ ٹیوب کے رنگ سے بچے بہت اچھی ابری بنا چکے ہیں۔ استاد بچوں کو بتلاتا ہے کہ یہ رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے تھے۔ پہلے ایک ٹیوب ۲،ر کا ملتا تھا اب اول تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو بہت پرانا جس سے ابری اچھی نہیں بنتی اور ایک ٹیوب ۴،ر کا ملتا ہے۔ استاد نقشہ کا استعمال کرتا ہے اور یورپ کے نقشہ پر جرمنی اور انگلستان دکھلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ مال کس راستہ سے ہندوستان آتا تھا۔ ابتدائی ششم میں اس موقعہ پر موجودہ جنگ کی وجوہات پر ایک مختصر معلومات دی جاتی ہے۔

میں نے چند بامقصد مواقع کا تذکرہ کیا ہے جہاں تعلیم موثر طریقے پر ہوئی ہے۔ اس پر اور اضافہ کیا جا سکتا ہے اور جماعت میں طلبا کے کام کا ریکارڈ رکھنے سے اس سے اچھے مواقع کی یادداشت ترتیب دی جا سکتی ہے۔ بغیر یادداشت کے اچھے سے اچھے مواقع نظرانداز ہو سکتے ہیں اس لئے موثر تعلیم کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے یادداشتوں کا ہونا ضروری ہے جو بہت باضابطہ طریقہ پر رکھی جائیں۔

## سید احمد علی صاحب

(ترجمہ کینڈڈا، مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

## دوسرا ایکٹ

(اسی دن شام کو۔ وہی کمرہ مہمانوں کی کرسی میز پر دوبارہ رکھدی گئی ہے۔ پاچ مینکس تنہا بیٹھا ہوا ہے وقت کاٹنے کے لئے وہ ٹائپ رائٹر چھونے لگتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ دروازہ پر کسی کی آہٹ سنتا ہے اور چپکے سے کھڑکی کے پاس کھسک جاتا ہے اور کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کچھ کر ہی نہیں رہا تھا۔ مس گارنٹ ہاتھ میں ایک نوٹ بک لئے ہوئے (جس میں وہ ماریل کے ارشادات شارٹ ہینڈ میں لکھا کرتی ہے) اندر داخل ہوتی ہے اور آکر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے تاکہ کچھ عبارت ٹائپ کرے۔ کام شروع کر دیتی ہے اور اس قدر مشغول ہوتی ہے کہ یوجین کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن جب دوسری سطر ٹائپ کرتی ہے تو ایکدم رک جاتی ہے اور مشین دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے)

پ۔ اچھا پاچ مینکس تم نے میرے ٹائپ رائٹر کو خراب کر دیا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس طرح اس طرف دیکھ رہے ہو جیسے تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔

ی م۔ (دب کر) مجھے بہت افسوس ہے مس گارنٹ! میں صرف اس سے ٹائپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا (شکایت کرتے ہوئے) لیکن ٹائپ ہی نہیں ہوا۔

پ۔ تم نے اس کی روشنائی والے پرزے کو بدلا ہو گا۔

ی م۔ (یقین دلاتے ہوئے) ۔ نہیں میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے بالکل نہیں بدلا۔ میں نے صرف ایک چھوٹا

پہیہ گھمایا تھا۔ وہ کلک سا ہوا

پ۔ اچھا اب میں سمجھ گئی (وہ فصل بھی ٹھیک کر دیتی ہے اور باتیں بھی کرتی جاتی ہے) میرے خیال میں تم اسے آسان قسم کی مشین کا باجا سمجھے کہ ذرا ہینڈل گھمایا اور اس نے ایک عشقیہ خط تمہارے لئے لکھ دیا۔ کیوں نا ؟

ی م۔ (سنجیدگی سے) میرے خیال میں اس مشین سے بھی عشقیہ خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ مشین مشین سب برابر ہیں۔ کیوں نا ؛

پ۔ اگرچہ ناگوار خاطر ہو کر گویا اس قسم کی باتیں اگر تفریحاً ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ اس قسم کی باتیں کرنا اس کے دستور العمل کے خلاف ہے) مجھے کیا معلوم۔ تم مجھ سے آخر یہ کیوں پوچھ رہے ہو ؟

ی م۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہر سمجھدار آدمی خصوصاً وہ لوگ جو دن بھر کاروبار میں لگے رہتے ہیں یا محرری قسم کا پیشہ کرتے ہیں ضرور مشغلہ محبت رکھتے ہوں گے تاکہ ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

پ۔ (غصہ سے کھڑے ہو کر) مسٹر باج بینکس ! (وہ اس کی طرف نہایت سختی سے دیکھتی ہے اور نہایت شان کے ساتھ بک کیس کی طرف چلی جاتی ہے)

ی م (اس کے پاس نہایت عاجزی سے جاتے ہوئے) مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ شاید مجھے نہ چاہیئے تھا کہ آپ کے معاملات دل کی طرف اشارہ کرتا۔

پ۔ (الماری میں ایک نیلی کتاب رکھتے ہوئے اور اس کی طرف نہایت تیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے) میرے کوئی دلی معاملات نہیں ہیں۔ تم آخر اس قسم کی مجھ سے باتیں کرنے کی جرأت کیسے کر رہے ہو ؟ (کتاب کو اپنی بغل میں دبا لیتی ہے اور مشین کی طرف اکڑتی ہوئی جا رہی ہے، یوجین کے دل میں درد سا پیدا ہوتا ہے اور وہ نہایت ہمدردانہ طریقہ پر مخاطب ہوتا ہے)

ی م۔ اچھا تو میں سمجھ گیا۔ تم کو بھی میری طرح بس حیاد امنگیر ہے۔ جھینپ معلوم ہوتی ہے

پ۔ ہرگز نہیں ہیں قطعی شرم نہیں کرتی اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؛

ی م۔ (چپکے سے رازدارانہ طور پر) تم محبت کرتی ہو اور یہی تو وجہ ہے کہ دنیا میں اس قدر کم معاملات دل ہوتے ہیں ہم سب محبت کے بھوکے ادھر اُدھر گھوما کرتے ہیں محبت ہماری فطرت کی اولین ضرورت ہے۔ ہمارے

دلوں کی اولین خواہش۔ لیکن ہم اپنا شوق اپنی زبان سے کہنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہم سب کو حیا دامنگیر رہتی ہے (بڑے خلوص سے) مس گارنٹ بھلا تم ہی بتاؤ کہ اس خواہ مخواہ کی جھجک، اس ڈر، اس شرم سے نجات پانے کے لئے کیا کیا دل نہ چاہتا ہوگا۔

پ۔ (اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے) ہیں سچ کہتی ۔ !

ی م۔ (ضد کرتے ہوئے) اونہ! یہ خواہ مخواہ کی باتیں میرے سامنے رہنے دو، یہ سب تصنع بناوٹ ہوتی ہے میں ان سے مرعوب نہیں ہوتا! آخر ان باتوں سے فائدہ ہی کیا۔ تم اپنی اصلی شخصیت مجھ پر ظاہر کرنے سے کیوں ڈرتی ہو؟ میں بھی بالکل تمہاری طرح ہوں۔

پ۔ میری طرح! یہ آخر بات کیا ہے ؟ یہ تم مجھے خوش کر رہے ہو یا اپنے کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کس کو؟ (وہ پھر ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہونا چاہتی ہے)

ی م۔ (اسے چپکے سے روکتے ہوئے) ہش! میری سنو۔ میں ہر جگہ محبت کی تلاش میں گھومتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کے سینوں میں بھی یہی چیز طوفانی شدت سے موجزن ہے لیکن جب میں کسی سے اس کی درخواست کرنا چاہتا ہوں تو یہی شرم، یہی حیا میرا گلا پکڑ لیتی ہے اور میں گونگا کھڑا رہ جاتا ہوں بلکہ گونگے سے بھی بدتر۔ بے معنی باتیں اور احمقانہ جھوٹ بکنے لگتا ہوں اور پھر طرہ یہ کہ میں دیکھتا ہوں وہی محبت جس کے لئے میں بیتاب تھا، جس کا میں بھکاری تھا کتے بلیوں اور پرندوں کو دی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ آتے ہیں اور اس کے طالب ہوتے ہیں، مانگ سکتے ہیں اور مانگ لیتے ہیں۔ (خاموشی سے سرگوشی کرتے ہوئے) محبت ہر جگہ طلب کرنا چاہتی ہے۔ یہ بالکل ایک جن کی طرح ہے جب تک تم خود اس سے نہ بولو یہ نہیں بولتی لیکن (پھر اپنے اصلی لہجہ میں لیکن مایوسی کے ساتھ) دنیا میں محبت ہر جگہ اظہار کیلئے بے قرار و مضطرب رہتی ہے لیکن اظہار کی جرات نہیں کرتی اس لئے کہ وہی شرم دامنگیر ہو جاتی ہے، حیا مانع آتی ہے۔ بس یہی دنیا کا ایک المناک پہلو ہے (نہایت گہری سانس لیتا ہے اور ملاقاتیوں والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

پ۔ (نہایت متعجب ہو کر لیکن ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اور اجنبی نوجوانوں کے سامنے اپنے عفت و عصمت کے احساس کی نمود کرتے ہوئے) لیکن خراب قسم کے لوگ تو اس شرم پر غالب آ جاتے ہیں۔ کیوں؟ !

ی م۔ (جھٹ پٹ اٹھ بیٹھتے ہوئے اور نہایت شدت سے کہتے ہوئے) خراب لوگ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کا جذبہ نہیں ہوتا اسی لئے ان کو شرم بھی نہیں ہوتی۔ ان کو محبت طلب کرنے میں کوئی جھجھک نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اور اپنی محبت جتانے کی ان میں طاقت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے پاس ہوتی ہی نہیں (وہ اپنی جگہ پر پھر مضمحل ہو جاتا ہے اور حسرت سے کہتا ہے) لیکن ہم۔ ہم لوگ جو محبت والے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری محبت دوسروں کی محبت سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتے (نہایت دب کر) سمجھیں آپ!

پ۔ اچھا سنو! اگر تم نے اس قسم کی باتیں مجھ سے کرنا بند نہ کیں تو میں کمرے کے باہر قطعی چلی جاؤں گی مسٹر مارچ بینکس! میں سچ مچ چلی جاؤں گی یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

(وہ پھر اپنے ٹائپ رائٹر پر چلی جاتی ہے۔ اپنی نیلی کتاب کھولتی ہے اور اس سے ایک صفحہ نقل کرنے کا ارادہ کرتی ہے)۔

ی م۔ (ناامیدی سے) ہاں سچی باتیں کبھی اچھی باتیں نہیں ہوتیں (وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمرہ میں کھویا ہوا سا ٹہلنے لگتا ہے) مس گارنٹ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اور کیا باتیں کروں؟

پ۔ (بے رخی سے) ادھر ادھر کی باتیں کرو۔ موسم کی باتیں کرو۔

ی م۔ فرض کرو اگر ایک بچہ قریب ہی بھوک کے مارے چلا رہا ہوتا تو کیا تم اس سے بس ادھر ادھر کی باتیں کرو گی؟

پ۔ نہیں

ی م۔ بس اسی طرح میں ادھر ادھر کی باتیں نہیں کر سکتا جب میرا دل اپنی بھوک کی وجہ سے تڑپ رہا ہے

پ۔ اچھا! تو پھر چپ رہو۔

ی م۔ ہاں بس یہی تو ہوتا ہی ہے ہم سب اپنی اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں کیا اس سے دل کی دھڑکن بھی خاموش ہو سکتی ہے؟ نہیں دل برابر رو ئے جاتا ہے۔ ہے نا؟ ضرور اور قطعی یہی ہوتا ہوگا۔ اگر تمہارے پاس واقعی دل ہے۔

پ۔ (ایکدم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے) کوئی فائدہ ہی نہیں کہ میں کام کرنے کی کوشش

کروں جبکہ تم اس قسم کی باتیں۔ کئے چلے جا رہے ہو (میز سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھتی ہے احساسات مشتعل ہیں)
تمہیں اس سے کیا مطلب کہ میرا دل رو رہا ہے کہ نہیں۔ پھر بھی میرا ارادہ ہوتا ہے کہ تم کو بتا دوں۔

ی م۔ نہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی سے جانتا ہوں

پ۔ لیکن دیکھو، اگر تم نے ذرا بھی کہیں زبان کھولی تو میں فوراً انکار کر دوں گی۔

ی م۔ (ہمدردی سے) ہاں، یہ بھی جانتا ہوں۔ اچھا تو تمہاری ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے کہہ سکتیں!

پ۔ (اچھل پڑتے ہوئے) اس سے! کس سے؟

ی م۔ وہ جو کوئی ہو۔ میرا مطلب یہ کہ وہ شخص جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ کوئی ہو۔ مسٹر مل شاید۔

پ۔ (حقارت سے) مسٹر مل!! اخوب وہ بڑا اچھا آدمی ہی ہے کہ جس پر اپنا دل کھو بیٹھوں؟ اس سے زیادہ تو میں تمہیں پسند کر سکتی ہوں۔

ی م۔ (جھجک پڑتے ہوئے) نہیں، نہیں میں نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے لیکن تمہیں اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیے میں۔

پ۔ (زچ ہو کر آتشدان کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی طرف پیٹھ کرکے) تمہارے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شخص تم نہیں ہو بلکہ دراصل کوئی خاص شخص نہیں ہے۔

ی م۔ میں جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم اس سے محبت کرو گی جو تم سے اظہار ـــــ

پ۔ (مڑتے ہوئے نہایت خفگی سے) مجھ سے اظہار ـــ نہیں ہرگز نہیں ـــ تم نے مجھے آخر سمجھا کیا ہے؟

ی م۔ (ناامید ہو کر) اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سچ سچ جواب کبھی نہ دو گی۔ وہی جھوٹی باتیں کرتی ہو جو ہر شخص کہنے لگتا ہے (وہ صوفے کی طرف جاتا ہے اور انتہائی ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (چڑ کر گویا وہ اسے غریب طبقہ کا سمجھ کر باتیں کرنا نہیں چاہتا) اگر تم ہمیشہ نئی اور نرالی باتیں چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ تم خود اپنے سے تنہائی میں جا کر باتیں کر لیا کرو۔

ی م۔ ہاں، یہی تو پھر کرنا ہوتا ہی ہے۔ ہر شاعر یہی کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بلند آواز میں باتیں کیا کرتے ہیں اور دنیا ان کی باتیں سن لیتی ہے پھر بھی یہ سخت تنہائی کی باتیں ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی دوسروں کی باتیں سننے کو بھی جی چاہتا ہے۔

پ۔ اچھا رکو! مسٹر مارلی آتے ہوں گے۔ وہ تم سے باتیں کریں گے (مارچ لرز جاتا ہے) نہیں تمہارے گھبرانے اور منہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تم سے بہتر [illegible] دماغ درست کر دیں گے (لانتا لکھکر وہ غصہ سے اپنی جگہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن یوجاین ایکدم چونک پڑتا ہے بشاش ہو جاتا ہے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو روک لیتا ہے

ی م۔ خاہ! اب میں سمجھا!!

پ۔ (سرخ ہوتے ہوئے) کیا سمجھے؟

ی م۔ تمہارا راز کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ سچ بتاؤ کیا واقعی اور حقیقتاً یہ ممکن ہے ایک عورت کے لئے کہ اس سے محبت کر سکے؟

پ۔ (گویا اب بات حد سے گذر گئی) خوب!

ی م۔ (جوش سے) نہیں نہیں، سچ مجھے بتلاؤ تو ذرا۔ میں جاننا چاہتا ہوں میں قطعی جاننا چاہتا ہوں میری سمجھ میں یہ بات بالکل آتی ہی نہیں مجھے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے الفاظ کے متبرک خیالوں کے اور وہ بات جسے لوگ الوہیت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن تم ان باتوں سے تو محبت کر نہیں سکتیں؟

پ۔ (تجاہل عارفانہ سے اس کی بات کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے) میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

ی م۔ (زور سے) تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم قطعی میری بات سمجھ رہی ہو۔

پ۔ اچھا!

ی م۔ تم قطعی سمجھ رہی ہو اور قطعی میرا مطلب تمہاری سمجھ میں [illegible] یہ ممکن ہے کہ ایک عورت اس سے محبت کرے؟

پ۔ (اس کی طرف آنکھیں چار کرکے) ہاں! (وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھوں سے بند کر لیتا ہے) ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ (وہ اپنے ہاتھوں کو ہٹا لیتا ہے۔ پراز رپائن اس کی اس حالت کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور جتنا دور ہو سکتا ہے ہٹ جاتی ہے لیکن اس کی طرف برابر دیکھے جاتی ہے۔ یوجین اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اٹھتا ہے اور بچوں والی

کرسی پر جا بیٹھتا ہے نہایت ہی نا امیدی کے ساتھ وہ باہر چلی جانا چاہتی ہے لیکن جیسے دروازہ کے پاس پہونچتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور برگیس اندر داخل ہوتا ہے اور وہ ایک دم بول اٹھتی ہے) خدا کا شکر ہے۔ آخر کوئی آ تو گیا (اسے گونہ اطمینان ہو جاتا ہے اور میز پر اپنی جگہ آ بیٹھتی ہے۔ ٹائپ رائٹر میں ایک نیا کاغذ لگا دیتی ہے برگیس یوجین کے پاس چلا جاتا ہے)

ب۔ (معز ز ملاقاتی کی آؤ بھگت ظاہر کرتے ہوئے) خوب! تو گیا اسی طرح آپ تنہا چھوڑ دیئے جاتے ہیں! مسٹرمارچ بینکس میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے آگیا ہوں (یوجین اس کی طرف وحشت سے دیکھتا ہے لیکن وہ اسے نہیں سمجھتا) جمیس کھانے والے کمرے میں کسی دفعہ سے باتیں کر رہا ہے اور کینڈی اوپر کسی لڑکی کو کشیدہ کاری سکھلا رہی ہے (ہمدردی جتاتے ہوئے) یہاں آپ کی اکیلے کیلئے طبیعت گھبرا گئی ہوگی کہ سوائے ٹائپسٹ کے اور کوئی باتیں کرنے والا نہ تھا (وہ آرام کرسی کو اپنی طرف گھسیٹتا ہے اور اس پر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (نہایت ہی برافروختہ ہوکر) انھیں اب اطمینان ہو جائیگا کیونکہ اب انھیں آنجناب سے شریفانہ گفتگو کرنیکا شرف حاصل ہوگیا ہے یہ بھی کیا کم ہے (اتنا کہکر وہ زور شور سے ٹائپ کرنے لگتی ہے)

ب۔ (اس کی جرات پر متعجب ہوکر) جوان عورت میں تجھ سے باتیں نہیں کر رہا تھا میرا جہاں تک خیال ہے۔

پ۔ مسٹر مارچ بینکس آپ نے اس قسم کا بھی خراب اخلاق کہیں دیکھا ہے؟

ب۔ (شاندار سنجیدگی سے) یوجین ایک شریف آدمی ہے اور اپنی پوزیشن سے بخوبی واقف ہے اور یہ وہ خوبی ہے جو لوگوں میں کم ہوتی ہے۔

پ۔ (جلاکر) اچھا تو گویا نہ تم شریف آدمی ہو اور نہ میں شریف عورت اگر یوجین یہاں نہ ہوتے تو میں تم سے ذرا صاف گفتگو کرتی (وہ اپنی مشین سے ٹائپ کیا ہوا خط اتنے زور سے نکالتی ہے کہ پھٹ جاتا ہے) دیکھا، یہ خط آخر تمہاری وجہ سے خراب ہوگیا اب مجھے دوبارہ پھر اسے ٹائپ کرنا پڑے گا۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں اپنے کو ضبط نہیں کر پا رہی ہوں۔ کھوسٹ، احمق، گدھا۔

ب۔ (اٹھ کھڑے ہوکر غصہ سے ہانپتے ہوئے) خوب! میں کھوسٹ احمق اور گدھا ہوں خوب، خوب، بہت گہری سانسیں لیتے ہوئے) اچھی بات چھوکری، بہت اچھی بات ہے۔ ذرا رک جاؤ تمہارا مالک آلے پھر میں تمہیں بتلا دونگا

پھر دیکھنا۔ پھر تبلاؤں گا۔

پ۔ (محسوس کرکے کہ واقعی وہ کچھ زیادہ کہ گئی) میں ــــ

ب۔ (اس کا کلام قطع کرتے ہوئے) نہیں، بس اب جو کچھ تمہیں کہنا تھا کہہ چکیں۔ بس اب تمہیں مجھ سے بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تبلا دوں گا کہ میں کون ہوں (پ ٹائپ رائٹر میں دوسرا کاغذ چڑھاتی ہے اور حقارت سے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیتی ہے) مسٹر یوجین آپ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوجئے گا۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں (نہایت شان سے پھر بیٹھ جاتا ہے)

ی م۔ (بہت پریشان ہوکر اور سہم کر) میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا موضوع کلام بدل دیں میرا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مس گارنٹ کا مطلب آپ کی طرف ایسا نہ تھا۔

پ۔ (قطعی یقین کے ساتھ) میں نے وہی کہا جو میرا مطلب تھا۔

ب۔ ایسی عورتوں کی باتیں سننا میری شان کے خلاف ہے۔

(ایک برقی گھنٹی دو دفعہ بجتی ہے)

پ۔ (اپنے کاغذات و نوٹ بک اکٹھا کرتے ہوئے) یہ میرے لئے ہے (وہ جلد ہی سے باہر چلی جاتی ہے)

ب۔ (اس کی طرف منہ کرکے کہتے ہوئے) خیر جاؤ! ہم لوگ تم کو جانے کی اجازت دے رہے ہیں (اس بات سے مسرور ہوکر کہ آخری جملہ انہیں کا رہا اور پھر ذرا اور باثر جانے کے لئے آپ پ کی طرف برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ جب وہ بالکل اوجھل ہو جاتی ہے تب اپنی جگہ پر یوجین کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس سے رازدارانہ لہجوں میں بات چیت کرنے لگتے ہیں) مسٹر یوجین اب ہم اس وقت بالکل تنہا ہیں میں ایک بات آپ سے دوستانہ مشورہ کے طور پر کہتا ہوں جو اور کسی سے نہ کہتا۔ اچھا پہلے یہ بتلایئے آپ سے اور میرے داماد جیمس سے کتنے عرصہ سے ملاقات ہے؟

ی م۔ مجھے یاد نہیں۔ تاریخیں مجھے یاد ہی نہیں رہتیں، جہاں تک میرا خیال ہے یہی ایک دو ایک مہینے ہوئے ہونگے

ب۔ آپ کو اس میں کوئی عجیب بات نظر آئی؟

ی م۔ نہیں مجھے تو نہیں نظر آئی۔

ب۔ (موثر طور پر) اور نہ آپ کو نظر آئے گی اور یہی مشکل ہے۔ خیر تو سنیے جیمس پاگل ہے۔

ی م۔ پاگل،

ب۔ بالکل پاگل! ایسا پاگل جیسا مارچ میں خرگوش پاگل ہو جاتا ہے۔ ذرا آپ غور کیجئے گا آپ کو فوراً پتہ چل جائے گا۔

ی م۔ (بے کلی سے) لیکن غالباً اس کے خیالات کی وجہ سے وہ ایسا۔

ب۔ (اس کے گھٹنے کو انگلی سے چھو کر دباتے ہوئے تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ رہے) بس بس مسٹر ہاپ بینکس انہیں خیالات سے میرا مطلب تھا۔ اور میری بات یاد رکھیئے گا کہ خیالات جب تک محض خیالات رہیں اس وقت تک تو کوئی حرج نہیں لیکن جب ان پر لوگ عمل کرنے لگیں تو معاملات بہت اہم ہو جاتے ہیں لیکن ان باتوں کو (خدا) درمیان میں لانے کا ارادہ میرا نہ تھا (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تاکہ یقین ہو جائے کوئی اور تو نہیں ہے پھر اس کے بعد یوجین کے کان کی طرف جھکتا ہے) آپ کو معلوم ہے اس نے آج سویرے مجھ سے کیا کہا؟

ی م۔ کیا!

ب۔ کہنے لگا، (یقین مانیے کہ میں اتنا ہی سچ کہہ رہا ہوں جیسے یہ بات کہ میں اور آپ یہاں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ "میں ایک بیوقوف آدمی ہوں اور تم ایک بدمعاش" میں اور ایک بدمعاش ذرا دیکھئے تو! اور پھر مجھ سے اس بات پر ہاتھ ملایا گویا اس میں میری تعریف زیادہ ہے کیا آپ ان باتوں کو ہوش و حواس کی باتیں کہہ سکتے ہیں؟

م۔ (باہر سے ب کو پکارتے ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے) اُن سب کے نام اور پتے لکھ لینا مس گارنٹ!

ب۔ (زور سے) بہت خوب مسٹر ہاریل!

(ہاریل اندر آ جاتا ہے۔ وفد کے کاغذات ہاتھ میں ہیں)

ب۔ (یوجین سے الگ) دیکھو وہ آ گیا ہے ذرا نگاہ رکھنے گا اور اس بات کا خیال رکھئے گا (یکدم اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) جیمس! مجھے افسوس ہے کہ مجھے تم سے ایک شکایت کرنی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کرنا چاہیئے بطور ایک فرض کے۔

م۔ خیریت۔ کیا بات ہے؟

ب۔ مسٹر م اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں (نہایت سنجیدگی سے) تمہاری وہ جوان سی چھوکری اپنے آپ کو اتنا بھول گئی کہ مجھے ایک کھوسٹ، احمق اور گدھا کہنے لگی۔

م۔ (نہایت شدید مسرت سے) اچھا! خوب یہ پیاری نے کہا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرا زیادہ صاف گو اور مبیاک ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں روک ہی نہیں سکتی۔ بیچاری! ہا ہا۔

ب۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) اور کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو برداشت کروں گا؟

م۔ اونھ: لاحول ولا قوۃ! تم اس کا بالکل کچھ خیال ہی نہ کرو۔ بالکل سنو ہی نہیں (وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور کاغذات کو درازوں میں رکھ دیتا ہے)

ب۔ ہاں میں نے خیال تو واقعی نہیں کیا۔ میں ان معمولی باتوں سے بہت بلند ہوں لیکن یہ اس کی کچھ ٹھیک حرکت نہیں ہے۔ تم ہی بتلاؤ کہ بھلا یہ بھی کونسی حرکت ہے۔ کہاں تک درست ہے۔؟

م۔ درستی اور نادرستی کا سوال تو خیر پادریوں کے لئے ہے عوام کے لئے نہیں لیکن کیا اس بات سے تمہیں تکلیف پہونچی ہے؟ میرا تو خیال نہیں ہے کہ تمہیں کوئی اذیت پہونچی ہوگی۔ اس لئے اب اس کا خیال ہی چھوڑ دو (وہ اس مضمون کو بس یہیں پر ختم کر دیتا ہے اور اپنے لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے)

ب۔ (مسٹر م سے الگ) میں نے آپ سے کہا نہ تھا! بالکل اور قطعی پاگل (وہ میز کے پاس جاتا ہے اور بہرے آدمیوں کی طرح ایک طرح کے گرسنہ لہجہ میں پوچھتا ہے) کھانے میں کتنی دیر ہے جمیس؟

م۔ ابھی دو گھنٹہ تک تو تیار ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔

ب۔ (صبر کے لہجہ میں) اچھا تو پھر مجھے جب تک کوئی اچھی سی کتاب دیدو۔ میں وہاں آتشدان کے قریب پڑھوں گا۔ ساتھی بھی عمدہ ہے۔

م۔ کس طرح کی کتاب چاہئے کوئی واقعی عمدہ کتاب؟

ب۔ (ایک دم شدت سے انکار کر کے اٹھتے ہوئے) ارے نہیں۔ بس یونہی کوئی دلچسپ کتاب۔ بس وقت کاٹنے کے لئے (م ارل میز پر سے ایک تصویر دار اخبار اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے وہ اسے بہت نیازمندی سے

قبول کر لیتا ہے) شکریہ جیمس: (آتشدان کے قریب اپنی بڑی کرسی پر چلا جاتا ہے اور وہاں نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

م۔ (لکھتا بھی جا رہا ہے) کینیڈا تم لوگوں سے باتیں کرنے کے لئے بس اب آتی ہی ہوگی۔ پڑھانے سے تو اسے چھٹی مل گئی ہے لیکن وہ ابھی لیمپوں میں تیل بھر رہی ہے۔

ہی م۔ (نہایت ہی وحشت زدہ ہو کر چونک پڑتے ہوئے) لیکن اس سے تو اس کے ہاتھ میلے ہو جائیں گے۔ ماریل: میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ نہایت شرمناک بات ہے میں جاتا ہوں اور خود بھر دوں گا۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

م۔ بہتر یہ ہے کہ تم نہ جاؤ (ہی م ایک دم رک جاتا ہے) کیونکہ تم سے بجائے اس کے وہ میرے بوٹ صاف کرانے لگے گی تاکہ میں اپنے صبح کے اس کام سے بچ جاؤں۔

ب۔ (بہت ناپسندیدگی سے) جیمس کیا اب تم نوکر نہیں رکھتے؟

م۔ ہاں ہے تو لیکن وہ غلام نہیں ہے۔ پھر بھی گھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے پاس تین چار نوکر موجود ہوں یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پراز ی اور میں ناشتہ کے بعد اپنے کام کی باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور کپڑے بھی دھوتے جاتے ہیں جب دو آدمی ہوتے ہیں تو کپڑے دھونے میں کوئی دقت معلوم نہیں ہوتی۔

ہی م۔ (بے چین ہو کر) تو اس سے کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہر عورت مس گارنٹ کی طرح گھٹیا ہو جائے۔

ب۔ (زور دے کر) ہاں بس، یہ ایک بات کہی مسٹر ہی م۔ گھٹیا بالکل مناسب لفظ ہے۔ گھٹیا وہ واقعی ہے۔

م۔ (خاموشی اور سنجیدگی سے) ملرچ بینکس؟

ہی م۔ کہیئے؟

م۔ تمہارے والد کے پاس کتنے نوکر ہیں؟

ہی م۔ (جھنجلا کر) اوہ مجھے نہیں معلوم (صوفے کی طرف بڑھ جاتا ہے گویا چاہتا ہے کہ ماریل کے سوالات سے جتنا دور ہو جائے اتنا اچھا ہے اور نہایت رنج و الم کی حالت میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تیل ہی کا خیال رہ رہ کر آ رہا ہے)

م۔ (بہت سنجیدگی سے) اس قدر کہ تمہیں معلوم نہیں (اور زیادہ بڑھاتے ہوئے) جب کوئی ایسا مکروہ کام کرنا ہوتا ہو تو تم بس گھنٹی بجا دیتے ہو اور وہ کام دوسرے کے سر ڈالدیتے ہو کیوں نا؟

ی م۔ اونھ، بیکار مجھے پریشان نہ کرو تم تو گھنٹی بھی نہیں بجاتے بلکہ تمہاری بیوی کی خوبصورت انگلیاں وہاں تیل ہیں ہی لگی رہتی ہیں اور تم خود یہاں نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھے ہوئے لکچر دیتے رہتے ہو۔ لکچر ہی لکچر۔ شیطان کی آنت لکچر۔ الفاظ، الفاظ، الفاظ!

ب۔ (اس جواب سے بے انتہا مسرور ہوتے ہوئے) ہا ہا یہ بات کی، بہت عمدہ (خوشی سے چلتے ہوئے) کہو جیمس! اب تم کیسے پھنسے!

(کینڈڈا اندر آ جاتی ہے آگے پیش بند خوب صاف لگا ہوا ہے۔ پڑھنے والا لیمپ خوب صاف کیا ہوا ہو تی کٹی ہوئی لیمپ تیل سے پر میز پر بارل کے نزدیک وہ اسے رکھ دیتی ہے تاکہ اسے جلائے)

ک (اپنی انگلیوں کی پوروں اپنی ناک صاف کرتے ہوئے) یوجین: اگر تم رکو تو میں تمہیں تمام لیمپ سپرد کر دوں

ی م۔ میں یہاں صرف اسی شرط سے رک سکتا ہوں کہ تمام بھدے کام تم میرے سپرد کر دو۔

ک۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے، شاباش! لیکن پہلے میں دیکھ تو لوں کہ تم کیسے کام کرتے ہو (ارل کی طرف رخ کر کے) جیمس! تم نے گھر کا انتظام میری غیر موجودگی میں کچھ اچھا نہیں رکھا۔

م۔ کیوں، ڈیر کیا میں نے نہیں کیا، کیا بات نہیں ہوئی؟

ک۔ (یچ یچ کی پریشانی سے) میرے ذاتی پسندیدہ برش سے جوتے صاف کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ (ی م کے منھ سے ایک سخت آہ نکلتی ہے۔ برگیس گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ ک صوفے کی طرف دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے، کیا تمہاری طبیعت اس وقت ناساز ہے۔ کیا تم کچھ علیل ہو؟

ی م۔ نہیں۔ کچھ بیمار نہیں، صرف دہشت، دہشت، دہشت (وہ اپنا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ لیتا ہے)

ب۔ (مضطرب ہو کر) کیا کوئی دورہ ہوا مسٹر ی م۔ یہ بہت برا ہے آپ کی سی عمر پر کسی طرح اس سے ضرور نجات حاصل کیجئے۔

ک۔ (اطمینان دلانے کے لئے) اونھ پاپا! آپ کی بھی کیا باتیں ہیں، یہ محض شاعرانہ دورہ ہے کیوں نا یوجین؟

لاسے سہلاتے ہوئے)

ب۔ (شرمندہ ہوکر) آئیں: شاعرانہ دورہ؟ اچھا: میں معافی چاہتا ہوں مسٹر یوجین (اپنا منہ پیرا تشدان کی طرف کرلیتا ہے اور اپنی جلد بازی پر متاسف ہے)

ک۔ کیا بات ہوئی یوجین؟ میرا برش: (وہ کانپ جاتا ہے) اونھ تو اس میں کیا بات ہے (اس کے قریب بیٹھ جاتی ہے) کیا تم اسے پسند نہ کروگے کہ تم ایک نہایت اچھا سا برش بہت خوبصورت پیش کرو جس کی پشت ہاتھی دانت کی ہو اور جس میں سیپ جڑی ہو۔

ی م۔ (آہستگی اور ترنم سے لیکن افسوسناک لہجہ میں) نہیں برش نہیں بلکہ ایک کشتی۔ ایک چھوٹی سی کشتی جس میں ہم تم دونوں بیٹھ کر اس دنیا سے الگ کوسوں دور چلے جائیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں شفاف سنگ مرمر کی چٹانیں ہوں جن کو باران رحمت سے غسل دیا جاتا ہو اور جنھیں نیر درخشاں سکھاتا ہو۔ جہاں کے مخملیں سبزہ زاروں کی صفائی نسیم سحری کرتی ہو۔ یا پھر ایک ایسا تخت رواں ہو جس پہ ہم تم دونوں بیٹھ کر آسمان کی طرف اڑ جائیں جہاں کے ستارے ہمارے لیمپ ہوں گے اور جن کو روزانہ مٹی کے تیل سے بھرنے کی ضرورت نہ ہوگی

م۔ (ترشی سے) اور جہاں کچھ کرنا نہ ہوگا سوائے اس کے کہ کاہل، خود غرض اور بیکار بنے بیٹھے رہو۔

ک۔ اونھ جیمس، تم نے اس کی شاعری کو کیوں تباہ کردیا۔

ی م۔ (آتش بجاں) ہاں، کاہل خود غرض اور بیکار: یعنی خوبصورت آزاد اور خوش: کیا ہر شخص یہ باتیں اپنے دل و جان سے نہیں چاہتا اُس عورت کے ساتھ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ میری معراج تخیل تو یہی ہے تمہاری کیا ہے؟ اور تمہارے جیسے ان تمام لوگوں کی جو ان بھدے بدصورت مکانوں کی قطاروں میں رہتے ہیں؟ لکچر، وعظ اور برش! تمہارا معراج تخیل تو بس یہی ہے کہ تم وعظ دیا کرو اور تمہاری بیوی جھاڑو دیا کرے!

ک۔ (متانت سے) یوجین! وہ بھی اپنے جوتے خود صاف کرتا ہے اور اس الزام کے بدلے کل تم کو انھیں صاف کرنا پڑے گا۔

ی م۔ اونھ! جوتوں کی باتیں نہ کرو، تمہارے مرمریں پیر پہاڑوں پر بھی خوبصورت معلوم ہوں گے۔

ک۔ لیکن میرے پیر بیکنی روڈ پر بغیر جوتوں کے خوبصورت نہ معلوم ہوں گے۔

ب۔ (یوجین کے خلاف باتیں سن کر) ارے کینڈی یہ کیا خلاف تہذیب باتیں کر رہی ہو۔ مسٹر یوجین اس قسم کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں تم پھر انھیں پریشان کر رہی ہو مجھے ڈر ہے کہ پھر انھیں دہشت کا دورہ ہو جائے میرا مطلب ہے شاعرانہ دورہ!

(ماریل خاموش ہے۔ بظاہر وہ اپنے خطوں میں مشغول ہے لیکن درحقیقت وہ اس ادھیڑبن میں ہے کہ اس کے مضبوط سے مضبوط اور پختہ سے پختہ جملے اس چھوکرے کے سامنے بیکار جا رہے ہیں چنانچہ ایسے شخص سے خوفزدہ ہونے کے خیال سے جس کو وہ اپنا چھوٹا سمجھتا تھا تکلیف ہونے لگتی ہے۔ مس گارنٹ ایک تار لیکر اندر آتی ہے)

پ۔ (ماریل کو تار حوالہ کرتے ہوئے) جوابی ہے۔ باہر ڈاکیہ جواب کے لئے کھڑا ہے (اپنی مشین پر جا کر بیٹھ جاتی ہے

ک سے) مسز ماریل! میرا یا باورچی خانہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہے (ک اٹھ کھڑی ہوتی ہے) پیاز آگئے ہیں

ی م۔ (لرزتے ہوئے) پیاز!

ک۔ ہاں پیاز! اور وہ بھی کچھ اچھے قسم کے ہسپانوی پیاز نہیں معمولی چھوٹے قسم کے امید ہے کہ تم ان کے چھیلنے میں مجھے مدد دو گے اچھا ادھر آؤ۔

(وہ اس کی کلائی پکڑتی ہے اور دوڑاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ برگیس متوحش اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور آتشدان کے پاس مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کی طرف تکتے ہوئے)

ب۔ کینڈی کو نہ چاہئے تھا کہ ایک نواب زادے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے۔ یہ بہت زیادتی ہے۔ جیمس دیکھو تو کیا تم نے اس سے پیشتر اس طرح کی تعجب انگیز بات دیکھی ہے؟

م۔ (تار لکھنے میں مصروف ہے) مجھے نہیں معلوم

ب۔ (دردمندی سے) اس کی باتیں بڑی پیاری ہیں۔ مجھ کو شاعری تو ہمیشہ سے پسند رہی۔ کینڈی بھی مجھ ہی کو پڑی ہے جب کوئی اتنی ہوگی (ہاتھ کو دو تین فٹ اونچا کرتے ہوئے) تو مجھ سے کہانیاں کہلوایا کرتی تھی۔

م۔ (مشغول) اچھا! خوب (تار پر جاذب لگاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

پ۔ لیکن کیا تم وہ کہانیاں خود اپنے دماغ سے سوچ کر نکالتے تھے ؟

(برگیس اسے جواب دینا حقیرات سمجھتے ہوئے نہایت نجرانہ حقارت کا رویہ اختیار کر لیتا ہے)

پ۔ (آہستگی سے) میرا خیال ہے تم ایسا کر ہی نہیں سکے۔ خیر بر سبیل تذکرہ میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ آپ پوجین کی اس قدر پرستش کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ پاگل ہے

ب۔ پاگل! کیا وہ بھی!!

پ۔ بالکل پاگل! بالکل مارچ کے مست خرگوش کی طرح۔ میں بتلاتی ہوں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ تمہارے آنے سے قبل اس نے مجھے بے انتہا ڈرا دیا تھا۔ کیا تم نے ان تمام عجیب باتوں کا خیال نہیں کیا جو وہ بکتا رہتا ہے۔

ب۔ اچھا تو شاعرانہ دورے کا یہی مطلب ہے۔ در اصل یقین مانناکہ اکثر ایک دو دفعہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ کچھ پاگل سا ہے (وہ دروازہ تک ٹہلتا، سوچتا ہوا جاتا ہے۔ بہ آواز بلند) در اصل یہ اچھا سا پاگل خانہ ہے جہاں سوائے تمہارے کسی کی کوئی خبر لینے والا بھی نہیں ہے

پ۔ (جب وہ اس کے پاس سے گذرتا ہے) ہاں، اگر خدا نخواستہ آپ پر کسی قسم کا حادثہ ہو گیا تو کس قدر باعث افسوس بات ہوگی۔

ب۔ (بڑے پن سے) خیر و مجھ پر، میرے اوپر آپ کسی قسم کے حملے نہ کیجیئے۔ ذرا میں باغیچہ میں سگار پینے جا رہا ہوں اپنے مالک سے کہدینا۔

پ۔ (چڑاتے ہوئے) آخاہ!

(لیکن قبل اس کے کہ برگیس کوئی جواب دے، مارل واپس آجاتا ہے)

ب۔ (کمزور لہجہ میں) اجنبیں، میں ذرا باغ میں سگار پینے جا رہا ہوں۔

م۔ (تیزی سے) ہاں، ہاں ضرور! (ایک تھکے ہوئے بڈھے کی طرح برگیس باہر چلا جاتا ہے۔ مارل میز پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے اخبارات کو الٹتے پلٹتے پراز رہائن سے کچھ تفریح کے لہجہ میں اور کچھ یونہی مخاطب ہوتا ہے) مس پراز ری تم نے آخر میرے خسر کے نام کیوں لکھے ؟

پ۔ (چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔ تیزی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ کچھ ڈر کچھ افسوس کا اظہار) میں! (رو پڑی)

م۔ (ہمدردانہ مسرت سے اس کی طرف رخ کرکے میز پہ جھکتے ہوئے اور تسکین دیتے ہوئے) ارے ہوگا، ہوگا جانے بھی دو، میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ پراسی! وہ واقعی کھوسٹ، گدھا تو ہے ہی کیوں نا!

(رونے کی ایک ہچکی آئی اور وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ زور سے دروازہ بند کیا اور باہر غائب ہوگئی)

ماریل نے اپنا سر ہلایا گویا افسوس کیا اور بادل ناخواستہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا جیسے بہت تھکا ہوا ہو اور ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہو۔ کینڈڈا اندر آتی ہے۔ اس نے گھر کا سب کام کاج ختم کر دیا ہے۔ پیش بند اب اتر گیا ہے ماریل کی تھکی ہوئی حالت کو فوراً محسوس کرتی ہے اور نہایت خاموشی سے آکر مہمانوں والی کرسی کے نزدیک کھڑی ہو جاتی ہے اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگتی ہے منہ سے کچھ نہیں بولتی)

م۔ (اوپر نظر اٹھاتے ہوئے لیکن قلم اب بھی انگلیوں میں ہے گویا لکھنے کے لئے اب بھی تیار رہے) کیا ہے؟ یوجین کہاں ہے؟

ک۔ نل پر اپنے ہاتھ دھو رہا ہے۔ وہ بڑا اچھا باورچی ہو سکتا ہے لیکن ابھی میریا سے ڈرتا ہے۔

م۔ (مختصراً) اچھا! ہاں، بیشک (پھر لکھنا شروع کر دیتا ہے)

ک۔ (اس کے قریب جاتے ہوئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ آہستہ سے رکھ کر اسے روکتے ہوئے) بس اب ادھر آؤ ڈیر، ذرا میں تمہیں دیکھوں تو (وہ اپنا قلم چھوڑ دیتا ہے اور خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اسے اٹھاتی ہے اور میز سے کچھ اُدھر لے جاتی ہے، برابر تنقیدی نظر سے اس کی طرف دیکھے جاتی ہے) ذرا اپنا چہرہ روشنی کی طرف تو کرو۔ (وہ اسے کھڑکی کے رخ کھڑا کر دیتی ہے) اوہ! میرا پیارا آج کچھ ٹھیک نہیں۔ اس نے آج حد سے زیادہ کام کر لیا ہے۔

م۔ نہیں تو وہی حسب معمول روزانہ کے اتنا۔

ک۔ نہیں اس کا چہرہ آج زرد ہے۔ مرجھایا ہوا۔ تھکا ہوا۔ بوڑھوں کا سا۔ (ماریل کی اداسی اور گہری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جملوں کو اور بھی تیز کر دیتی ہے) ادھر آنا (اس کو آرام کرسی کی طرف کھینچتے ہوئے) بس اب آج کا کام تم بہت کر چکے۔ بس اب ختم کرو۔ بقیہ پراز ہی ختم کر دے گی۔ اب ذرا مجھ سے باتیں کرو۔

م۔ لیکن ـــ

ک۔ نہیں (ضد کرتے ہوئے) میری طبیعت باتیں کرنے کو چاہتی ہے (وہ اسے بٹھا دیتی ہے اور خود بھی قالین پر نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے) اں بس اب (اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے) تم اچھے لگنے لگے ہو۔ یہ آخر میں کہتی ہوں کہ تم ہر روز رات کو وعظ و لکچر دینے کیوں چلے جاتے ہو؟ مجھے مشکل سے ایک ہفتہ میں ایک شام مل پاتی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ بالکل ٹھیک ہے اور بہت نیک کام لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یعنی وہ لوگ جن سے تم یہ سب باتیں کرتے ہو ذرا بھی تو تمہاری باتوں کو خیال میں نہیں لاتے تمہاری بات وہ مان لیتے ہیں لیکن ان کے ماننے سے کیا فائدہ۔ جب وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے بلکہ ادھر تمہاری سنتے ہیں اور مان لیتے ہیں اور ادھر تھوڑی ہی دیر بعد جہاں تمہاری پیٹھ پھری بالکل اس کے خلاف کرنے لگتے ہیں۔ تم اپنے سینٹ ڈومینک ہی کے لوگوں کو دیکھو! آخر وہ مذہب کی باتیں کیوں ہر اتوار کو سننے آتے ہیں؟ محض اسی لئے کہ ہفتہ کے چھ دنوں میں وہ روپیہ اور کاروبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک دن چاہتے ہیں کہ یہ سب باتیں بھول جائیں اور ایک روز کم سے کم آرام کرلیں۔ تو بس سمجھے وہ اسی آرام کے لئے آتے ہیں تاکہ تر و تازہ ہو کر پھر اور دھڑتے سے روپیہ پیسہ پیدا کریں۔ گویا اس طرح روکنے کی بجائے تم انھیں اور سگ دنیا بناتے ہو۔

م۔ (پر زور سنجیدگی سے) کینڈ ڈا تم جانتی ہو کہ اکثر میں ان کو اس امر پر زور دار فہمائش بھی تو کر دیا کرتا ہوں۔ لیکن اگر وہ محض تفریح ہی کے لئے آتے تو اور بھی جگہیں ان کے لئے کھلی تھیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف! آخر کوئی بات تو ہوگی کہ وہ سینٹ ڈومینک ہی کو اتوار کے دن دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ک۔ نہیں، خراب جگہیں اس دن کھلی نہیں ہوتیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تو بھی وہ نہیں چاہتے کہ انھیں کوئی ان مقامات پر دیکھے۔ اس کے علاوہ جیمس پیارے تم وعظ اس عمدہ طریقہ سے دیتے ہو کہ وہ ان کے لئے اتنی ہی تفریح کا باعث ہوتا ہے جتنا کوئی کھیل تماشا۔ اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ عورتیں تمہارا وعظ سننے اس قدر جوق جوق کیوں آتی ہیں؟

م۔ (گھبرا کر) کینڈ ڈا!

ک۔ ہاں مجھے معلوم ہے، سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب تمہاری سوشلزم اور مذہب کی وجہ سے ہے! اگر ایسا ہوتا تو بجائے تمہیں بار بار دیکھنے آنے کے وہ اس پر عمل کرتیں جو تم ایک دفعہ کہہ دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو پراسی والی شکایت ہے۔

م۔ پراسی والی شکایت! کیا مطلب ہے تمہارا کینڈڈا؟

ک۔ ہاں، پراسی اور ان تمام سکریٹریوں کو جنھیں تم ملازم رکھ چکے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ پراسی اتنا سب کام ہم لوگوں کا کر دیتی ہے آخر کس لئے؟ آلو چھیلتی ہے۔ چیزیں صاف کرتی ہے اور تمام ادنی کام کر دیتی ہے محض چھ شلنگ فی ہفتہ پر۔ حالانکہ شہر میں وہ اس سے زیادہ پاتی تھی جبیں قصہ اصل میں یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا کام کر دیتی ہے۔ اسی طرح لکچر سننے والی تمام عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں اور تم کو اپنے وعظ سے محبت ہے کیونکہ تم اسے نہایت خوبصورتی سے ادا کرتے ہو۔ میرے سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب ان کا یہ اشتیاق تمہارے نظریہ ربانی بادشاہت کی وجہ سے ہے۔ ہاں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اسی میں یقین کرنے لگتی ہیں۔ سمجھے میرے نادان۔

م۔ کینڈڈا کیا خوفناک باتیں کر رہی ہو! کس قدر روح فرسا! مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟ یا یہ تو نہیں ہے کہ شاید تم کو حسد ہوتا ہو۔

ک۔ (عجیب طرح سوچتے ہوئے) ہاں مجھ کو واقعی بعض اوقات تھوڑا سا حسد ہوتا ہے۔

م۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) پراسی سے؟

ک۔ (ہنستے ہوئے) ارے نہیں، نہیں نہیں! اسی خاص شخص سے نہیں بلکہ کسی اور شخص کی طرف سے حسد ہوتا ہے جس سے کہ اتنی محبت نہیں کی جاتی جتنی کہ اس سے کی جانا چاہئے۔

م۔ میرے متعلق؟

ک۔ تمہارے متعلق: نہیں (تم تو بلکہ محبت اور پرستش سے خراب کر دئے گئے ہو۔ تمہیں تو محبت اتنی ملتی ہے جتنی تمہارے لئے مفید نہیں۔ میرا مطلب یوجین سے ہے۔

م۔ (چونک کر) یوجین!

ک۔ یہ ناانصافی معلوم ہوتی ہے کہ سب محبت صرف تمہاری طرف چلی جائے اور اسے کچھ نہ ملے۔ حالانکہ اسے تم سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے (ماریل کے بدن میں باوجود ضبط کے بھی ایک کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے؟ کیا میری باتوں سے تم کچھ پریشان ہو رہے ہو؟

م۔ (جلدی سے) نہیں بالکل نہیں۔ (اس کی طرف تکلیف دہ جوش سے دیکھتے ہوئے) تم جانتی ہو کہ مجھے تم پر بالکل اعتماد ہے کینڈڈا۔

ک۔ اللہ رے غرور! کیا تم کو اپنی کششوں پر اس قدر ناز ہے؟

م۔ کینڈڈا تم مجھ کو سخت تکلیف دے رہی ہو۔ میں نے اپنی کششوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔ مجھے ہمیشہ تمہاری نیکی، محبت اور عفت و عصمت کا خیال البتہ رہا ہے اور اسی میں مجھے اعتماد رہا ہے اور رہتا ہے۔

ک۔ اونھ مجھ سے یہ کیا فضول کی باتیں کرتے ہو! تم بس پادری ہی ہو۔ پورے پادری۔

م۔ (اس کی طرف منہ پھیر کر دلی تکلیف سے) یہی یوجین بھی کہتا ہے۔

ک۔ (نہایت اشتیاق سے موریل کی طرف جھکتے ہوئے، اس کے گھٹنوں پر دونوں بازو رکھ کر) یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ وہ نہایت عجیب و غریب لڑکا ہے۔ جتنے عرصہ میں باہر رہی میرا اشتیاق اس کی طرف بہت بڑھتا ہی گیا۔ تمہیں معلوم ہے جیمس، حالانکہ وہ خود نہیں جانتا لیکن وہ مجھ پر عاشق ہو جانے کے لئے بری طرح تیار رہے؟

م۔ (سنجیدگی سے) اچھا! لیکن اسے خود نہیں معلوم کیا واقعی؟

ک۔ بالکل نہیں! (وہ اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر سے ہٹا لیتی ہے اور انھیں اپنی گود میں رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے) لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ اسے معلوم ہو جائے گا یعنی جب وہ بڑا ہو جائے گا اور تمہاری طرح تجربہ کار۔ اور تب اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ضرور یہ جانتی ہوں گی۔ میں کہتی ہوں کہ تب وہ میرے متعلق کیا خیال کرے گا؟

م۔ کوئی خاص بات نہیں۔ وہ تمہیں برا ہرگز نہ خیال کرے گا۔

ک۔ (شک سے) یہ دوسری بات پر منحصر ہے۔

م۔ (گھبرا کر) کیا انحصار؟

ک۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں۔ ہاں! اس بات کا انحصار تو اس بات پر ہوگا کہ اس پر کیا گذرتی ہے (وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اس بات کو کیسے جانتا ہے کہ دراصل عشق کیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس عورت پر منحصر ہے جو اُس کو عشق سکھائے۔

م۔ (بالکل نہ سمجھتے ہوئے) ہاں نہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

ک۔ (سمجھاتے ہوئے) اگر اس نے عشق کسی اچھی عورت سے سیکھا تب تو ٹھیک ہے۔ پھر وہ مجھے معاف کر دے گا

م۔ معاف؟

ک۔ لیکن اگر فرض کرو کہ اس نے عشق کسی خراب قسم کی عورت سے سیکھا جس طرح عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں خصوصاً شاعر قسم کے لوگ جو ہر عورت کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ فرض کرو اگر محبت کی قدر اسے اُس وقت معلوم ہوئی جب وہ اسے برباد کر چکا ہو اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر خود کو تباہ کر لیا ہو تب بھی کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟

م۔ معاف! ارے بھئی کس بات پر تمہیں معاف کر دے گا؟

ک۔ (محسوس کرتے ہوئے کہ وہ کس قدر بیوقوف ہے اور کچھ ناامید ہو کر پھر بھی نہایت ہمدردانہ لہجہ میں) ارے کیا تم نہیں سمجھے؟ (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے۔ وہ اس کی طرف پھر مڑ جاتی ہے اور نہایت ہی محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ کیا مجھے وہ اس بات پر معاف کر دے گا کہ میں نے خود اسے کیوں نہیں سکھایا اور اپنی نیکی، عفت و عصمت اور پاکی کی وجہ سے جیسا کہ تم کہتے ہو خراب قسم کی عورتوں پر اسے چھوڑ دیا جیسے تم میری اچھائی اور پاکدامنی کی باتیں کرتے ہو کس قدر ناسمجھی کی بات ہے۔ میں ان دونوں چیزوں کو بخوشی یوجین کو دیدیتی اگر کوئی بات مانع نہ ہوتی بالکل اسی طرح جس طرح میں کسی غریب محتاج فقیر کو جو سردی سے مر رہا ہوتا اپنا دوشالہ دیدیتی جیسے تم اپنے لئے میری محبت پر یقین رکھو کیونکہ اگر یہ اعتبار تمہارا میری طرف سے جاتا رہا تو پھر ان خطبا رتا اور دعظوں میں قطعی مجھے دلچسپی نہ رہے گی محض لفظی گورکھ دھندے جن سے تم ہر روز خود کو نیز دوسروں کو دھوکا دیا کرتے ہو۔ (اتنا کہکر وہ اٹھنے کو ہوتی ہے)

م۔ اُس کے الفاظ!

ک۔ (اُٹھتے ہوئے رک کر) کس کے الفاظ؟

م۔ یوجین کے!

ک۔ (خوش ہوکر) وہ ہمیشہ سچی بات کہتا ہے۔ وہ تم کو، مجھ کو اور پراسی سب کو خوب اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے لیکن پیارے تم کچھ نہیں سمجھتے (ہلنے لگتی ہے اور دلداری کے لئے اس کا منہ چوم لیتی ہے، وہ منہ ہٹا لیتا ہے گویا جیسے کوئی چیز بھونک دی گئی ہو اور اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

م۔ آخر، یہ تم نے پیار کس طرح کر لیا۔ اُف کینڈڈا (تکلیف سے) بہتر یہ تھا کہ تم میرے دل میں پگھلتا ہوا لوہا ڈال دیتیں بجائے اس طرح پیار کرنے کے۔

ک۔ (متعجب ہوکر) پیارے میرے۔ کیا بات کیا ہوئی؟

م۔ (مجنونانہ طریقے سے ہٹاتے ہوئے) مجھے نہ چھوؤ۔ مجھ سے الگ رہو۔

ک۔ جیمس!!!

(اتنے میں یوجین اور برگیس اندر داخل ہوتے ہیں لیکن دروازہ کے قریب ہی رک جاتے ہیں ہکا بکا)

ی م۔ کیا کوئی بات ہو گئی؟

م۔ (ایک دم سفید لیکن طبیعت پر فولادی قابو رکھتے ہوئے) نہیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آج صبح یا تو تمہاری باتیں سب صحیح تھیں یا کینڈڈا پاگل ہو گئی ہے۔

ب۔ (بہت ہی زور سے) کیا! کینڈی بھی پاگل ہا! ارے، ارے، ارے (وہ گذرتا ہوا، بڑبڑاتا، آتشدان کے پاس چلا جاتا ہے اور اپنے پائپ کی راکھ آتشدان کے سیخچوں پر جھاڑنے لگتا ہے)

(مارل تنگ آکر اپنی میز پر بیٹھ جاتا ہے آگے کو جھک کر تاکہ اپنے چہرے کو چھپالے۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیتا ہے تاکہ مستحکم رہیں)

ک۔ (جیمس سے مطمئن ہو کر اور ہنستے ہوئے) تم کو محض میری بات کا صدمہ ہوا ہے کیوں نا؟ تم سب غیر رتبی لوگ بھی کس قدر رتبی ہوتے ہو! (نہایت خوشی سے کرسی کے ہتھے پر بیٹھ جاتی ہے)

ب ۔ کینڈی: ذرا سنبھل کر باتیں کرو۔ آخر مسٹر یوجین تیری نسبت کیا خیال کریں گے۔

ک ۔ جیمس نے مجھے ہمیشہ اپنے متعلق خود غور و فکر کرنا سکھایا ہے اور یہ بھی کہ کبھی اس بات سے نہ ڈروں کہ دوسرے میری نسبت کیا خیال کرتے ہیں۔ اور یہ اس وقت تک ٹھیک رہتا ہے جب تک میں بالکل اس کے خیالات کے مطابق سوچتی رہوں لیکن دیکھو میں نے ذرا سی مختلف سوچا تھا کہ صورت دیکھ لو۔ ذرا دیکھو تو حالت! (وہ جیمس کی طرف بڑی خوش طبعی سے اشارہ کرتی ہے)

(یوجین دیکھتا ہے اور فوراً اپنے ہاتھ سے اپنا دل تھام لیتا ہے گویا ایک دم ٹیس اٹھی ہو۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورت سے جیسے کوئی المیہ سین دیکھ رہا ہو)

ب ۔ (آتشدان کے پاس سے) جیمس آج تم قدرے سست نظر آ رہے ہو۔ روز کے سے چست نہیں۔

م ۔ (ایک ہلکے قہقہہ کی کوشش کرتے ہوئے حالانکہ وہ قہقہہ رونے کی ہچکی معلوم ہوتا ہے) نہیں تو میرا خیال تو ایسا نہیں خیر مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھے اس کا احساس نہ ہوا کہ آپ صاحبان کو تکلیف دے رہا ہوں (خود کو سنبھالتے ہوئے) خیر خیر۔ خیر۔ خیر خیر! (نہایت مضبوط ارادے کے ساتھ بظاہر خوش ہو کر وہ اپنے کاغذات لیکر پھر بیٹھ جاتا ہے)

ک ۔ (صوفے کے پاس جاتے ہوئے اور یوجین کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ اب بھی اسی مذاق اور تمسخر کی حالت میں) یوجین کیوں تم اس قدر افسردہ کیوں ہو۔ کیا پیاز چھیلنے سے آنسو نکل آئے؟

ی م ۔ (چپکے سے) یہ تمہارا ظلم ہے اور ظلم سے مجھے نفرت ہے۔ میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ ایک شخص دوسرے کو اتنی تکلیف دے۔

ک ۔ (اس پر طنز سے دست شفقت پھیرتے ہوئے) بیچارے! کیا میں نے واقعی ظلم کیا؟ کہ ان چھوٹے سرخ پیازوں کو تم سے ترشوایا؟

ی م ۔ (سنجیدگی سے) اونہہ! یہ بات نہیں، یہ نہیں میرا مطلب اپنی ذات سے نہیں مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے بے انتہا تکلیف دی ہے۔ اس کے درد اور اس کی تکلیف کو میں خود اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری خطا نہیں یہ ایک بات تھی جو آخر کبھی نہ کبھی تو ضرور ہو کر رہتی لیکن اس کا مذاق نہ اڑانا چاہیئے، نہ اس کو یوں ہلکا سا کر ہنسی میں اڑانا چاہیئے میں کانپ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ تم اس کو یوں

اورس قدر اذیت دیتی ہو اور اس پر ہنستی ہو۔

ک۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) میں اور جیمس کو اذیت پہونچاؤں! کیا فضول کی باتیں کرتے ہو یوجین۔ تم کس قدر مبالغہ سے کام لے رہے ہو بیوقوف (وہ اٹھتی ہے اور میز کی طرف جاتی ہے کچھ متفکر اور قدرے پریشان ہو کر) بس اب زیادہ کام نہ کرو پیارے ذرا آؤ ادھر ہم لوگوں سے باتیں کرو۔

م۔ (محبت سے لیکن تلخ لہجہ میں) نہیں نہیں میں بات چیت کر ہی نہیں سکتا۔ میں تو صرف وعظ دے سکتا ہوں۔

ک۔ (اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے) اچھا خیر! آؤ وعظ ہی دو

ب۔ (شدت سے انکار کرتے ہوئے) نہیں کینڈی، ہٹاؤ بھی وعظ وغیرہ۔

(لیکسی مل گھبرایا ہوا اندر آتا ہے صورت سے معلوم ہوتا ہے کسی اہم کام کے لئے آیا ہے)

ل۔ (کینڈڈا سے بعجلت ہاتھ ملاتے ہوئے) مزاج تو اچھا ہے مسز مارل۔ آپ کی واپسی سے بے حد مسرت ہوئی۔

ک۔ شکریہ لیکسی۔ یوجین کو تم جانتے ہو گے؟

ل۔ ہاں! ہاں! کیسا مزاج ہے آپ کا مسٹر یوجین؟

ی م۔ بالکل اچھا ہوں شکریہ۔

ل۔ (مارل سے) میں ابھی سینٹ میتھو انجمن (گیلڈ) سے چلا آرہا ہوں۔ وہ لوگ آپ کے تار کی وجہ سے نہایت شش و پنج میں ہیں۔

ک۔ جیمس! تم نے آخر کا ہے کے متعلق تار دیا؟

ل۔ کینڈڈا سے) آج آپ کا ان لوگوں کے وہاں وعظ تھا اور چنانچہ انھوں نے میر اسٹریٹ میں ایک بڑا سا ہال لے رکھا تھا اشتہار وغیرہ میں بیحد روپیہ خرچ کیا تھا لیکن عین وقت پر آپ کا تار پہونچا کہ آپ نہ آسکینگے ان لوگوں پر تو گویا بجلی ہی گر پڑی۔ سب کیا کرایا بس خاک میں ملا جا رہا ہے۔

ک۔ (متعجب و پریشان ہو کر) جیمس کو کچھ ہو گیا ہے؟ کیا لکچر کا وعدہ۔ اور توڑ دیا!

ب۔ میرے خیال میں تو اس کی زندگی میں یہ پہلا ایسا واقعہ ہے۔ بلکہ میں اس پر شرط لگا سکتا ہوں کیوں نا کینڈی؟

ل۔ (مارل سے) ان لوگوں نے آپ کو ایک جوابی تار دیا تھا کہ کیا آپ اپنا ارادہ بدل نہیں سکتے۔ کیا آپ کو وہ تار ملا تھا؟

م۔ (بے چینی کو ضبط کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مجھے مل گیا تھا۔

ل۔ وہ جوابی تھا۔

م۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے اس کا جواب دے دیا کہ میں نہیں آسکتا۔

ک۔ لیکن کیوں جیمس! کیوں۔ آخر یہ کس لئے؟

م۔ (قریب قریب غضب ناک ہوکر) اس لئے کہ میں نہیں چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا میں کوئی بولنے والی مشین ہوں جو ہر شام کو ان کی تفریح کے لئے چلا دی جایا کرے یعنی آخر کیا میں ایک شام بھی اپنی بیوی، اپنے دوستوں کے ساتھ نہ گذار سکوں۔ آخر مطلب کیا ہے؟

(سب کو اس تقریر سے تعجب ہوتا ہے لیکن یوجین پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا ہے)

ک۔ جیمس تم کو ہرگز اس بات کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے جو میں نے کہی تھی اور دیکھو اگر تم آج نہ جاؤ گے تو کل تمہارا ضمیر اس پر ملامت کرے گا۔

ل۔ (سہما ہوا لیکن بات اہم ہے) ہاں صاحب، یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ آپ پر بیجا اور نازیبا بار ڈال دیتے ہیں لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیچارے ہر جگہ تاریخ بھیج چکے ہیں اور ان بیچاروں کو دوسرا واعظ دستیاب نہیں ہو رہا ہے سوائے لااوری کلیسا کے صدر کے۔

م۔ (جلدی سے) ہاں وہ تو بہت عمدہ آدمی ہیں بس اس سے بڑھ کر انھیں کیا چاہئے؟

ل۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سوشلزم اور عیسائیت کو جدا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس طرح جو کچھ اب تک ہم لوگوں نے کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ تو خیر آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں (اپنے شانے ہلاتا ہے اور آتشدان پر برگیس کے پاس چلا جاتا ہے)

ک۔ (مناتے ہوئے) جاؤ ضرور جیمس ضرور۔ ہم سب بھی چلیں گے۔

ب۔ (بڑبڑاتے ہوئے) دیکھو کینڈی! میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو تو یہیں گھر میں آگ کے قریب نہایت اطمینان سے ٹھہرنا چاہئے۔ اس کو بس دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

ک۔ نہیں وہاں جلسے میں بھی آپ کو اسی قدر آرام ملے گا جتنا کہ یہاں ہم سب لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھیں گے

اور گویا بڑے آدمی ہو جائیں گے۔

ی م۔ (سہم کر) نہیں نہیں بھئی ہم لوگ پلیٹ فارم پر نہیں جائیں گے۔ وہاں سب کی نظریں ہماری طرف اٹھیں گی میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ میں پیچھے کے کمرے میں بیٹھوں گا۔

ک۔ ذرا دوست، وہ سب لوگ جمیس کی طرف دیکھنے میں اس قدر مشغول ہوں گے کہ کوئی تمہاری طرف خیال بھی نہ کرے گا۔

م۔ پراسی والی شکایت! کیوں کینڈڈا؟

ک۔ (بشاش ہو کر) ہاں پراسی والی شکایت!

ب۔ (پریشان ہو کر) پراسی والی شکایت! جمیس کیا مطلب ہے تمہارا؟

م۔ (اس کی طرف کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اٹھتا ہے دروازہ تک جاتا ہے اسے کھولتا ہے اور تحکمانہ لہجہ میں پکارتا ہے) مس گارنٹ!

پ۔ (دور پر) جی! مسٹر ماریل حاضر ہوئی۔

(سب لوگ انتظار کرتے ہیں سوائے برگیس کے جو نہایت آہستہ سے لیکسی کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ب۔ ادھر سنو! مسٹر ل۔ پراسی والی شکایت کیا چیز ہے؟ آخر وہ کیا بیمار ہے؟

ل۔ (رازدارانہ طور سے) حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے لیکن آج صبح اس نے مجھ سے اس عجیب و غریب طرز سے گفتگو کی تھی کہ میرا خیال ہے اُس کے دماغ میں کچھ فتور کبھی کبھی آ جاتا ہے۔

ب۔ (گھبرا کر) خوب! پھر تو یہ مرض متعدی معلوم ہوتا ہے ایک گھر میں چار چار!

پ۔ (دروازہ پر آتے ہوئے) کیا بات ہے مسٹر ماریل؟

م۔ انجمن سینٹ میتھو کو تار دے دو کہ میں آ رہا ہوں۔

پ۔ (تعجب سے) مگر وہ لوگ تو آپ کا خود انتظار کر رہے ہوں گے۔

م۔ (تحکمانہ) جو کچھ کہتا ہوں وہ کرو۔

(پراز رہا اُن سہم کر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے اور تعمیل حکم کرتی ہے۔ ماریل اب بے حد مستعد اور پر جوش ہے۔ برگیس کے پاس جاتا ہے۔ کینڈڈا اس کی حرکات کو بہت تعجب اور بے چینی سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے)

م۔ برگیس تم تو انہیں چاہتے ہو؟

ب۔ نہیں جمیس اس طرح نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آج اتوار تو ہے نہیں کہ فرصت کامل ہو۔

م۔ مجھے بہت افسوس ہے خیال تھا کہ تم اگر چلو گے۔ تو میں وہاں کے صدر سے تمہاری ملاقات کرا سکوں گا۔ وہ ضلع کونسل ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی ہے اور ٹھیکے کے معاملات میں بہت کچھ اثر رکھتا ہے (برگیس ایکدم چونک پڑتا ہے) کیا پھر چلو گے نہیں؟

ب۔ (جوش سے) ہاں، ہاں ضرور چلوں گا جمیس تم وعظ بھی خوب دیتے ہو۔ واقعی تمہارا وعظ ہمیشہ عمدہ ہوتا ہے۔

م۔ (براؤنی کی طرف گھومتے ہوئے) مس گارنٹ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں پر کچھ نوٹس لکھ لو۔ اگر تمہیں کوئی اور کام نہ ہو تو چلو (وہ سر ہلاتی ہے اور ڈر کی وجہ سے بول نہیں سکتی) لیکسی تم تو آہی رہے ہو جہاں تک میرا خیال ہے؟

ک۔ جمیس ہم سب لوگ چل رہے ہیں۔

م۔ نہیں، تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یوجین کی تم کو یہیں رہنا چاہئے اور اس کی خاطر و مدارات کرنا چاہئے۔ گھر واپس آنے کی کچھ تو خوشیاں منا لو (یوجین کی سانس نہیں سماتی، اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ک۔ لیکن جمیس.......

م۔ (حلیمہ) میں اصرار کرتا ہوں نہ تو تم آنا چاہتی ہو نہ وہ، (کینڈڈا کچھ کہنا چاہتی ہے) نہیں اپنی فکر نہ کرو، وہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تمہاری خالی کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے اور چونکہ وہ لوگ ابھی تک میرے خیالات سے ناواقف ہوں گے لہذا ان کا بیٹھنا زیادہ مفید ہوگا۔

ک۔ (پریشان ہو کر) کیا یوجین تم چلنا نہیں چاہتے؟

م۔ میں یوجین کے سامنے وہاں بول نہیں سکتا۔ وہ میرے وعظوں پر اس قدر معترض ہوتا ہے (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اور وہ یہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ آج صبح یہ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا تو کینڈڈا آج میں اس کو تمہاری حفاظت میں چھوڑ کر دکھا دوں گا کہ میں اس سے کس قدر ڈرتا ہوں۔

ی م۔ (خود سے خوشی اور جذبے سے) یہ واقعی عالی ہمتی ہے، بہت خوبصورت۔

ک۔ (پریشان اور تشویشناک ہو کر) لیکن۔ لیکن۔ جمیس کیا کوئی بات ہو گئی؟ (بہت بےچین ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا ــــ

م۔ (اس کو محبت سے اپنے بازوں میں لیتے ہوئے اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے) اچھا! پیاری میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہوں۔

(پردہ)

(باقی آئندہ)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

# دہر آشوب

ابتری عام و زمیں گیر نظر آتی ہے
خواب ابلیس کی تعبیر نظر آتی ہے
عافیت بستۂ زنجیر نظر آتی ہے
زندگی موت کی تفسیر نظر آتی ہے

---

امن کے جسم پہ ہے جنگ کا خونیں قالب
روحِ اقوام پہ ہیں مرگ و تباہی غالب
خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی ارضِ مغرب
نعشِ عریاں پئے تشہیر نظر آتی ہے

---

طرب آموز تھا آغازِ جمالِ پیرس
درد انگیز ہے تصویرِ مآلِ پیرس
نازک اندام و سیہ چشم غزالِ پیرس
خوں میں ڈوبا ہوا نخچیر نظر آتی ہے

---

لٹ گئی رونق و تمکینِ شبستانِ نظر
مٹ گئی زینت و آرائشِ ایوانِ نظر
لعبتِ چین کہ تھی حاصلِ ارمانِ نظر
زخمی و خستہ و دلگیر نظر آتی ہے

---

موجۂ نیل پھر آمادۂ طغیانی ہے
چین بر رو پھر ابوالہول کی پیشانی ہے
مصر پھر منتظرِ ہادیٔ عمرانی ہے
روحِ فرعون عناں گیر نظر آتی ہے

---

دلِ جاپان نظرِ روس ہے آز آلودہ
درِ لعنت پہ جبینیں ہیں نیاز آلودہ
ترکی و روم و فلسطین و حجاز آلودہ
آتشِ جنگ جہاں گیر نظر آتی ہے

---

فتنہ در سر ہیں شرر اور ہوا آج، مگر
حشر در بر ہیں قدر اور قضا آج مگر

قہر پر دور ہیں بشر اور خدا آج مگر
صور پھنک جانے میں تاخیر نظر آتی ہے

---

للہ الحمد کہ نزدیک ہے وہ روزِ سعید
عشرہ بن جائے گی جب ہر ستم ایجاد کی عید
حق کو مژدہ ہو کہ بالائے سرِ شمر و یزید
تیغ مظلومیٔ شبیر نظر آتی ہے

---

انقلاب آیا ہے یوں چاند کی ہر منزل پر
چھا گیا ہے شفقی رنگ فلک کے دل پر
اک نئے دور کے آئینۂ مستقبل پر
دیکھ وہ سرخیٔ تحریر نظر آتی ہے

---

جان باقی ہے سسکتی ہوئی تہذیب میں بھی
شررِ صدق ہے خاکسترِ تکذیب میں بھی
یعنی اس سلسلۂ غارت و تخریب میں بھی
اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

---

شرحِ صدرِ حرم و دیر ہوا چاہتی ہے
فاش تزویرِ شر و خیر ہوا چاہتی ہے
عقل آزاد و سبک سیر ہوا چاہتی ہے
پائے اوہام میں زنجیر نظر آتی ہے

---

ہے بدلنے ہی کو نظم و نسق چرخ کبود
باغ بن جانے کو بیتاب ہے نارِ نمرود
خنکیٔ قلبِ براہیم ہے سرگرمِ شہود
آگ میں برف کی تاثیر نظر آتی ہے

---

پھر نم آگیں ہیں شرر، شعلے ہیں شبنم آلود
پھر دلِ آہن و خارا میں ہے نرمی کی نمود
شاعرِ شرق کو بخشا گیا لحنِ داؤد
سنگ میں موم کی تاثیر نظر آتی ہے

---

حق ہوا چاہتا ہے پردۂ باطل سے عیاں
کفر کے دل میں ہے تابندہ شرارِ ایماں
ہو بشارت کہ ضمیرِ شبِ غم میں غلطاں
صبحِ نوروز کی تنویر نظر آتی ہے

(بہروش عسکری طباطبائی بی۔اے لکھنوی)

# نوائے سحر

تیری فرقت سے جو غمگین کبھی ہو جاتا ہوں — طفل ناداں کی طرح سوچ میں کھو جاتا ہوں
رات بھر دیکھتا رہتا ہوں ستاروں کی راہ — صبحدم تھک کے تری یاد میں سو جاتا ہوں

---

بانگ فطرت کا ترنم ہے جنوں ساز ابھی — ضوفشاں ہے مرے دل میں شرر راز ابھی
زندہ ہے خاک کی آغوش میں احساس کی آگ — گونجتی ہے تری شب میں مری آواز ابھی

---

ظلمت دہر سے بیتاب نوا ہوتا ہوں — کشت ہستی میں تری دانہ غم بوتا ہوں
درد دل سے، تری درگاہ میں ہنگام سحر — اکثر اک طفلک تنہا کی طرح روتا ہوں

---

فکر محبوس، ابھی طالب پرواز نہیں۔ — اس کا ہنگامۂ تکبیر شرر ساز نہیں
خلوتوں میں غم امروز سناتا ہوں تجھے — کہ ترے دہر میں میرا کوئی ہمراز نہیں

---

شیشۂ عمر مئے تند سے لبریز نہ کر — دہر میں یوں مری فطرت کو جنوں خیز نہ کر
فکر ہستی کے لئے فرصت یک لحظہ تو دے — موج دم سے یہ دبی آگ ابھی تیز نہ کر

---

یہ جہاں تنگ ہے کتنا دل پرشور کو آہ! — سخت مشکل ہے شب و روز میں فطرت سے نباہ
اک ننھی سی خطا پر تو خفا ہے اور ابھی — کروٹیں لیتا ہے دل میں مرے اک حشر گناہ

فضل حسین صاحب کیفؔ

# مے کہنہ

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

کھلی ہے خانۂ صیاد میں ہماری آنکھ
قفس کو جانتے ہیں آشیاں نہیں معلوم

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

آئینہ دیکھنے کا گذرتا نہیں خیال
اپنی خبر نہیں انھیں میری خبر کہاں

یہ کھلا آتش عناصر سے دلِ دیوانہ کو
چار دیواریں اکٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں

آباد میرا خانۂ ویراں ہے ان دنوں
سیلاب مجھ غریب کا مہماں ہے ان دنوں

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردشِ کافر و دیندار لئے پھرتی ہے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
مجھ کو غربت وطن سے بہتر ہے

صورتِ شمع ہوں ہرچند فروغِ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ کو جا چکے
کیا کیا نہ اس دوراہے پہ ہم پھیر کھا چکے

زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں نصیب
آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے

میری تعظیم نے مجلس سے نکالا مجھ کو
اُٹھتے اُٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جا باقی

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لئے

بت خانہ کھود ڈالئے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

طریقِ عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گذرے گا
گریباں میں بجھی ہے جب لگی ہے آگ داماں میں

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجئے
موسمِ گل میں ہوں جو بے چاک کے

(آتش لکھنوی مرحوم)

# غزل

کچھ اپنا آشنا کیوں اے دل ناداں نہیں ہوتا
کہ آئے دن یہ رنگ گردش دوراں نہیں ہوتا

ریاض دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا

سراپا نار ہونا نور کا آساں نہیں ہوتا
فرشتوں میں جو اعلیٰ تر نہیں شیطاں نہیں ہوتا

ابھی تک حسن بک جاتا ہے بازار محبت میں
مگر ہر بکنے والا یوسف کنعاں نہیں ہوتا

کسی کے حسن سے ناداں کبھی انکار بھی کر لے
کوئی بے کفر کے شائستۂ ایماں نہیں ہوتا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

تجھے پا کر بھی اہل شوق تجھ کو پا نہیں سکتے
یہ عقدہ حل بھی ہو کر عقدۂ آساں نہیں ہوتا

نظر سے گدگدائے جا، ستم سے دل دکھائے جا
میں یوں خنداں نہیں ہوتا میں یوں گریاں نہیں ہوتا

فنا اپنی بقا اپنی ہے جس کو عشق کہتے ہیں
وہ مرگ و زیست کا شرمندۂ احساں نہیں ہوتا

ہر اک شے کے پس منظر ہو جیسے نور کا عالم
کہاں نظارۂ شمع تہہ داماں نہیں ہوتا

فضائل لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جس میں
فرشتہ ہو خدا ہو کچھ بھی ہو انساں نہیں ہوتا

یہ دنیا سر بسر گویا پرستاں بنتی جاتی ہے
کہ ان آنکھوں کا عالم، عالم امکاں نہیں ہوتا

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبت میں
کبھی مشکل نہیں ہوتا، کبھی آساں نہیں ہوتا

مزاج حسن کی مجبوریوں کو کیا کرے کوئی
ترے وعدوں میں یوں تو جھوٹ کا امکاں نہیں ہوتا

اٹھے ہی جاتی ہیں موجیں تبسم ہائے پنہاں کی
گلستاں در گلستاں کب رخ جاناں نہیں ہوتا

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ ساز درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

(فراق صاحب گورکھپوری)

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**منتخب داغ:۔** منتخبہ احسن مارہروی مرحوم مطبع انوار احمدی الہ آباد قیمت حصہ اول ۱۲ دوم ۱۲ روپے صفحات ۷۷، کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

داغ کے دو ایک انتخابات نکل چکے ہیں لیکن ایک مفصل انتخاب کی ضرورت پھر بھی باقی تھی۔ اس انتخاب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ان کے ایک محبوب اور مشہور شاگرد کا کیا ہوا ہے۔ حصہ اول میں داغ کی غزلوں کے ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو فارسی عطف و اضافت سے خالی ہیں حصہ دوم میں یہ قید اٹھا دی گئی ہے اور ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جن میں فارسی عطف و اضافت موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہلے حصے میں ہر قسم کے اشعار لئے گئے تھے۔ دوسرے حصہ میں صرف بہتر اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔ گویا پہلا حصہ ہندوستانی اردو کا نمونہ ہے دوسرا حصہ خالص اردو کا۔ ابتدا میں ۴۲ صفحوں کا احسن صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس میں داغ کی شاعری پر تبصرہ ہے نیز ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے جو اس وجہ سے اور بھی مستند ہیں کہ احسن صاحب کے اپنے دیکھے ہوئے ہیں۔ داغ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے احسن مرحوم نے ایک پارے میں ان کی خصوصیات کو اس طرح بند کر دیا ہے "داغ نہ صوفی تھے نہ مفتی، صرف ایک شاعر تھے اور شاعر بھی غزل کے اور غزل بھی ایسی جس میں شوخی۔ شرارت، جلی کٹی، طعن تشنیع۔ رشک بدگمانی۔ چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ چھین جھپٹ کے سوا کچھ نہیں.......... داغ نے سیدھی سادی باتوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلے ہیں کہ بڑے بڑے کھلاڑیوں کو نیچا دیکھنا پڑا ہے ؎

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول      سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مقدمہ سے پہلے احسن مارہروی مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب بھی دس بارہ صفحات میں دے دیا گیا ہے۔

غرضکہ یہ انتخاب بہ ہمہ نوع مکمل ہے اور کیا باعتبار معنی اور کیا باعتبار بندش شاید ہی کوئی اچھا شعر باقی رہ گیا ہو جو اس انتخاب میں نہ آگیا ہو۔

**پھریری:**۔ از عظیم بیگ صاحب چغتائی ملنے کا پتہ کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت عہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ۔

یہ چغتائی صاحب کے چودہ ۱۴ افسانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں اور ان خوبیوں اور خامیوں کے حامل ہیں جو چغتائی صاحب کی خصوصیات رہی ہیں۔ چغتائی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے کسی نہ کسی واقعہ پر ضرور مبنی ہوتے ہیں۔ زیب داستان کے لئے افسانہ نگار البتہ ان میں تغیر و تبدل ترمیم و تنسیخ کر لیتا ہے۔ یہ خصوصیت جہاں اتنی خوبیاں رکھتی ہے وہاں اس میں یہ خامی بھی ہے کہ اکثر افسانے افسانہ نگار کی کم توجہی کے باعث محض واقعات کی ایک ڈائری ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چغتائی صاحب کے بعض افسانوں میں یہ کھردری واقعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ بعض افسانوں کی طرز نگارش میں رشید صدیقی اور پطرس کا رنگ پایا جاتا ہے "ہمارا پرنس" والے افسانے میں انگریزی طرز معاشرت کی بہت دلچسپ تصویر کھینچی ہے بقیہ افسانے زیادہ تر چغتائی صاحب کے پر شرارت پلاٹوں سے مزین ہیں۔ دلچسپ چیز ہے۔

**گرام سدھار:**۔ مصنفہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ۔ سکرٹری شری گاندھی آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ ایک چھوٹی تقطیع پر ۱۲۸ صفحہ کی کتاب ہے جس میں دیہی اصلاحات کے سلسلہ میں گاؤں والوں کی طرز زندگی اور معاشی حالات کا تامتر جائزہ لے کر ان کی فلاح و بہبود کی خاطر عملی اور فائدہ مند تدابیر نہایت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ زراعت و گھریلو صنعت کی ترقی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے نیز صحت عام اور تعلیم عام کی طرف حکومت کو اس کے فرائض بتلا کر متوجہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قوم کو اپنے جائز و ضروری مطالبات گورنمنٹ سے منوانے کی پر زور ترغیب دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر کام کی بات لوگوں کو اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے اور اپنی ضروریات خود پورا کرنے کی ہے۔ یہ وہ زریں اصول

ہے جو زمانہ قدیم میں ہندی تمدن کا خاص الخاص طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے سے اُن تمام بدیسی چیزوں سے چھٹکارا ہو جاتا ہے جن سے آج کل ہندوستان کے بازار بھرے پڑے ہیں اور جو روزمرہ کی ضروریات میں بھی دوسروں کا محتاج کئے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں اس مفید کتاب کے اضافہ کرنے پر اُس کے لائق و مخلص مصنف قابل مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اچھا سبق حاصل کریں گے۔ دراصل اس کتاب کو بجائے گرام سدھار کے قوم سدھار کہنا زیادہ موزوں ہے۔

**منگل پربھات**:- مترجمہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ، سکرٹری شری گاندھی سیوا آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے اُن چند ہندی خطوط کے مجموعہ کا ترجمہ ہے جو ہر ہفتہ منگل منگل انھوں نے اپنے قائم کردہ سابرمتی آشرم کے رہنے والوں کو لکھے تھے۔ ان سے مہاتما گاندھی کے مذہبی اعتقادات، پاکیزہ خیالات اور فلسفۂ اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح یہ اُن کے معتقدین کے لئے پیام تعلیم اور رہنمائے ہدایت ہیں اُسی طرح عام پبلک کے لئے بھی معلومات مذہبی و بلند خیالی میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ اس کتاب میں حق اور حق پر چار کا اظہار کیا گیا ہے اور معیار انسانیت بلند کرنے کے لئے جن اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ کی ضرورت ہے ان کو مختصراً بیان کیا گیا ہے چنانچہ حق پرستی بے خوفی۔ عدم ایذا دہی۔ تزکیہ نفس کے لئے ریاضت، مذہبی رواداری اور انسانوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ان خطوط میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے اردو داں حضرات کو واقف کرنے کے لئے مترجم کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ جا بجا بعض ٹھیٹھ ہندی الفاظ محتاج تشریح ہیں جنھیں طبع ثانی کے وقت ملحوظ رکھا جائے تو مناسب ہے۔ (م-ح)

**جغرافیہ دنیا** (میسور ایڈیشن) :- مؤلفہ سید شرف الدین قادری۔ ایم۔ اے، بی۔ ٹی لکچرار ٹیچرز ٹریننگ اسکول اورنگ آباد دکن ملنے کا پتہ سید عبدالقادر اینڈ سنس کتب فروش چارمینار حیدرآباد دکن قیمت عمہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

شرف الدین صاحب نے یہ جغرافیہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کیلئے ترتیب دی ہے۔ شروع میں طبیعی جغرافیہ بھی ہے اس کے بعد ہر ملک کی جغرافیہ مختصراً بیان کی ہے مختلف تصویریں اور ضروری نقشے بھی دیئے گئے ہیں۔ نقشوں میں موجودہ جنگ سے قبل جو حدود تھیں وہی برقرار رکھی گئی ہیں۔ مشہور ہندوستانی ریاستوں کی جغرافیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ طالب علموں کیلئے بہت مفید کتاب ہے اور یوپی کے اسکولوں میں جو اردو جغرافیہ رائج ہے اس سے یہ بہتر ہے۔

**رسالہ ہندوستانی ادب:۔** چنچل گوڑہ حیدر آباد دکن۔ زیر ادارت غلام محمد خاں صاحب ایم۔اے (عثمانیہ) چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ۲ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۶۴۔

جون ۱۹۴۲ء سے یہ ماہوار رسالہ غلام محمد خاں صاحب نے نکالنا شروع کیا ہے۔ ہر قسم کے ادبی مختصر مضامین کے علاوہ دنیائے سائنس، معلومات، دلچسپیاں اور فلمی معلومات بھی دی گئی ہیں۔ رسالہ کی ترتیب اچھی ہے ہر قسم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے مضامین مختصر ہو گئے ہیں۔ تنوع اور اختصار اور دلچسپی کو مد نظر رکھنا ہے تو بہتر یہ ہوگا اگر غلام محمد خاں صاحب تمام ہندوستانی رسالوں یا کم از کم تمام اردو کے رسالوں کے بہترین مضامین کا اختصار دیدیا کریں یہ اردو کے لئے ایک نئی چیز ہوگی۔ دلچسپ بھی، انوکھی بھی اور آسان بھی۔ ورنہ ایسے رسالے تو بہت سے نکلتے رہیں گے۔

**رسالہ پیام اسلام:۔** مدیر محمد احمد خاں صاحب ذاکر۔ ملنے کا پتہ دار القرآن۔ جالندھر۔ صفحات ۴۸۔ چندہ سالانہ تے ر۔ طلبہ سے عا۔ فی پرچہ ۴ر

دراصل یہ رسالہ مدرستہ البنات کی طالبات کے لئے نکالا گیا ہے لیکن عام عربی پڑھنے والے طالب علموں اور عربی زبان سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس میں عربی اسباق کے علاوہ قرآن اور حدیث اور تفسیر کے بھی عام فہم اقتباسات ہیں۔ طالب علموں کے لئے بہت مفید چیز ہے۔

---

# اقبال

(گزشتہ سے پیوستہ)

## آٹھواں منظر

### وادیٔ ظلمت

(آدھی رات۔ شاعر مستقبل کی روح ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی تصور کے گلستاں کھلا رہی ہے۔ آدھی رات اس سے کہتی ہے)

**آدھی رات۔** اک مشعل جاں ہو مری فطرت کی سیاہی
اے نجم درخشاں تری ثابت ہے گواہی

اُٹھا اے نگہ شوخ کے خاموش پرستار
لٹتی ہے یہاں دولت آشفتہ نگاہی

ہے دست درازی کے لئے دامن عالم
ہے سایہ فگن فرق پہ منشائے الٰہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

**روح شاعر۔** مرے فروغ تخیل کا فیض ہے عالم
یہ کائنات مری چشم دلنواز میں ہے

تو دیکھتی نہیں تخلیق جاوداں کا حرم
مرے مدینہ میں ہے اور مرے حجاز میں ہے

مرے رسول ہیں یہ دلبران حسن و جمال
پیام عشق مری وحی جاں نواز میں ہے

کھلے ہیں میرے لئے جبرئیل کے بازو
ہجوم حور و ملک میری بزم ناز میں ہے

اگر میں چاہوں تو پیدا کروں جہاں اپنا
دکھاؤں چشم تماشا کو آسماں اپنا

**آدھی رات۔** اگر ہے دعوئے تخلیق تجھ کو اے شاعر
تو اپنا کوئی زمیں آسماں بنا کے دکھا

مری نگاہ پہ چلتے نہیں فقط دعوے
ہر ایک منظر تخلیق جگمگا کے دکھا

**روح شاعر۔** خشک تھی یہ سرزمیں فیضان قدرت سے مگر
دیکھ اس وادی میں اک بہتا ہوا چشمہ مرا

(ایک شفاف چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے)

**چشمہ۔** ہر حسن اضافی ہے ہر حسن تماشا ہے — بہتا ہوا دنیا میں دریائے تمنا ہے
جاری رہے عالم میں اک انجمن آرائی — تخلیق مسلسل ہی فطرت کا تقاضا ہے

**روح شاعر۔** تیرے پہلو سے نکالا میں نے اک چھوٹا سا باغ — دیکھ اس پر ناچتے ہیں کتنے پھولوں کے ایاغ

(پھولوں کا ایک شاداب باغ چشمے کے کنارے اُگتا ہے، اور لہلہاتا ہے)

**باغ۔** لے گئی باغ میں طوفان محبت کو بہار — ڈالی ڈالی مرے محبوب کا افسانہ ہے
ہر طرف بادۂ مستی کے چھلکتے ہیں جام — پھر بھی اک چیز سے خالی مرا پیمانہ ہے

**روح شاعر۔** اچھا تو اپنی چھاؤں میں اک طائر حزیں — اپنی صدائے درد سے ہے نغمہ بار دیکھ

(شاخ پہ ایک پپیہا "پی کہاں، پی کہاں" کی آواز دیتا ہے)

**روح شاعر** محو ہو کر گاتی ہے۔

تو کیستی و من کیم، از صحبت ما چیست[1] — بر شاخ گل ایں طائرک نغمہ سرا چیست
مقصود نوا چیست؟
مطلوب صبا چیست؟
ایں کہنہ سرا چیست؟

شاید کہ چمن رزم حیات ہمہ جوئی است — بزمے است کہ شیرازہ او ذوق جدائی است
دم؛ گرم نوائی است
جاں؛ چہرہ کشائی است
ایں راز خدائی است

**پپیہا کی آواز۔** برخیز و دل از صحبت دیرینہ بپرداز — با لالۂ خورشید جہاں تاب نظر باز
با اہل نظر ساز
چوں من بہ فلک تاز
داری سر پرواز؟

[1] پیام مشرق صـ ۱۳۸

(یہ گا کر پپیہا اڑ جاتا ہے۔ روحِ شاعر پپیہے کو آسمان کی طرف اڑتا ہوا دیکھتی ہے۔ اس کی نظر جھلملاتے ہوئے تاروں پر پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پپیہا ستارہ سرطان کے سامنے گذر گیا۔ روحِ شاعر کی نظر ستارۂ سرطان پر جم جاتی ہے اور بیتاب ہو کر جواب دیتی ہے)

**روحِ شاعر۔** خالی سرِ پروازِ نہیں قوتِ جاں بھی | یہ وسعتِ افلاک بھی یہ کون و مکاں بھی

اڑتے ہوئے میں شعلۂ انجم کو ہوا دوں | بجھتے ہوئے سیاروں کی آنکھوں کو جگا دوں

پیچھے مرے آتا رہے یہ گنبدِ دوّار | آگے مرے چلتا رہے ہر ثابت و سیار

ہر عظمتِ گرداں کے تگ و تاز سے نکلوں | طوفان سے نکلوں کبھی آواز سے نکلوں

ہو جائیں تجلی کی بہت تیز ہوائیں | دیکھیں جو مجھے اہلِ فلک رقص میں آئیں!

(شاعر کی روح آسمان کی طرف اڑتی ہے۔ ستارہ سرطان خود بھی قریب آتا ہے۔ اس کے اطراف چکر لگانے والا محورِ نور صاف نظر آنے لگتا ہے۔ سرطان اس طرح دعوت دیتا ہے)

آ، اے نظر افروزِ تجلی پہ کھڑا ہو | اس مرکزِ انوار کا آئینہ نما ہو

پی آنکھ سے یہ بادۂ پیمانۂ افلاک | چل پاؤں سے بالائے طربخانۂ افلاک

انجم کی نگاہوں سے اڑا ذوقِ تماشا | دیکھ آنکھ سے آئینہ ایوانِ تجلے

کس شان سے ہوتی ہے یہاں گردشِ انجم | سن غور سے سیاروں کے نغموں کا تلاطم

آنکھوں کے مقابل ہے یہاں چرخ کی رفعت | نزدیک نگاہوں کے ہے کونین کی وسعت

جو دور تھا نزدیک ہے، جو سرد تھا روشن | دامن سی لگا ہے تجھے افلاک کا دامن!

(روحِ شاعر سرطان کے محورِ نور پر کھڑی ہوئی رقص کرتی ہے اور وجد میں آکر گاتی ہے)

**روحِ شاعر۔** میں تعمیر و تخلیق کی ناخدا ہوں | بڑی خود نما ہوں، بڑی خود نما ہوں

بہت حیرت افزا ہیں گو یہ نظارے | بہت دلربا ہیں یہ سب ماہ پارے

مگر مجھ کو ہوتی نہیں اس سے تسکیں | سلامت رہے روح کا فخر و تمکیں

اضافہ کروں خود نمائی میں شاید | ابھی کچھ کمی ہے خدائی میں شاید!

دیکھتے ہی سرطان کا محور تیز گردش کرنے لگتا ہے اور اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ روح شاعر اس پر سے تنکے کی طرح اڑ جاتی ہے اور ایک وسعت بے کنار کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے سیارگاں کے شعلے، گردش کی ہوائیں، رقص کی آوازیں شور کرتی ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے روح شاعر کارواں در کارواں ستاروں کو تیزی سے گذرتا ہوا دیکھتی ہے۔ انجم کا یہ سرود سنائی دیتا ہے)

جلوہ گہ شہود را[1] — بت کدۂ نمود را

رزم نبود و بود را — کش مکش وجود را

عالم دیر و زود را — می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گذشت — بندہ ز چاکری گذشت

زاری و قیصری گذشت — دور سکندری گذشت

شیوۂ بتگری گذشت — می نگریم و می رویم

روح شاعر اب ایک ایسی ظلمت بے جہت میں آ جاتی ہے جہاں اسے خود اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ اس ظلمت میں وہ زور کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے دریا میں ڈال دی جاتی ہے جس کی موجیں قیامت خیز جزر و مد کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔ سوائے دریا کی سرخ موجوں اور ان کی آتشیں دنداں نمائی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ دریائے آتشیں کہتا ہے)

دریائے آتشیں:

آمری آغوش میں تخلیق کے اے ناخدا — تجھ پہ شاید ہنس رہی ہے ظلمت دنداں نما

ناز تھا اے بے خبر اپنے تصور پر تجھے — صبر کرنا ہے یہاں اپنے تحیر پر تجھے

التہاب شعلۂ تمکینِ قلب جاں ہوں میں — امتحان کفر ہوں آئینہ ایماں ہوں میں

میری موجوں میں اجل سے بھی زیادہ انتقام — میرے پانی میں جنوں سے بھی زیادہ اقتضام

کم نظر کی رہنما ہے شعلہ آشامی مری — بے بصر کا راستہ ہے آتش افشانی مری

(روح شاعر دریائے آتشیں میں غوطے کھاتی ہے۔ ظلمت سے ایک آواز آتی ہے)

چو موج می تپد آدم بہ جستجوئے وجود • ہنوز تا بہ کمر در میانۂ عدم است

---

[1] پیام مشرق صـ۱۱۳

روح شاعر۔ نے فروغِ چشم و دل ہے نہ چراغِ قلب و جاں | الاماں اے ظلمتِ دریائے آتش الاماں
جور اتنا کس لئے اولادِ آدم ہوں نا میں | شور اتنا کس لئے افسانۂ غم ہوں نا میں؟
ڈوبتی جاتی ہے میری کشتیٔ عقل و خرد | المدد اے شاعرِ حسن خدائی المدد!

(روح شاعر کے سامنے ایک مہیب شکل و صورت کی مچھلی جس کا چہرہ دیو نما ہے ظلمت سے دو سرخ آنکھیں چمکاتی ہوئی ابھرتی ہے اور اسے پشت پر بٹھا کر کھینچ لے جاتی ہے۔ دوسری آواز آتی ہے)

بے زورِ سیل کشتیٔ آدم نمی رود | ہر دل ہزار عربدہ دارد بہ ناخدائے
از من حکایتِ سفرِ زندگی مپرس | در ساختم بہ درد و گذشتم غزل سرائے

(روح شاعر پکارتی ہے)

اے ظلمتِ حیات مرے دل پہ رحم کر | اک وادیٔ فنا میں مجھے اس طرح نہ کھینچ
تیسری آواز۔ بیش نگر کہ زندگی راہ بہ عالمے برد | از سر آنچہ بود و رفت در گذر انتہا طلب
روح شاعر۔ فنا کی طرف مجھ کو لے جا رہی ہے | مری انتہا مجھ کو دکھلا رہی ہے
چوتھی آواز۔ بہ آں تاب تابے کہ فطرت بہ بخشد | در خشم چو برقے بہ ابر سیاہے

(روح شاعر تڑپ کر مچھلی کی پشت پر سے کود جاتی ہے۔ کودتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کا پانی تھم گیا اور شاعر کو تھوڑی دیر کے لئے سکون کی ایک چٹان سی مل گئی۔ اس وقت روح اقبال کی یہ صدا آنے لگی)

[1] انجم بہ گریباں ریخت ایں دیدۂ تر مارا | بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر مارا
شام و سحر عالم از گردشِ ما خیزد | دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر مارا
شایانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست | ایں راہ گذر مارا آں راہ گذر مارا

(تھوڑی دیر بعد موجوں کی رفتار دھیمی دھیمی شروع ہوتی ہے۔ روح شاعر ان سے نکل نہیں سکتی۔ تھوڑی دور جا کر موجیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روح شاعر بھی مدہوش ہو جاتی ہے۔ عالم سکوت یوں گویا ہوتا ہے)

عالمِ سکوت۔ یہ سکوتِ منجمد ہے یا اجل کا دام ہے | ناشناسائے خدائی کا یہی انعام ہے
اے خیالِ مضطرب تیری تگ و دو کیا ہوئی | اے نگاہِ بے محابا تیری وہ رو کیا ہوئی؟

---

[1] زبورِ عجم صفحہ

کیا ہوا وہ زندگی کا ذوق وشوق بے حجاب
کیا ہوئی وہ گرم رو پیہم صدائے انقلاب؛

کیا ہوئی غافل وہ شوخی تیری چشم ناز کی
کیا ہوئی ناداں وہ لرزش گرمی آواز کی؛

تیرے سینے میں جو برپا تھا وہ طوفاں کیا ہوا
کوہ وصحرا کیا ہوئے، صحن گلستاں کیا ہوا؟

تھم گئی یہ آشفتگی عقل وعرفاں کس لئے
ہوگیا بے حس وحرکت قلب لرزاں کس لئے!

(روح شاعر منجمد دریا میں بے حس پڑی ہوئی ہے۔ مدتوں پڑی رہنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک آواز آنے لگتی ہے۔ یہ ایک قوی ہیکل کشتی بان کی آواز ہے جو ایک عجیب وغریب کشتی میں بیٹھا ہوا ہے)

اٹھے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانہ ما رفت بہ تاراج خزاں خیز

از نالہ مرغ چمن، از بانگ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامہ آتش نفساں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش واز دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

از خواب گراں خیز

(کشتی بان روح شاعر کو کشتی میں بٹھا کرلے چلتا ہے اور گاتا ہے)

سفینہ دو جہاں کا ہے، یہ دریا لامکاں کا ہے
یہ موجیں زندگی کی ہیں، یہ طوفاں آسماں کا ہے

ملے گر نا خدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

نظر ہے بادباں اپنی، تصور ہے ہوا اپنی
ہے آغوش خدائی میں بقا اپنی فنا اپنی

ملے گر نا خدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

دل درد آشنا ساقی تو پائے ازل پھر
ہر اک موج رواں کے ہاتھ میں عرفان کا ساغر

ملے گر نا خدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

---

؎ زبور عجم صفحہ ۱۱

یہاں ہے صبر پیمائی، یہاں ہے حوصلہ کاہی  مگر اس امتحاں سے ڈر نہ اے طوفان کے راہی
ملے گر نا خدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ  چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

(روح شاعر کو ہوش آتا ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ اس کے کانوں میں یہ شیریں نغمہ گونجتا ہے)

بینی جہاں را، خود را نہ بینی  تا چند ناداں غافل نشینی
نورِ قدیمی شب را برافروز  دستِ کلیمے در آستینی
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق  تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید  مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند  آدم بمیرد از بے یقینی

(روح شاعر جاگ اٹھتی اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یکایک ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا پرندہ جس کے پروں کی ہوا سے وادیٔ ظلمت کے کنکر پتھر اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے پنجوں میں اٹھائے ہوئے پرواز کرتا ہے۔ یہاں بھی ظلمت کامل ہے۔ روح شاعر اپنے آپ کو معلق محسوس کر کے کانپنے لگتی ہے۔ کوہ پیکر پرندہ کہتا ہے)

کوہ پیکر پرندہ ظلمت کی روح ہستی فانی پہ چھا گئی  ٹھنڈی ہوا چراغ محبت بجھا گئی
بے باکیٔ خیال قیامت اٹھا گئی  احساس نور ظلمت ہستی مٹا گئی

اڑتا ہے کوئی راہگذر جانتا نہیں
رہبر ہے ساتھ اور اسے پہچانتا نہیں

میرے پروں میں موت کا ہے زلزلہ نہاں  میری ہوا سے بجھنے لگی شمع لامکاں
میری نظر میں جذب ہوا رنگ آسماں  میری صدا میں ڈوب گیا شورِ الاماں

بے جہت ظلمتوں میں اڑا جا رہا ہوں میں
کہسار میں عدم کے چلا جا رہا ہوں میں

(کسی گوشے سے آواز آتی ہے)

---

ٔ زبورِ عجم صہ ۱۴۸

آتش از نالۂ مرغان حرم گیر و بسوز ۔۔۔ آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں
در جہان بال و پر خویش کشودن آموز ۔۔۔ کہ پریدن نتواں با پر و بال دگراں[1]

(یہ آواز سنتے ہی روح شاعر تڑپتی ہے اور پرندے کے چنگل سے چھوٹ جاتی ہے اور بلندی کا ایک صبر آزما خلا طے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں کے بعد ایک جگہ اتر آتی ہے۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے اور افتاں و خیزاں چلتی ہوئی ہر چیز کو چھونے لگتی ہے۔ اس وقت آواز آتی ہے۔)

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر ۔۔۔ کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

(روح شاعر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ بہت دور سرخ روشنی کی ایک ہلکی سی دھار اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے خود فراموشی دور ہوتی اور احساس جاگنے لگتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح شاعر اوپر چڑھ رہی ہے۔ پہاڑ صدا دیتا ہے)

**پہاڑ۔** اندیشہ کر کسی کے مقام حجاب کا ۔۔۔ پھر جائزہ لے اپنے خیال خراب کا
جلوہ فروش کون ہے قصر خیال میں ۔۔۔ کس کا فروغ ہے نگہہ پائمال میں؟
ذوق انا کی منزل فکر و عمل ہے کیا ۔۔۔ بیکار دل کی بزم میں دست اجل ہے کیا؟
مدہوشی نگاہ میں کس کا جمال ہے؟ ۔۔۔ ارمان کے حصار میں کس کا خیال ہے؟
کس کی صدا سے تیز ہیں اعمال کے قدم ۔۔۔ کھلتے ہیں کس کے سامنے جذبات کے علم؟
منصف ہے کوئی ورنہ کے محشر بپا تو ہیں ۔۔۔ چلتی ہے روح عقل و خرد رہنما تو ہیں؟

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن وہ سنبھل کر پہاڑ سے کہتی ہے)

**روح شاعر** طے کرے گی ظلمتوں میں بھی انھیں میری حیات ۔۔۔ سامنے تو چاہے جتنی سیڑھیاں پیدا کرے
یاد آتا ہے مجھے خضر محبت کا پیام ۔۔۔ سینۂ مضطر میں جو برق رواں پیدا کرے
ہو صداقت کیلیے جس دل میں مرنے کی تڑپ ۔۔۔ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار ۔۔۔ اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر ۔۔۔ رات کے تاروں میں اپنا رازداں پیدا کرے[2]

---

[1] پیام مشرق ص۱۹۱

(روح شاعر پہاڑ پر چڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک غار سے آواز آتی ہے)

ہست این میکدہ و دعوت عام است اینجا | قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
حرف آں راز کہ بیگانۂ صوت است ہنوز | از لب جام چکیدہ است و کلام است اینجا
ماکہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم | علم جاں را بد میدیم و عمل ساختہ ایم

(روح شاعر یہ آواز سن کر سوچنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

**روح شاعر**۔ ہر ذرہ حیات ہے اک روح ارتقاء | اس خود روِ ازل کا کوئی رہنما بھی ہے
حیرت کا آئینہ ہے بیابان کائنات | ظلمت کی وادیوں میں کوئی راستا بھی ہے
موت و حیات کھیل ہیں طوفان وقت کے | یاں ابتدا ہے اور کوئی انتہا بھی ہے
امید پر قیام وجود و عدم ہے کیا | سامان زندگی میں علاج قضا بھی ہے؟
اک پردۂ نظر میں ازل اور ابد کے راز | کیا عالم شہود کوئی دیکھتا بھی ہے؟
فرد بشر نے پائی ہے تہذیب زندگی | دنیا میں امتیاز ثواب و خطا بھی ہے؟
بیگانگی کی آگ میں جھونکے ہوئے غریب | میں پوچھتا ہوں دہر میں اپنا خدا بھی ہے؟

(روح شاعر پہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے۔ جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ دور سے پیغام آتا ہے)

"از خلش کرشمۂ کار نمی شود تمام | عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب"

(اب شاعر کو اوپر سے کچھ اُجالا قریب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایک نہایت تنگ سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے۔ جہاں ہاتھ پھیلانے کی جگہ بھی نہیں ملتی اور نہ سر اٹھا کر چلنے کی۔ اسے سر جھکائے ہوئے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے گذرنا پڑتا ہے۔ اسے سرنگ سے آخری گوشے پر پھر روشنی دکھائی دیتی ہے جو بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ روح شاعر تیزی سے دروازے پر پہونچتی ہے سامنے سے دو حسین پیکر روح شاعر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور گذرتے ہیں۔ ان کے تاجوں پر "عمل" اور "خودی" لکھا ہوا ہے۔ دونوں گاتے ہیں)

**پیکر عمل**۔ چو خورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن[2] | ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے میتواں کردن

---

[1] پیام مشرق ص۱۴۲۔ [2] زبور عجم ص۱۵۱۔

نہ ایں عالم حجاب او را، نہ آں عالم حجاب او را
اگر تاب نظر داری نگاہے میتواں کردن
پیکرِ خودی۔ دم چیست؟ پیام است شنیدی نہ شنیدی
در خاک تو یک جلوہ عام است ندیدی
دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز
واسوختہ یک شرر از داغ جگر گیر
یک چند بہ خود پیچ و نیستاں ہمہ در گیر
چوں شعلہ بہ خاشاک دویدن دگر آموز

(روح شاعر ظلمت سے نکل کر ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے دل پر یقین کا کچھ القا ہونے لگتا ہے)

---

## نواں منظر

## طوفان تجلی

(عمل اور خودی کے پیکر تھوڑی دور چل کے شفق کے ایک جھروکے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب روح شاعر پردوں سے زیادہ لطیف نور کے دھوئیں میں اپنے آپ کو محصور دیکھتی ہے۔ آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت سامنے سے ایک عجیب قسم کا دیو ہیکل جانور نمودار ہوتا ہے جس کا آدھا جسم گوشت کا اور آدھا سخت دھات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کی ایسی تیز دھاریں دوڑتی ہیں کہ شبنمی نور میں ان کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ وہ اژدہے کی طرح چار پاؤں سے رینگتا ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز سامنے آیا۔ اس کی چال میں مایوسی ہے اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ روح شاعر کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور انسانی لب و لہجہ میں کہتا ہے)

جانور۔ خاکدان آب و گل میں عقل کا زنداں ہوں میں
ظلمت و گم گشتگی کا آہنی ساماں ہوں میں
پیکر سنگیں میں میرے جذب نور و نار ہے
میری چشم دوربیں اک روزن دیوار ہے
سرحد افلاک کا عزم سفر تھا رہ گیا
آتنا وزنی ہو کے ہلکی جنبشوں میں بہ گیا
تھا حریف روح و دل اور دشمن جوش جنوں[1]
کر دیا اسرار نے اس بزم میں خوار و زبوں

---

[1] زبور عجم۔

نور کے بادل میں کوئی رہنما ملتا نہیں | جھانکتا ہوں دیکھتا ہوں راستہ ملتا نہیں
سانس رک جاتی ہے جب اپنا بڑھاتا ہوں قلم | منہ جھلس دیتی ہے میرا گرمیٔ لوح و قلم
آہ اتنی منزلیں طے کرکے بھی ناکام ہوں | آہ اپنی روشنی کی ظلمت انجام ہوں

(یہ لشکر عقل کا دیو پیکر رینگتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ایک ایوان کے ریشمی پردوں سے چند ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی زور سے ذکر و شغل کر رہا ہو۔ یہ روح اقبال کا ذکر و شغل ہے)

پہلی آواز۔ عشق[1] ناپید و خرد می گزدش صورت مار | عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا | اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا | زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

دوسری آواز۔ میری[2] متاع حیات علم و ہنر کا سرور | میری متاع حیات ایک دل ناصبور
معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ | معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا | تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور
فیض نظر کے لئے ضبط سخن چاہئے | حرف پریشاں نہ کہہ اہل نظر کے حضور

تیسری آواز۔ یہ ہیں[3] سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام | وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسما
مقام ذکر کمالات رومی و عطار | مقام فکر مقالات بوعلی سینا
مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکاں | مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

(روح شاعر میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک جست میں شبنمی پردوں سے گذر جاتی ہے۔ تھوڑی دور تیز روشنیوں میں چلنے کے بعد اس کے سامنے ایک نور کی چادر سی بہتی ہوئی آتی ہے۔ چادر پر اتنی چمک ہے کہ راستہ نظر نہیں آتا۔ روح شاعر دیکھتی ہے کہ پانی میں سے ایک حور سرخ رنگ کی نکلتی ہے اس کے زجاجی سینے میں ایک زمردیں تیر چھپا ہوا ہے اور اس سے دل کی شکل کا ایک ایک خونیں قطرہ گرتا ہے جس سے نور کی چادر سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ حور درد بھری آواز میں یہ ترانا گاتی ہے)

---

[1] ضرب کلیم ص ۲۹ [2] ضرب کلیم ص ۱۴ [3] ضرب کلیم ص ۱۹

**حورِ دل۔** ہے جلوہ گاہ عرش کی نگاہ میں تجلیاں
حریمِ قدسِ عشق کی خیال میں تسلیاں

خرد کی برق تیز رو ہے زلفِ تابدار میں
جنوں کے لالہ حزیں ہیں قلبِ بےقرار میں

نظر اٹھا کے جب چلوں تو مستیاں نثار ہوں
جھکا کے آنکھ جب چلوں تجلیاں نثار ہوں

قدم قدم پہ جامِ مے لنڈھائے شوخیاں مری
شبابِ زندگی میں ہوں ہزار گرمیاں مری

ازل کی تابشوں سے ہے رخِ حسین تابدار
جبیں شوق سے گرا تجلیوں کا آبشار

قیامت آفریں یہ دل ہجومِ آرزو سے ہے
جگر میں موجِ آتشیں مذاقِ جستجو سے ہے

مری ہتیلیوں میں ہیں فلک کے ماہ و آفتاب
مرے خرامِ ناز میں ہے کہکشاں کا التہاب

مری فضائے زیست میں جنوں کا احتشام ہے
مری حیات خوں چکاں، وصال ناتمام ہے

(اس کے پیچھے ایک روح اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوتے اور قدم قدم پر اپنے آگے چلنے والی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے)

"قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل"

(روح شاعر سیلابِ نور میں سے آگے بڑھتی ہے۔ اب اس کے سامنے ایک زرین تختہ بہتا ہوا آتا ہے جس پر ایک نازنین بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ ہاتھ پانی کو چھوتے ہیں۔ اس کا لباس آئینوں اور تاروں سے بنا ہوا ہے۔ جگہ جگہ سبز شعاعیں تیر کی طرح نکلتی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک ایک بیتاب پیکر بال پریشان ہاتھ پیر مارتے ہوئے تختہ کو تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تختہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے)

(بیتاب پیکر پکارتا ہے)

**بیتاب پیکر۔** گرمیٔ قلب و نظر جذب سے اب کام لے
اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

ٹھوکریں کھاتی ہے گو میرے لئے کائنات
ہل نہیں سکتا کبھی عشق کا پائے ثبات

رقص میں لاتی ہے جب وقت کی گردش مجھے
ملتی ہے کونین میں قلب کی لرزش مجھے

شیشۂ عقل و خرد، ساغرِ چشم و نظر
آئینۂ زندگی پردۂ شام و سحر

منزلِ امن و سکوں مشغلِ علم و عمل
مستیٔ کون و مکاں، بزمِ ابد و ازل

لذت ایمان و دل، دولت شوق وصال — بتکدۂ خوش نگاہ میکدۂ لازوال
سب مری وحشت کے قید سب مرے ساغر میں ہیں — سب مری ٹھوکر میں ہیں سب مری ٹھوکر میں ہیں
گرمیٔ قلب و نظر، جذب سے اب کام لے — اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

(تختۂ نازنین کو لئے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے اور کہتا ہے)

نگاہ شوق کو سیلاب ناز لے کے چلا — صدائے عشق کو طوفان ساز لے کے چلا
رواں ہے حسن نظر نور کے سفینے پر — عروس ناز کو اک بے نیاز لے کے چلا
نظر عروس ہے اور عقل و دل خراب نظر — جو جستجو میں ہوا سرفراز لے کے چلا
جنوں کی دست درازی سے بچ گیا شاید — حسین جلوے کو آئینہ ساز لے کے چلا

(روح شاعر محو نظارہ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے دو فرشتے چاند تارے اوڑھے ہوئے گذرتے ہیں۔ ایک فرشتہ گاتا ہے)

فرشتہ۔ کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش — اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش
دوسرا فرشتہ۔ عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل رہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

(روح شاعر یہاں سے گذر کر ایسے مقام میں آتی ہے جہاں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا ہے خوشبو مجسم معلوم ہوتی ہے۔ رنگ کی دیواریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس طوفان سے دو خوبصورت پھول رقص کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔)

پھول۔
ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی — وہ ساون کے جھولے
وہ حوروں کے قدموں — سے گلزار پھولے
ملی ننھی کلیوں کو — اک خوش نگاہی
وہ کوئل پکاری — الٰہی الٰہی
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

جوانی کی ٹھوکریں ہیں — چاند اور تارے
کنواری صداؤں سے — کوئی پکارے
وہ زریں کمر — لڑکیاں کھلکھلائیں
وہ ہنس ہنس کے — جھولے کی پینگیں بڑھائیں
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

ہر اک بھولی صورت — وحی زندگی کی
ہر اک پاک مورت — کلی زندگی کی
وہ رنگیں ادائیں — متاع جوانی
وہ بھولی صدائیں — سے لن ترانی
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

(ان کے پیچھے ننھی سی قوس قزح ہاتھ میں لیے اور ہاتھ سر پر بلند کئے ہوئے شبنمی پریاں رنگین قبائیں پہنے ہوئے گذرتی ہیں اور گاتی ہیں)

رنگ اور بو کے دریا جاگے — دوڑے تارے آگے آگے
بادل بادل رنگت چھائی — جوگن بن کر قدرت آئی
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں!

اس نگری میں پیت بھری ہو — ڈالی ڈالی دل کی ہری ہے
اپنے آگے نور کا پردہ — اللہ اللہ اللہ اللہ

## آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

(سامنے سے حضرت جبرئیلؑ اڑتے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا سے سیارے تنکوں کی طرح دور ہو جاتے اور فضا ایک نیلگوں نوربن کر رہ جاتی ہے۔ روح اقبال گنگناتی ہوئی گذرتی ہے)

(سینہ کشادہ جبرئیل از بر عاشقاں گذشت — تا شررے بہ او فتد ز آتش آرزوے تو

ہم بہ ہوائے جلوۂ پارہ کنم حجاب را — ہم بہ نگاہ نارسا پردہ کشم زروے تو)

(روح شاعر اقبال کے پیچھے رواں ہوتی ہے۔ وہ حیرت کے ساتھ بلند اور نیلگوں فضا کی طرف دیکھتی ہے جس کی رنگینی وسعت اس کی بلندی کو پوری شان کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کروڑہا میل اوپر گہری فضا میں فرشتوں کا رقص ہو رہا ہے۔ حلقوں کے حلقے ہاتھ میں ہاتھ ملائے اُڑ رہے ہیں ان کے سامنے رنگین ستاروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ فضائے نیلگوں سے روح اقبال آواز دیتی ہے)

(۱) بیا کہ خاوریاں نقش تازہ بستند — دگر مرو بطواف بتے کہ بشکستند

چہ جلوہ ایست کہ دلہا بہ لذت نگہے — ز خاک راہ مثال شرارہ برجستند

تو ہم بہ ذوق خودی رس کہ صاحبان طریق — بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند

غلام ہمت بیدار آں سوارانم — ستارہ را بہ سناں سفتہ درگرہ بستند

(روح شاعر چاروں طرف دیکھتی ہے اور فکر میں ڈوب جاتی ہے)

**روح شاعر۔** یہ تماشائے نظر اور یہ تجلی کا ہجوم — نیلگوں وسعت افلاک میں یہ رقص نجوم

یہ ملائک کی سرِ چرخ منور پرواز — حور و غلماں کی سراپردۂ جاں سوز آواز

اخضریں بحر میں یہ نور کا سیلاب رواں — کشتی حسن میں بیٹھی ہوئی حوراں جناں

اور اس اوج نظارہ پہ مرا ذوق سفر — ہر قدم پر دل بیتاب کو اک خوف و خطر

قاصد شوق ہے کیا محفل ہستی کے لئے — ساغر عشق ہے کیا حسن پرستی کے لئے

کیا مجھے منزل آخر کا پتہ ملتا ہے — کیا مجھے وادی حیرت میں خدا ملتا ہے؟

---

(۱) زبور عجم صفحہ ۱۵۲

(سامنے سے دو فرشتے یہ گاتے ہوئے گذرتے ہیں)

ایک فرشتہ: این دل کہ مراد دی لبریز یقیں بادا | این جام جہاں بینم روشن تر ازیں با[دا]

دوسرا فرشتہ: جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا | تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں [پیدا]

(یہ گا کر فرشتے نیلگوں بلندی کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ روح شاعر اب ایسے مقام پر پہونچتی ہے جہا[ں]

ایک قدم آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ مقام نہایت بلند ہے اور آگے عدم کی طرح عظیم الشا[ن]

سوائے اڑنے کے چارہ نہیں۔ روح شاعر بہت گھبراتی ہے، ایک آواز آتی ہے)

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ | یکرنگی و آزادی اے ہمت مرد[انہ]

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی | یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیما[نہ]

(روح شاعر اڑنے کے لئے کسی فرشتے کی مدد کی طالب ہوتی ہے۔ پھر آواز آتی ہے)

در دست جنوں من جبریل زبوں صیدے | یزداں بہ کمند آور اے ہمت مرد[انہ]

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک وجد طاری ہوتا ہے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتی ہے لیکن ہمراز اور ساتھی کوئی نہ[یں]

ایک کشمکش میں پڑجاتی ہے اور کہتی ہے)

آہ کیا بیگانگی ہے اس طلسم عرش کی | کوئی میری دستگیری کے لئے آتا [نہیں]

پائے ماندن ہے نہ جائے رفتن از طوفان شوق | جذبۂ توفیق بھی یاں ناز فرماتا [نہیں]

(فرشتوں کا ایک جھرمٹ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عقل[1] ہے بے زمام ابھی عشق ہے ناتمام ابھی | نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتما[م ابھی]

دانش و دیں و علم و فن بندگی ہوس تمام | عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عا[م ابھی]

جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی | آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیا[م ابھی]

(روح شاعر دیکھتی ہے کہ پیچھے سے ملتاب نور کھچ رہے ہیں اور اس کے کھڑے رہنے کا مقام تنگ

ہے۔ وہ چیختی ہے اور کہتی ہے)

اے[2] خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر | ذرہ در خود فرو پیچید بیابانے نگر

---

[1] بال جبریل صفحہ ۱۴۸ [2] زبور عجم صفحہ ۸۶

حسن بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گزینت — آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر
بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را — آتشِ خود را بہ آغوشِ نیستانے نگر

(روحِ اقبال کی آواز آتی ہے)

دل زندہ و بیدار اگر ہے تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہیں سب کچھ — ہر لحظہ ہیں سالک کے زماں اور مکاں اور

(روحِ شاعر پوچھتی ہے)

اے رہبرِ حیات مرے بال و پر کو دیکھ — معراجِ رنگ و نور پہ میری نظر کو دیکھ
جی چاہتا ہے قوتِ پرواز کے لئے — بے چین دل ہے گرمیِ دمساز کے لئے
لیکن یہ عزم سوزِ تجلی خدا گواہ — گم کر رہی ہے ذوقِ نظر شوخیِ نگاہ
اس اوجِ منتہیٰ پہ رسائی ہو کس طرح — اور آشکار رازِ خدائی ہو کس طرح

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

می[1] شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادیِ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

(روحِ شاعر ایک آہِ عارفانہ کھینچتی ہے، جس سے اس میں قوتِ پرواز آجاتی ہے اور وہ چشم زدن میں ستاروں سے آگے فضائے نیلگوں میں پہنچ جاتی ہے۔ قریب پہنچنے کے بعد اسے ایک بلند اور عظیم لوح پر شاندار حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے "مقامِ عشق"۔ روحِ اقبال ایک پردۂ زنگیں سے آواز دیتی ہے)

تو[2] اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیمِ جہاں نہیں جس میں — غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

(یہاں روحِ شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چل تو رہی ہے لیکن اس کے پاؤں کسی چیز سے نہیں چھوتے
جدھر نظر ڈالتی ہے اسے کوئی مقناطیسی قوت اپنی طرف کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ساری فضا کا رنگ

---

۱؎ بالِ جبریل ص ۱۴۷۔ ۲؎ زبورِ عجم ص ۲۔

نیلگوں ہے۔ دور دور زمردیں درختوں کی چھاؤں میں زجاجی مینار، گنبد اور محل نظر آتے ہیں۔ فضا میں جو چیز اڑتی ہے دوہری نظر آتی ہے۔ ڈالی پر درافشاں بلور کے جوڑے چہچہاتے ہیں، روح شاعر کا یہاں اس طرح خیر مقدم ہوتا ہے)

مینار۔
وحدت کی صدائیں دیتا ہوں — الفت کی فضائیں دیتا ہوں
نیلی ہے قبا ایوانوں کی — آتی ہے صدا ارمانوں کی
ہر گام پہ زینہ نور کا ہے — ہر جلوہ برق طور کا ہے
جلتا ہے مرے سینے میں چراغ — تھامے ہوئے ہوں میں دل کا ایاغ
آ اور یہ شمع عشق اٹھا — آ حسن ازل کی آگ لگا

بلوریں گنبد۔
ہم یہاں جیتر شادمانی ہیں — زینت فرق آسمانی ہیں
نقش رنگیں ہیں ان فضاؤں پر — خواب شیریں ہیں ان ہواؤں پر
عشق مضطر کا دل لبھاتے ہیں — روشنئ نظر بڑھاتے ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی نگاہ میں کھو جا — چھاؤں میں رنگ و نور کی سو جا

طیور آسمانی۔
اڑتے ہیں گاتے ہیں — برق دل چمکاتے ہیں
قدس جاں دکھلاتے ہیں — تکبیریں برساتے ہیں

اللہ ہو اللہ ہو

رنگ و بو پائے جا — جاں بن کر چھائے جا
اپنا دل بہلائے جا — مستی سے یہ گائے جا

اللہ ہو اللہ ہو

(روح شاعر کے سامنے ایک زرنگار تخت، مرصع درخت کی چھاؤں میں نظر آتا ہے۔ پتے جب ہلتے ہیں تو ان سے بہ یک وقت نغمۂ رنگا رنگ اور نسیم سحری کی موجیں نکلتی ہیں۔ روح شاعر تخت پہ بیٹھ کے ستاتی ہے اور اس کا دل بے اختیار گنگنانا چاہتا ہے)

روح شاعر۔ نغمہ کی چھاؤں نکہت بیدار کی ہوا — رنگوں کے قصر و بام سے آرائش فضا

تنہائی و سکون میں شیریں لطافتیں — ہر جنبش نگاہ میں رنگیں نزاکتیں

دل جلوہ گاہ حسن میں مدہوش اقبالؔ — امید کی شعاع تصور کا اختیار

ہر گام پر حیات نظر آزمائے شوق — ہر بات میں خیال ازل مبتلائے شوق

انوار کے ظروف میں رنگینی خیال — الطاف کے رباب میں اک نغمۂ وصال

جذب و کشش سے خون جگر کھیلتا ہوا — ہنستے ہوئے فراق کا غم جھیلتا ہوا

کون و مکاں مچلتے ہیں لیتے ہیں نام عشق — ہے کتنا دل گداز الٰہی مقام عشق

(روح شاعر یہ گنگناتے ہوئے سو جاتی ہے۔ مدتوں تک سوئے رہنے کے بعد جاگتی ہے تو عالم ہی کچھ اور ہے۔ سوائے تنہائی اور چند دور کے نغموں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لحظہ بہ لحظہ روشنیاں تیز ہوتی جاتی ہیں۔ نور کے پردوں میں لپٹی ہوئی روح اقبال گاتی ہوئی گذرتی ہے)

مردِ[۱] خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(پھر آگے بڑھ کے)

صدق[۲] خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفےٰ، عقل تمام بولہب

گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد — عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

(روح شاعر کہتی ہے)

دل مایوس کا امید بھی غم کھائے گی — اس سفر کی کوئی منزل بھی نظر آئے گی؟

(آواز آتی ہے)

'افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر — کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر'

---

۱؎ بال جبریل ص۱۲۱ و ص۱۳۱ ۲؎ پیام مشرق

(روحِ شاعر نظر اوپر اٹھاتی ہے اور عالمِ محویت میں کہتی ہے)

(۱) چند بہ روئے خود کشی پردۂ صبح و شام را ۔ چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

(اس وقت ہجومِ تجلی سو گنا تیز ہو جاتی ہے۔ نور کی چادریں سیلاب در سیلاب آنے لگتی ہیں۔ روحِ شاعر اپنی آنکھوں کو خیرہ ہوتی ہوئی دیکھتی ہے۔ یکایک چادروں سے ایک علم لہراتا ہوا گذرتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے)

(۲) سطوت از کوہ ستانند و بہ کاہے بخشند ۔ کلہِ جم بہ گدائے سرِ راہے بخشند
گاہ شاہی بہ جگر گوشۂ سلطاں ندہند ۔ گاہ باشد کہ بہ زندانیِ چاہے بخشند

(اس طوفانِ تجلی سے ایک بڑا فرشتہ نکل آتا ہے جس کے پروں پر سیارے ناچتے ہیں۔ وہ کہتا ہے)

مرکبِ عشق ہوں انوار کے پر رکھتا ہوں ۔ سطوتِ کون و مکاں زیر و زبر رکھتا ہوں
مرحبا تجھ کو ملا ذوقِ یقیں، لذتِ عشق ۔ دیکھ آئینۂ کونین میں اب شوکتِ عشق
سوز و سازِ نظر و لذتِ دیدار رہیگا ۔ نگہِ عشق کی اب چشمِ طلب گار رہیگا
پاک کرتا ہے شعاعِ نگہِ حسن طلب ۔ جانِ آلودہ کو دھو، گود میں لے بخششِ رب
گرم کر محفلِ دل سوزِ تجلی کی طرح ۔ مست ہو لذتِ آوازِ تسلی کی طرح
حوصلہ ہے تو یقیں کی نگہِ پاک سے دیکھ ۔ جلوۂ عشق کو اپنے دلِ بے باک سے دیکھ
تیری آہِ دلِ مضطر میں اثر آئے گا ۔ جلوہ شاید تجھے رحمت کا نظر آئے گا

(یہ کہہ کر فرشتہ روحِ شاعر کو لے اڑتا ہے۔ دونوں شفق سے بھی زیادہ رنگین بادلوں سے گذرتے ہیں۔ پھر وہ روح کو ایک بہت بڑے ایوان میں چھوڑ دیتا ہے۔ ایک طرف ستاروں کی طرح جھاڑ اور دوسری طرف چاند کا فانوس آویزاں ہے۔ روحِ اقبال ایک مصلے پر بیٹھی ہوئی گا رہی ہے)

(۳) من بندۂ آزادم عشق است امامِ من ۔ عشق است امامِ من عقل است غلامِ من
جاں در عدم آسودہ بے ذوقِ تمنا بود ۔ مستانہ نواہا زد در حلقۂ دامِ من
اے عالمِ رنگ و بو ایں صحبتِ ما تا چند ۔ مرگ است دوامِ تو عشق است دوامِ من
پیدا بہ ضمیرم او پنہاں بہ ضمیرم او ۔ ایں است مقامِ او، دریاب مقامِ من

---

(۱) پیامِ مشرق (۲) زبورِ عجم (۳) ص ۱۹

(یہاں روح جدھر نظر ڈالتی ہے۔ دیواروں میں تجلیوں کے آئینے نصب کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر جب ان کے سامنے جاتی ہے تو ان میں اپنا عکس نظر نہیں آتا تجلی الٹ کر اس کے منھ پر زد کھاتی ہے۔ روح شاعر کہتی ہے)

"برجہان دل من تاختنش رانگرید کشتن و سوختن و ساختنش رانگرید
روشن از پرتو آں نور درے نیست کہ نیست با ہزار آئینہ پرداختنش رانگرید

(ایوان تجلی میں اب نور کے اتنے سیلاب آنے لگتے ہیں کہ روح شاعر اپنے آپ کو اس میں بہتی ہوئی پاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں آفتاب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ایوان کے چاروں طرف دیکھتی ہے لیکن راستہ نظر نہیں آتا۔ ایوان کہتا ہے)

عشق میں نور کا غبار عشق میں نور کا فشار
عشق میں نور کا حصار عشق میں نور کا منار
حیرت صد نگاہ ہے، حیرت صد نگاہ ہے

ظرف نہیں تو دید کیا گوش نہیں شنید کیا
رنج نہیں نوید کیا سوز نہیں امید کیا
ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے، ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے

سوز یقیں جگا ابھی درد جگر بڑھا ابھی
عشق کو جگمگا ابھی حسن کے گیت گا ابھی
یاں کی یہ رسم و راہ ہے، یاں کی یہ رسم و راہ ہے

دید سے ہے بلند حسن عشق کی ہے کمند حسن
سوز سے ارجمند حسن عشق کی قید و بند حسن
سر دیہان نگاہ ہے، سر دیہان نگاہ ہے

(اس وقت نور کی ایسی موجیں اٹھتی ہیں کہ ایوان تجلی اور روح شاعر دونوں اس میں بہ جاتے ہیں۔

بے انتہا مسافت طے کرنے کے بعد روح شاعر ایک بلند مینار سے ٹکراتی ہے جب روح شاعر سنبھل کر مینار پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا کلس نگاہ کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا ہے حتیٰ کہ نیلگوں رواق سے بھی گذر جاتا ہے۔ روح شاعر اس مینار پر چڑھ جاتی ہے نور کا طوفان نیچے ٹکراتا ہے۔ چڑھتے ہی وہ اطراف کی فضا کو دیکھتی ہے۔ جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوق ازل اس کی طرف آرہا ہے۔ یہ مقام امید ہے۔

روح شاعر امید کی ترنگ میں معشوق ازل کی آمد کے تصور کرکے گاتی ہے)

"نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی ولیکن سوئے مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بے باک تر نہ در حریم جان مشتاقاں تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی"

(مینار کے کلس پر جلوۂ ربانی کوندنے لگتا ہے اور روح شاعر یہ دیکھتی ہے کہ چاروں طرف ایک چکاچوند کرنے والا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اس طرح برق در برق جلوہ در جلوہ پیدا ہو رہا ہے۔ روح شاعر کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ آنکھ بند کرکے جھومنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

از چشم ساقی مست شرابم[۱] بے مئے خرابم بے مئے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی بینم نہ بینم در پیچ و تابم

از من بروں نیست منزلگہ من من بد نصیبم راہے نیابم

(اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مینار اور روح شاعر دونوں گھمائے جا رہے ہیں۔ اس چکر میں وہ عرش کے نیچے ایک ایسے ازلی میدان میں آنکھ کھولتی ہے۔ جہاں فرش شعاعی اور وسعت لاانتہا کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ بہت دور نور کی ایک لکیر پر یقین اور عشق کے پیکر ستاروں کے ساتھ ساتھ گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر یہ کہتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے)

مارا زمقام ما خبر کن مائیم کجا و تو کجائی؟

## پردہ

---

[۱] زبور عجم ص۵۵

# خطابِ آخریں

## شاعرِ مستقبل کی روح :-

رازِ ازل عیاں ہوا سینۂ جبرئیل سے
پوچھ لے زندگی اسے تاب و تبِ خلیل سے

دستِ کلیم کی قسم، نور کا فیض عام تھا
خنجرِ دوست پنجۂ عشق میں بے نیام تھا

قدس کی نیک زندگی روحِ حبیب بن گئی
اوج پہ عشق آ گیا، ایک صلیب بن گئی!

آئینہ سازِ عشق تھیں، غارِ حرا کی خلوتیں
لوٹ رہی تھی اک نظر حسنِ ازل کی دولتیں

چاند ستاروں کی چمک حق کا علم بنی ہوئی
کون و مکاں کی سروری نقشِ قدم بنی ہوئی

روزِ ازل سے اس کا تھا کون و مکاں میں اہتمام
صبرِ حسین پر ہوئی عشق کی زندگی تمام

عرشِ خیال پر وہی نورِ ازل عیاں ہوا
آج پیامِ حسن و عشق نغمۂ جاوداں ہوا

وقت کے آنے والے دور ذوقِ یقیں سے کام لے
قہرِ عمل نہ گر سکے عرش نشیں سے کام لے

جلوۂ روح و عقل و دل آئینۂ خودی میں دیکھ
مستیٔ سوزِ جاوداں ساغرِ بے خودی میں دیکھ

حکمت و علم و فلسفہ، خار و خسِ حیات ہیں
تیری سیاستیں نہیں ظلمتِ شش جہات ہیں

عالمِ حسن دوست میں عشق کی پُرفشانیاں
دور کریں گی دہر سے روح کی ناتوانیاں

عشق کا بادۂ ازل ورثۂ جبرئیل ہے
عشق کی بزمِ آتشیں گل کدۂ خلیل ہے!

(پردہ)

محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی

# دیسی صنعتیں

سنہ ۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن کا بیان ہے کہ "اس وقت جبکہ جدید صنعتی نظام کا جنم بھوم یعنی مغربی یورپ غیر متمدن قبائل سے آباد تھا، ہندوستان کے بادشاہوں کی دولت اور اس کے صناعوں کی چابکدستی کا شہرہ تھا اور اس کے بہت عرصہ بعد بھی جبکہ مغرب کے اولوالعزم تاجروں نے پہلی بار ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس ملک کی صنعتی ترقی یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مگر آج وہی ہندوستان اپنی بیشتر صنعتی ضروریات کے لیئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ قدیم زمانے میں ہندوستان کی صنعتوں کی شاندار ترقی اور انیسویں صدی میں ان کا افسوسناک زوال ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔ اس حالات کے ذمہ دار کئی اسباب ہیں۔ نامساعد حالات بھی، اہل ملک کی غفلت اور باہر والوں کی ریشہ دوانیاں بھی۔ ذیل میں ان اسباب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی صنعتوں کے زوال کا سبب یورپ میں طریق پیدائش میں تبدیلی تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد کاروبار کے سیدھے سادے طریقوں کی جگہ پیدائش برپیمانہ کبیر، پیچیدہ تر تقسیم عمل، اعلیٰ تنظیم اور بڑی بڑی کلوں نے لے لی۔ ذرائع نقل و حمل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، ذرائع معاش کی افزائش اور نوآبادیات کی دریافت نے یورپ والوں کے آگے صنعتی ترقی کا میدان مہیّا کیا۔ ادھر ہندوستان میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی پستی بھی پھیلی۔ حکومت اور عوام کسی نے بھی صنعتی ترقی کی کوشش نہ کی۔ ہمارے ہاں کا کاروبار اسی پرانی ڈگر پر چلتا رہا۔ قدیم درباروں کے تباہ ہو جانے اور مضر بیرونی اثرات کی وجہ سے صنعتوں کا حال پہلے ہی خراب ہو رہا تھا اور بقول مسٹر دت "یورپ میں مشین کی بُنائی کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کی آخری منزل بھی پوری کرا دی"

(۲) دیسی دربار ملک کی مصنوعات کے سرپرست تھے سیاست کی کروٹ نے ان کو تباہ کر دیا۔ عوام میں افلاس پھیلا۔ جدید حاکموں کا مذاق دوسرا تھا۔ وہ قدیم درباری مصنوعات کے قدردان نہ تھے۔

ادھر عوام میں جو لوگ کچھ استطاعت رکھتے تھے۔ اُن پر حاکموں کی تقلید اور مغربی تعلیم کا اثر مذاق کی تبدیلی میں نمودار رہا۔ غرض یہ کہ مصنوعات بے آسرے کے رہ گئیں تباہی یقینی تھی۔

(۳) برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش اور حکومت ہند کی غفلت بھی دیسی صنعتوں کے زوال کا بہت بڑا سبب ہے ایچ، ایچ، ولسن صاحب کی رائے ہے کہ "اگر اس قدر بھاری محصول اور مانعتی قوانین نہ ہوتے تو باوجود خانی قوت کے پیلی اور مانچسٹر کے کارخانے شاید ہی چل سکتے' برطانوی صناع نے سیاسی ناانصافی کے ہتھیار کو اپنے حریف کے نیچا دکھانے کے لئے استعمال کیا کیونکہ برابر کے مقابلہ میں وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔" غرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا یہاں کے صناعوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے کمپنی کی حکومت کے زمانے میں اس کے [illegible] گئے۔ سیاسی قوت کے اثر سے انھوں نے دیس کے بے بس صناعوں کو مجبور کیا کہ وہ کمپنی کے سوا کسی [illegible] دین نہ رکھیں کمپنی کے کارندے اجارے کے سامان کی من مانی قیمتیں مقرر کرتے۔ صناعوں سے زبردستی معاہدہ کراتے کہ وہ کمپنی ہی کا کام کریں گے۔ اگر وہ وعدہ خلافی کرتے تو ان کو قید میں ڈال دیا جاتا۔ بدنصیب صناعوں نے تنگ آکر زراعت کی طرف رجوع کیا مگر ان کی قسمت سے ان کو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔

باوجود اس قدر جور و زبردستی کے بھی ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کے بازاروں میں بکتی رہیں آخر کار انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محاصل عائد کئے گئے کئی ایک صنعتوں کی درآمد انگلستان میں بالکل ہی بند کر دی گئی ذیل میں چند محاصل کی کیفیت واضح کی جاتی ہے۔ جو کہ "نمونہ مشتے از خروارے" ہے۔

| اشیا | برطانوی مال پر ہندوستان کا محصول | ہندوستانی مال پر انگلستان کا محصول |
|---|---|---|
| روئی کی مصنوعات | ۳½ فی صد | ۱۰ فی صد |
| اونی مال | ۲ فی صد | ۳۰ فی صد |
| کچا لوہا | × | ۵ شلنگ فی ٹن |

(۴) انگلستان نے اٹھارویں صدی میں خود تا مین تجارت کی بدولت ترقی کی تھی اور اب جب

اس کی صنعتی حالت مستحکم ہوگئی تو اس نے دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے تاکا۔ اگر یہ ملک اور خاص کر ہندوستان تامین کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے تو انگلستان کے مال کی کھپت ممکن نہ ہوتی۔ اسلئے برطانیہ نے آزاد تجارت کی علمبرداری کی۔ مانچسٹر اور لنکاشائر کے کارخانہ داروں کے دباؤ سے حکومت ہند نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ برطانیہ کے بغیر کسی روک ٹوک کے مصنوعات ملک میں درآمد ہونے لگے اور ہندوستان کے سپرد خام پیداوار پیدا کرنے کا کام ہوا۔

(۵) ضرورت تھی کہ برطانوی مال ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ کر ہندوستانی مصنوعات کا گلا گھونٹے اس کے لئے برطانوی سرمایہ داروں نے سب سے پہلے ریلوں میں روپیہ لگایا۔ اگرچہ یہ کام شروع میں منافع بخش ثابت نہ ہوا مگر چونکہ حکومت ہند نے برطانوی سرمایہ داروں کو منافع کی ایک خاص شرح ادا کرنے کا وعدہ کرلیا تھا اس لئے انھوں نے اندھا دھند روپیہ لگایا۔ ولیم میسے صاحب نے جو وائسرائے کی کونسل کے وزیر مالیات تھے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کے آگے برطانیہ کے سرمایہ داروں کی روش کے متعلق بیان دیا کہ انھیں "اس چیز کی پروا نہیں کہ جو روپیہ انھوں نے قرض دیا وہ کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا ہے یا دریائے ہگلی میں غرق کیا جارہا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کثیر تعداد میں خرچ کیا گیا اور ایسٹ انڈین ریلوے میں فی میل ۳۰۰۰۰ پونڈ خرچ ہوئے" بہرحال اس طرح ریلوں کا جال سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ مشین کی بنی ہوئی سستی بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں دیسی صنعتیں پنپ نہ سکیں۔ ریلوے کے محاصل اس انداز سے مقرر کئے گئے کہ باہر کا آیا ہوا مال ملکی مال سے کم خرچ میں منتقل ہوسکے۔

(۶) دیسی صنعتوں کو کسی قسم کی مالی امداد نہ مل سکی۔ حکومت ہند نے ہندوستان کے زر کے ذخیروں سے انگلستان کے کارخانوں کو روپیہ قرض دیا مگر ملک کی مستحق صنعتوں کی سرپرستی نہ کی۔ حکومت کے بنکاری کے اداروں یعنی پریزیڈنسی بنکوں اور امپیریل بنک نے اہل ہند کے مفادات کی طرف سے ہمیشہ مجرمانہ غفلت برتی۔

(۷) معاہدہ اٹاوہ میں شاہی ترجیح کا اصول تسلیم کیا گیا۔ جس سے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت برآمد کو نقصان پہونچتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ یا برطانوی مقبوضات

کے مقابلہ میں دوسرے ممالک ہندوستان سے زیادہ سامان منگاتے ہیں۔ ترجیح ہمارے لئے صرف اسی صورت میں مفید ثابت ہوگی جبکہ برطانیہ کی مانگ ہماری مشہور اشیائے برآمد کے لئے زیادہ ہو جائے اور غیر ممالک کی مانگ بھی کم نہ ہو۔ ترجیح کا فائدہ مشتبہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ کو ہماری اشیائے برآمدہ کے زیادہ مقدار میں جانے کی امید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں غیر ملکی مال کی درآمد کی کمی کے باعث ان ممالک میں ہندوستانی اشیا کی مانگ یقیناً گھٹ جائے گی۔"

(خیالات پروفیسر برج نرائن صاحب)

غرض یہ کہ ان سب اسباب نے مل کر ہندوستان کی صنعتوں کو موجودہ حالت پر پہونچا دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلابی دور میں حکومت اور اہل ہند کو صنعتوں کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے کیا انگلستان اور امریکہ کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں بھی اسی طرح کی صنعتی ترقی کے حصول کی کوشش کی جائے! یا جدید طرز کی صنعتوں کی طرف سے بالکل بے نیازی برتی جائے! یا پھر جاپان کی طرح جدید صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔

صنعتی ترقی کی نوعیت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہئے کہ صنعتی ترقی محض ایک ذریعہ ہے جس کا مقصود تمام قوم کی معاشی خوش حالی ہے۔ یورپ کے جدید صنعتی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں ذریعہ کو مقصد قرار دے لیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے اکثر سیاسی جھگڑے اسی غلطی کا نتیجہ ہیں وہاں مشین آدمیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جدید انتظام کی بدولت جسے (Rationalization) کہتے ہیں۔ امریکہ میں چالیس فی صدی آدمی بیکار ہو گئے۔ (بحوالہ رسالہ "ہندوستانی اقتصادیات" مضمون متعلقہ معاشی خیالات از مہاتما گاندھی) علاوہ اس کے ان ممالک میں جو پیداوار ہوتی ہے وہ اپنے ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جس کی نکاسی کے لئے ان کو دوسرے ممالک کو اپنی منڈی بنانا پڑتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صد بڑے پیمانے کی صنعتوں میں مشغول ہے اور ہندوستان دنیا میں آٹھویں درجے کا صنعتی ملک تصور ہوتا ہے۔ اگر موجودہ صنعتی پیداوار کو دوگنا کر دیا جائے تو یہ بھی خاصی ترقی ہوگی۔ مگر ہندوستان کی آبادی ہی کا اضافہ ایک فی صد سالانہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی ترقی کا

یہ اضافہ آبادی کے اضافے کی وجہ سے بیکار رہ جائے گا۔ اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جو تمام ملک کے باشندوں کے لئے روزگار فراہم کرنا ہے۔

پھر اگر بالفرض ہم اپنی تمام آبادی کو بھی بڑے پیمانے کی صنعتوں میں لگا دیں تو ہماری صنعتی پیداوار اتنی بڑھ جائے گی کہ ہمیں برطانیہ اور امریکہ سے بھی کہیں زیادہ بڑے علاقے کو اپنی منڈی بنانا پڑے گا اور یہ چیز خود کفالتی اور معاشی بے نیازی کے چرچوں کی وجہ سے بالکل ناممکن ہے۔ ہندوستان محض برآمدی ملک بھی نہیں بن سکتا کیونکہ آج کل تجارتِ خارجہ مبادلہ اشیا کے طریقے پر چلتی ہے۔ جتنی قیمت کا مال ہم برآمد کریں (جس کی مقدار مفروضہ بالا میں بے انتہا ہو گی)، اتنا ہی مال درآمد بھی کرنا پڑے گا لیکن اگر ملک میں اسکی طلب اور مصرف نہ ہو تو تجارت خارجہ سرے سے بند ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ محض جدید پیمانے کی صنعتوں کا چلانا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف قدیم وضع کی صنعتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ یہ مانا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان میں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی کا رواج تھا۔ ملک خود کفیل تھا اور خوشحال۔ مگر آج کل حالات بدل چکے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں یہ طریق کار نہیں چل سکتا۔

بہترین حل اس مسئلے کا یہ ہے کہ قدیم اور جدید صنعتوں کو پہلو بہ پہلو چلایا جائے۔ جاپان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اہل جاپان نے بعض ایسے کاموں کو جو تمام کے تمام مشین سے ممکن تھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں تقسیم کر کے گھریلو دستکاروں کو دیدیا۔ دستکار کارخانوں کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں اور بعد میں اپنے نتائج لا کر کارخانے کو دیدیتے ہیں جہاں مشین کے ذریعہ ان کی تکمیل کر دی جاتی ہے دیا سلائی اور پارچہ بافی خصوصاً ریشم کی صنعت اور بہت سی دوسری صنعتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی طریقہ کامیاب بن سکتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ایک ہی پیشہ کی مسابقت سے چھوٹے دستکاروں کو نقصان کا زبردست اندیشہ ہے لیکن اگر مندرجہ بالا طریقے سے گھریلو صناعوں اور بڑے بڑے کارخانوں میں اشتراک عمل پیدا کر دیا جائے تو بہترین نتائج کا حاصل ہونا یقینی ہے۔ حاصل یہ کہ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینی چاہئے لیکن طریق پیدائش میں اصلاح کر کے جدید مصنوعات سے ان کا ربط

قائم کر دینا چاہئے۔

اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ کیونکر ان دستکاریوں کو ترقی دی جائے۔ ان کی امداد اور اصلاح کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۱) قدیم صنعتوں کی امداد اور ترقی کے لئے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہئے کہ ملک کی تمام گھریلو دستکاریوں کی مکمل تحقیقات کی جائے اور جو صنعتیں اُبھرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کی ممکنہ امداد کی جائے۔

(۲) گھریلو دستکاریوں کی کامیابی کے لئے پہلی ضرورت دستکاروں کی تعلیم کی ہے۔ ان کو عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جاہئیں جگہ جگہ صنعتی اسکول کھولدینے چاہئیں اور اگر ممکن ہو تو عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں بھی دستکاریوں کی تعلیم بحیثیت ایک لازمی مضمون کے دی جائے تاکہ پڑھ لکھ کر ہمارے نوجوان بیکاری کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔

(۳) ضرورت ہے کہ تحقیقات فنی کا ایک ایسا ادارہ کھولا جائے جو گھریلو دستکاریوں کے کاروبار کی اصلاح اور ان کی وسعت کے امکانات پر غور کرے اور دستکاروں کے آگے بہتر سے بہتر لائحہ عمل پیش کرے۔

(۴) عمل پیدائش میں کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ چھوٹے پیمانے کے کاروباروں میں تقسیم عمل کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن جدید آلات اور زیادہ تنظیم کی بدولت تقسیم عمل کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ جدید آلات کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خام پیداوار کی بھی ضرورت ہے تاکہ تیارشدہ اشیا کی قسم بہتر بنائی جاسکے۔ سستی قیمت پر اعلیٰ درجے کی خام پیداوار اور جدید آلات دستیاب نہیں ہوسکتے بغیر معقول مالی امداد کے یہ کام ناممکن ہے

۵۔ مالی امداد۔ صنعتی کمیشن کی رائے ہے کہ صنعتوں کے ناظم کی وساطت سے دستکاروں کو اصل کی ضروریات کے واسطے قرضے دئے جائیں۔ بالاقساط طریقہ خرید پر آلات تقسیم کئے جائیں لیکن بہترین حل اس مسئلے کا شاید امداد باہمی سے ممکن ہے۔ اگر صنعتی بنک کھولدئے جائیں تو وہ نہ صرف بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو مدد دے سکیں گے بلکہ اپنی شاخوں کے ذریعہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی بھی امداد کرسکیں گے۔ بہت سے صوبوں میں صنعتوں کو حکومت کی مالی امداد دینے کے متعلق قوانین بھی بن چکے ہیں لیکن ابھی حکومت کی امداد کو بڑھانے کی بہت ضرورت ہے۔

(۶) دستکاروں کی جہالت اور ان میں کسی تنظیم کا نہ ہونا بھی گھریلو دستکاریوں کی پست حالی کا بڑا سبب ہے۔ کارخانہ داری کا طریقہ قابل اعتراض ہے۔ کارخانہ دار ملازمین سے کام تو لیتا ہے لیکن ان کی فلاح کا زیادہ خیال نہیں رکھتا۔ ضرورت ہے کہ امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ دستکار خود اپنے کارخانے قائم کر لیں۔

(۷) جب تک فروخت پیداوار کی سہولتیں نہ ہوں یہ سب انتظام بیکار ثابت ہوگا۔ منظم بازار نہ ہونے کی وجہ سے دستکار اپنی چیزوں کی پوری پوری قیمت وصول نہیں کرسکتا۔ فروخت پیداوار کے لئے انجمنہائے فروخت کا وجود ضروری ہے۔ ہمارے پاس بیرونی بازار تو ہیں ہی نہیں اور اندرونی منڈیوں کی حالت بھی قابل اصلاح ہے۔ بمبئی کے سودیشی اسٹورز میں ملکی پیداوار کی فروخت کے لئے قابل تقلید نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ محکمہ صنعت کو اس قسم کے تجارتی اداروں کے ساتھ کام کرکے ہندوستان کی دستکاریوں کو اندرون ملک و بیرون ملک کے گاہکوں تک پہونچانے میں مدد کرنی چاہئے۔ بکھری ہوئی دیہی صنعتوں کے اتحاد اور وسیع ترین ممکنہ منڈی کے حاصل کرنے کے لئے مرکز میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنا چاہئے۔ لائسنس یافتہ گوداموں اور امدادی فروخت گاہوں کی بھی ضرورت ہے۔ جہاں دیہی پیداوار کے ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کا انتظام ہو۔

(۸) ایک عام شکایت یہ ہے کہ پبلک کا مذاق بگڑ گیا ہے اور وہ گھریلو دستکاریوں کی طرف توجہ نہیں دیتی اس کے لئے ضرورت ہے کہ دستکاروں کو کام کرنے کے لئے جدید قسم کے نمونے فراہم کئے جائیں نیز ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ دیسی فن کاری کے نمونوں کی تشہیر کی جائے۔ نمائشیں منعقد کی جائیں اور ہر طریقہ سے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا جائے۔ پروپیگنڈے کی ضرورت ہر جگہ ہے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی ہر کوشش میں اس سے کام لینا چاہئے۔

اگر ہم گھریلو صنعتوں کو مکمل طور سے ترقی دینے میں کامیاب ہوگئے تو یقین ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مسئلے یعنی بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آیت اللہ بیگ صاحب عارف

*

# جرمنی اور سوویٹ کی جنگ

## لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ

(اس مضمون کا مواد ٹروٹسکی کی مشہور کتاب THE REVOLUTION BETRAYED سے لیا گیا ہے۔ جوہر صاحب ٹروٹسکی کے معتقدین میں سے ہیں۔ یہ مضمون انھوں نے جنگ کے شروع ہونے پر لکھا تھا۔ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو وہ بخوشی 'جامعہ' میں چھاپا جا سکتا ہے۔" مدیر)

**لینن۔** آج تو عجیب خبر سن رہا ہوں ٹروٹسکی!

**ٹروٹسکی۔** کیا خبر!

**لینن۔** کہ جرمنی اور سوویٹ میں جنگ شروع ہوگئی کیا تمہیں اس کا کچھ علم ہے؟

**ٹروٹسکی۔** جب میں دنیا میں تھا اس وقت تو جرمنی اور سوویٹ میں ایک معاہدۂ آشتی ہوا تھا اور میں اسی وقت سمجھتا تھا کہ اس معاہدہ کی عمر شاید ہی دو برس ہو۔ بہت ممکن ہے کہ جنگ شروع ہوگئی ہو میں ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔ (ٹروٹسکی جاتا ہے اور کچھ دیر بعد معلوم کر کے واپس آتا ہے)

**لینن۔** کیوں ٹروٹسکی کیا معلوم ہوا!

**ٹروٹسکی۔** وہاں تو لاکھوں سپاہی آئے ہوئے ہیں۔ جنگ بڑے زور شور سے جاری ہے۔ روسی افواج پسپا ہو رہی ہیں۔ جنگ شروع ہوئے ۱۲ دن بھی نہیں ہوئے ہیں کہ جرمنی کی فوجیں ماسکو کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ سنتا ہوں کہ سوویٹ فوجیں مقابلہ تو کر رہی ہیں لیکن جرمنی کا پلہ بھاری ہے۔

**لینن۔** یہ کیسے ہوا ٹروٹسکی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میرے بعد بھی ترقی جاری رہے گی اور سوویٹ ایک طاقتور پرولتاری حکومت ہو جائے گا لیکن جرمنی کی کامیابی سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوویٹ کی جو حالت میرے زمانہ میں تھی شاید اس سے بھی ابتر ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے۔

**ٹروٹسکی۔** وہاں کی اقتصادی حالت! کیا حالت بتاؤں! مجھے تو اسٹالین نے روس سے نکال دیا تھا اس لئے جو کچھ

اخباروں اور دوستوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتا رہتا تھا وہی جانتا ہوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے سوویٹ کی تیل کی صنعت کا افسر اعلیٰ لکھتا ہے:۔

"ہماری صنعت میں وہی مشینیں استعمال ہوتی ہیں جو امریکہ میں لیکن ہمارے یہاں ماہر کاریگر کم ہیں اس لئے مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت ہوتی ہے کام کرنے والے لاپروا ہیں اور ماہرین اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرتے"

مولوٹوف کہتا ہے۔

"ہم عمارت کے کام میں بہت پیچھے ہیں۔ عمارت کا کام پرانے طریقہ پر پرانی وضع کے اوزاروں سے کیا جاتا ہے"

اس قسم کے بہت سے جملے سوویٹ کے سربرآوردہ اصحاب کی زبان سے نکلتے رہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کام تسلی بخش نہیں ہو رہا ہے۔ اگرچہ روس میں خام جنسوں کی پیداوار میں کافی ترقی ہوگئی ہے لیکن جب تک ملک میں اعلیٰ قسم کی مشینیں نہ تیار ہوں اسوقت تک لوہے، کوئلہ وغیرہ کی پیداوار بہت کم معنی رکھتی ہے۔ ملک کی صنعت وحرفت زیادہ تر فوجی محکمہ کا کام کرتی رہتی ہے لیکن محکمہ فوج کا اعلیٰ افسر ریشولوٹوف شکایتاً کہتا ہے:۔

"جس قسم کی اشیا فوجی محکمہ کے لئے تیار کی جاتی ہیں ان کی مضبوطی وغیرہ قابل اطمینان نہیں ہوتی" یہ کافی مخدوش بیان ہے۔ رسل ورسائل بڑی خراب حالت میں ہیں۔ سڑکیں اتنی خراب ہیں کہ بڑی شاہراہوں پر موٹر گھنٹے میں صرف ۶ میل چل پاتی ہے۔ ملک میں سڑکیں بہت کم ہیں ہر ۱۰۰۰ آدمیوں کے لئے جرمنی میں ۴،۸ کیلومیٹر اور روس میں صرف ۵ کیلومیٹر ریل ہے۔ سوویٹ میں ریل کی پٹری تمام ترقی یافتہ ملکوں سے کم ہے۔ فرانس میں ۱۰۰۰ آدمیوں کے پاس ۵،۴۸ موٹریں ہیں لیکن روس میں صرف ۶، ہیں۔ سوویٹ میں ایک سال میں مال کی موٹر امریکہ کی مال کی موٹر کی نسبت صرف ۱/۵ سفر طے کرتی ہے۔ ۱۰۰۰ میں سے ۵۵ مشینیں اس قابل نکلتی ہیں کہ کچھ عرصہ کام کر سکیں باقی کو کچھ کام کے بعد مرمت خانہ جانا پڑتا ہے۔ مرمت کا خرچ نئی مشین تیار کرنے سے دوگنا ہے

حکومت اس نقص کا اعتراف کرتی ہوئی کہتی ہے:۔

"موٹر کے ذریعہ سے ریل و رسائل کا خرچ جنس بنانے کے پڑتے کو بہت بڑھا دیتا ہے۔"

بقول (Council of Peoples' Commissaryh) ریل میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویٹ میں ماہر کاریگروں کی بہت کمی ہے۔ اس کمی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ بجلی کی سوئچ صاف رکھنا ایک ایسا مشکل کام ثابت ہو رہا ہے کہ ان کی صفائی کے متعلق کریملین کے سب سے بڑے افسروں کو رپورٹ کی جاتی ہے۔ پراودا اخبار لکھتا ہے۔

"کپڑے کی صنعت بڑی ردی حالت میں ہے۔ مال اکثر ناقص سستا اور صرف دو چار نمونہ کا ہوتا ہے" لوہے کے روزمرہ کے استعمال کے برتن اور فرنیچر بڑا بھونڈا تیار ہوتا ہے۔ ملک کی عام پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ روس میں اچھے قسم کے بٹن ملنے مشکل ہیں۔ دارالخلافہ اور دوسرے تجارتی شہر اپنے آپ کو بڑے اور خوشنما سنیما، تھیٹر اور کلب گھروں سے تو مزین کر رہے ہیں لیکن رہنے کے مکانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اخبار اسوستیا لکھتا ہے۔

"ہم کافی خرچ کرنے کے بعد بھی ایک خراب عمارت بنا پاتے ہیں۔ عمارتیں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خراب حالت میں ہیں۔ مرمت اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو بری طرح اور ناکافی۔"

ملک کی صنعت و حرفت کا چونکہ ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک صنعت کی پسماندگی کا اثر دوسری پر پڑتا ہے اور دوسری کا دس اور پر اس طرح ملک کی تمام صنعت و حرفت آشوبی ہو کر رہ گئی ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ میں ایک مزدور ۲ ٹن کوئلہ نکال پاتا ہے اور جرمنی ۲۰ ٹن نکالتا ہے۔ ایک مزدور سوویٹ میں ۷۶ کیلو گرام فولاد نکال پاتا ہے اور امریکہ میں ۲۵۰ کیلو گرام نکالتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں سوویٹ یونین میں فی کس ۱۵۳ کلو واٹ بجلی حصہ میں آتی ہے اور جرمنی میں ۴۷۲۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں سوویٹ میں ایک میٹر کپڑا فی کس حصہ میں آتا تھا۔ اونی کپڑا صرف سربرآوردہ طبقہ کے لوگوں کو میسر آتا تھا عوام جاڑوں میں بھی سوتی کپڑا استعمال کرنے پر مجبور رہتے۔

سوویٹ یونین میں جتنے لوگ ننگے پیر رہتے ہیں شاید ہی دوسرے ملکوں میں رہتے ہوں۔ سوویٹ میں

ہر ۸ اور جرمنی میں ہر ۶ آدمیوں کے پاس گائے ہے اور اگر دودھ کی مقدار کا حساب لگایا جائے تو جرمنی کی ایک گائے روس کی دو گایوں کے برابر ہے۔ کاغذ کے اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں کیونکہ یہ کسی ملک کی تہذیب و تمدن و ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں روس میں فی کس ۴ کیلوگرام کاغذ خرچ ہوتا تھا۔ اور جرمنی میں ۴۷ کیلوگرام امریکہ میں ایک سال میں فی کس ۱۲ اپنسلیں استعمال کی جاتی ہے اور سوویٹ میں صرف ۴ اور وہ چار بھی امریکہ کی ایک پنسل کے برابر کام دیتی ہیں۔ اخباروں میں اکثر اس قسم کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ کاغذ اور پنسل کی کمی کی وجہ سے اسکول کے کام میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے

**لینن۔** ٹراٹسکی تمہاری باتیں سن کر تعجب ہوتا ہے اگرچہ یہ حالات سنہ ۱۹۳۵ء کے ہیں لیکن اس سے روس کی سنہ ۱۹۴۲ء کی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹالین ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔ مجھے احساس ہے کہ روس اپنی پسماندگی اپنے کاندھوں پر اُٹھا کے چل رہا ہے۔ ہر قوم کو اپنا ماضی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ اشتراکی ملکیت قائم کرنے اور نقشہ کے مطابق اقتصادی زندگی کو ترتیب دینے کا یہ اثر ہوگا کہ روس دس پندرہ سال ہی میں سرمایہ دار ملکوں کے دوش بدوش آ جائے گا۔

**ٹراٹسکی۔** میرا بھی یہی خیال تھا اور اس ترقی کا امکان بھی تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پارٹی کمزور ہو گئی اور حکومتی طبقہ کو دبانے کیلئے ہم نے جو کنٹرول کمیشن مقرر کیا تھا حکومتی طبقہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنے طبقہ کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آپ کے یہاں آنے کے فوراً ہی بعد اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سوشلزم ایک ملک میں جاری کیا جا سکتا ہے اس کو دوسرے ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے کوئی سروکار نہیں۔ جب میں نے یہ کہا کہ سوویٹ کو اقتصادی دوڑ میں بین الاقوامی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رفتار کو بہت تیز کرنا چاہیئے تو مجھ سے کہا گیا کہ میرا بین الاقوامی نقطۂ نگاہ غلط ہے۔ جب میں نے بجلی کا ایک بڑا اسٹیشن بنانے کی تجویز پیش کی تو اسٹالین نے کہا کہ بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لئے ایسا ہے جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا۔ سوویٹ میں اقتصادی ترقی کچھوے کی چال سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا

کی اقتصادی حالت دیکھتے ہوئے ہرن کی رفتار درکار ہے۔

**لینن۔** یہ ایک ملک کا نظریہ کیا ہے؟

**ٹروٹسکی۔** کہ ہم صرف سوویٹ میں اشتراکی نظام قائم رکھ سکتے ہیں، ہمیں بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کرنے کی سعی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسٹالین نے ایک نامہ نگار رائے ہیوورڈ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں انقلاب کرنا نہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اس کی تدبیر کرتے ہیں یہ ایک بڑی تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہم تمام ممالک میں اشتراکی انقلاب کرنا چاہتے ہیں ہمارا ہر کہیں انقلاب کرنا لغو ہے۔ ہاں اگر کوئی ملک خود انقلاب کرنا چاہے تو کرے۔ ہم انقلاب کرنا چاہتے تھے چنانچہ ہم نے انقلاب کر دیا"

**لینن۔** اس پر نامہ نگار نے اسٹالین سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر ایک ملک میں انقلاب کا نظریہ درست ہے تو ماسکو میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کس مقصد کے لئے قائم ہے؟

**ٹروٹسکی۔** بھلا نامہ نگار اس قسم کے سوالات کیسے کر سکتا تھا۔ اس قسم کے سوال وجواب تو ملی بھگت ہوتے ہیں

**لینن۔** جب ہم نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی تو پکار پکار کر کہا کہ مختلف ملکوں کی پرولتاری جماعتوں کو ایک دوسرے کی مدد زبانی نہیں بلکہ ہتھیاروں سے کرنی چاہئے۔ ہم نے خود فنلینڈ، لٹویا، استھونیا، جارجیہ کی مدد لال فوج سے کی تھی جب پولینڈ کی پرولتاری جماعت نے انقلاب کرنا چاہا تو ہم لال فوج لے کر وارسا پر جا دھمکے۔

**ٹروٹسکی۔** ۱۹۲۶ء میں ہم نے چینی کمیونسٹ کی مدد کے لئے کمانڈر اور تنظیم کرنے والے روانہ کئے اور اسی سال لاکھوں ڈالر انگلستان کے ہڑتالی مزدوروں کو روانہ کئے۔ کسی زمانہ میں بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ہمارا بنیادی سیاسی تخیل تھا آج وہ اسٹالین کے نزدیک ایک تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی ہو گیا ہے۔ سنتا ہوں کہ موجودہ جنگ میں یوگوسلاویا پر حملہ ہوا جہاں اشتراکیوں کا زور تھا لیکن سوویٹ کا حکومتی طبقہ باوجود معاہدہ ہونے کے ان کو تباہ ہوتے دیکھتا رہا۔

**لینن۔** اسٹالین اور حکومتی طبقہ نے جب ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنا چاہا تو پرولتاری جماعت

اور ہماری پارٹی کے عام ممبروں نے مخالفت کیوں نہیں کی؟

ٹروٹسکی۔ پارٹی کے عام ممبر اور پرولتاری جماعت کیا مخالفت کرتی۔ آپ کے سامنے ہی خود پارٹی میں ایک اونچے لوگوں کی ذات پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کے دنیا سے روانہ ہوتے ہی اس برسر اقتدار طبقہ نے آپ کی یادگار میں Leninist levy کی یعنی پارٹی کے دروازے کھول دئے اور جس کسی نے درخواست کی اسی کو پارٹی کا ممبر بنا لیا۔ چنانچہ پارٹی میں بے انداز بورژوازی اور پٹ پونجیا بورژوازی داخل ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انقلاب کرنے میں تو حصہ نہیں لیا تھا لیکن جو انقلاب سے فائدہ اٹھانے میں پیش پیش تھے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر حکومتی طبقہ سے جا ملے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پارٹی میں حکومتی طبقہ کی بہت بڑی اکثریت ہو گئی اور بلا خوف مخالفت حکومتی طبقہ اپنے مفاد میں حکومت چلانے لگا۔ حکومتی طبقہ نے آہستہ آہستہ نہ صرف مرکزی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اعمال کو بدل دیا بلکہ دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹی کے احرار کو بھی اپنے اثر سے بدل ڈالا اور بجائے انقلابی لوگوں کے ایسے لوگوں کو لیڈر مقرر کر دیا جو سوویٹ کے حکومتی طبقہ کی پالیسی کے مطابق چلیں۔ سوویٹ کی پالیسی اسٹالین کے محدود انقلاب کے نظریہ کی بموجب صلح کل تھی ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنے کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو مدد نہیں دی گئی اور وہ تباہ ہو گئیں ان کی تباہی کا روس کی پرولتاری جماعت پر یہ اثر ہوا کہ ان کا دل بیٹھ گیا۔ میرے ہم خیال لوگوں کی بابت حکومت نے یہ کہنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پیش کر کے سوویٹ کو دوسرے ملکوں سے لڑوانا چاہتے ہیں۔ ہم کافی زخم کھا چکے ہیں۔ اب ہمیں حق ہے کہ کچھ عرصے آرام کریں۔ ہم اپنے ملک میں اشتراکی نظام رکھیں گے سب کو چاہئے کہ لیڈروں کی رہنمائی پر اعتبار کریں"

حکومتی طبقہ کا آرام کا نظریہ اکثریت کو بھا گیا۔ "بین الاقوامی پرولتاری متحد ہو جاؤ" کا نظریہ پیچھے جا پڑا۔ اسٹالین کی سیاست بین الاقوامی نظریہ سے ہٹ کر ملکی اور قومی نقطہ پر آ ٹھہری اور دوسرے ملکوں کی پرولتاری تحریکوں کی فنا و بقا کا معیار یہ ٹھہرا کہ روس کا مفاد کس میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ہر ملک میں قومی اور ملکی مفاد کا نظریہ زور پکڑ گیا اور سوویٹ منجملہ اور سلطنتوں کے ایک سلطنت ہو گیا۔ سوویٹ کی ملکی اور قومی سیاست کا یہ اثر ہوا کہ تمام یورپ میں فسطائی رجحانات زور پکڑ گئے اور فسطائی ڈکٹیٹر برسراقتدار آگئے۔ میں برابر یہ اعلان کر رہا تھا کہ بین الاقوامی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرو اور دوسرے ملکوں کی سرمایہ دارانہ معاہدہ کرنے کے بجائے ان ملکوں کی پرولتاری جماعت سے اتحاد عمل رائج کرو اور ان کو ہر امکانی کوشش سے طاقتور بناؤ تاکہ اگر کوئی سرمایہ دار حکومت روس پر حملہ بھی کرنا چاہے تو مقامی پرولتاری جماعت کے خوف سے سوویٹ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اگر آج جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی طاقتور ہوتی اور اس کا مطمع نظر کسی ملک اور قوم کا بچانا نہ ہوتا بلکہ ان اصولوں کو بچانا ہوتا جو ہمارے اکتوبر کے انقلاب کے حاصل ہیں تو روس کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ستم تو یہ ہو رہا ہے کہ سوویٹ کے احرار کی تقریروں میں بھی عوام سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ مادر وطن کو بچاؤ۔ سوویٹ کی ایک انچ زمین کے لئے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو وغیرہ۔ درحقیقت کہنا یہ چاہئے کہ اشتراکی ملکیت کو بچاؤ۔ غریب کی آزادی کو بچاؤ۔ اشتراکی طریق پیداوار کو بچاؤ (اب سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا بھی وہی تخیل ہے جو سرمایہ دار ملکوں کا) واقعہ یہ ہے کہ جرمنی سے قبل ہی سوویٹ میں ڈکٹیٹری حکومت قائم ہو گئی تھی اور برجوازی اثرات اتنے نمایاں ہو گئے تھے کہ عوام میں ایک لفظ (Sov Born) عام ہو گیا تھا۔ یہ لفظ Soviet Bourgeois کا مخفف ہے۔)

لینن۔ پارٹی نے بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پس پشت ڈال کر روسی انقلاب کو فنا کر دیا۔ ہماری تو زندگی ہی بین الاقوامی انقلاب کی مرہون منت ہے شروع زمانہ میں آسٹریا اور جرمنی کی فوجیں اس وجہ سے ہم پر حملہ نہ کر سکیں کیونکہ ان ممالک میں خود انقلابی حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کوئی چار ماہ کے اندر ہی اندر جرمنی آسٹریا اور ہنگری میں بلوے ہو گئے اور بریسٹ لٹوسک کا معاہدہ جو ہمارے مفاد کے خلاف تھا خود بخود کالعدم ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں کالے سمندر میں ملاحوں نے بلوہ کر کے فرانس کو مجبور کیا کہ روس سے فوجیں ہٹائے۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں مزدوروں کی جدوجہد سے مجبور ہو کر انگلستان نے

اپنی فوجیں روس سے ہٹائیں جب ہمیں ۱۹۲۰ء میں وارسا پر شکست ہوئی تو یہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت کی جدوجہد تھی جس نے سرمایہ دار ملکوں کو پولینڈ کی مدد پر آنے سے روکا دراصل سوویٹ کی طاقت کا انحصار دو قسم کی فوجوں پر ہے ایک تو سوویٹ فوج اور دوسرے ہماری وہ فوج جو سرمایہ دار ملکوں میں ہے یعنی سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت وہ بھی ہماری فوج ہی ہے اس فوج کو طاقتور بنانا بھی ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ سوویٹ کی فوج کا پرولتاری جماعت خفیہ سازشوں سے دشمن کو سوویٹ فوج کی نسبت زیادہ نقصان پہونچا سکتی ہے۔

**ٹروٹسکی۔** لیکن آج کل تو ایک تیسری فوج کو طاقتور بنایا جا رہا ہے۔

**لینن۔** وہ کونسی؟

**ٹروٹسکی۔** خفیہ پولیس (G.P.U) جس نے روس میں ایسا غدر مچایا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے اور سب انقلابی لوگ سائبریا پہونچا دیے گئے ہیں۔ میں بھی اسی پر زور دیتا تھا کہ یورپ کی پرولتاری جماعت اور دنیا کی محکوم قوموں سے اتحاد عمل پیدا کرو لیکن روس جمعیتہ الاقوام میں داخل ہوکر موجودہ ملکی تقسیم کا حامی ہو رہا تھا۔ اور وہ موجودہ ملکی تقسیم کی پالیسی اس قسم کی تھی کہ جب اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تو اٹلی کے بیڑے کو باکو سے تیل جاتا رہا۔ جب جاپان نے مشرقی چینی ریل پر قبضہ کر لیا تو سوویٹ نے کان تک نہ ہلایا کہ کہیں دنیا کی صلح ختم نہ ہو جائے۔ اس رویہ سے جاپان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی جرأت اور بھی بڑھی اور جاپان نے منگولیا پر بھی آنکھ ڈالی سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا تضاد سرمایہ دار ملکوں میں جنگ برپا کر دے گا۔ اور جس نسبت سے سرمایہ دار ملک تباہ ہوں گے اسی نسبت سے سوویٹ طاقتور ہو جائے گا اور پھر ان ملکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی انقلاب کرنا آسان ہو جائے گا۔ میں نے امریکہ میں بیان دیتے ہوئے صاف صاف کہدیا تھا کہ سرمایہ دار حکومتیں آپس میں خواہ کتنا ہی کشت و خون کریں لیکن دوران جنگ میں ایک ایسا موقعہ ضرور آئے گا جبکہ وہ آپس میں لڑنے کے بجائے سوویٹ پر حملہ کر دیں گے۔

**لینن۔** ٹراٹسکی یہ تو بتاؤ لال فوج کا کیا حال ہے۔

**ٹراٹسکی۔** ۱۹۳۵ء میں جبکہ جرمنی کی طرف سے خطرہ نہیں تھا اسوقت کل فوج ۶۲۰۰۰۵ تھی جرمنی سے خطرہ ہوا تو ۳۰۰۰۰۰۰ کر دی گئی تھی لیکن اب فوجی نظام بدل دیا گیا ہے۔ آپ کے زمانہ میں تو فوج میں جمہوری طریقہ پر انتخاب کے بعد افسر مقرر کئے جاتے تھے جس طریقہ کار کی یہ خوبی تھی کہ لائق اور تجربہ کار لوگ افسر مقرر ہوتے تھے لیکن اب حکومتی طبقہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر افسر مقرر کرتا ہے۔ ہم نے فیلڈ مارشل، جنرل، کمانڈر وغیرہ کے خطابات اڑا کر مساوات قائم کی تھی لیکن اب وہ سب خطابات از سر نو جاری ہوگئے ہیں اور فوجی افسروں کی ذاتیں بن گئی ہیں۔ دراصل فوج بھی سماج کا ایک جزو ہوتی ہے۔ جب سماج میں ذاتیں بن گئیں تو فوج کہاں بچ سکتی ہے۔ چنانچہ نا اہل لوگ فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر آگئے ہیں جس کا نتیجہ اس جنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سوویٹ فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔ سامان حرب جس قسم کا بنا ہوا ہے اس جنگ سے اس کا بھی پردہ فاش ہوگیا۔ جب میں ان امور پر تنقید کرتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ ٹراٹسکی تو اسٹالین کا رقیب ہے اس لئے تنقید کرکے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے لیکن اب سنتا ہوں کہ سامان حرب کے لئے انگلستان اور امریکہ سے التجا ہو رہی ہے اور فیلڈ مارشل بدلے جا رہے ہیں۔

**لینن۔** ٹراٹسکی۔ آخر اس جنگ کا کیا نتیجہ ہوگا؟

**ٹراٹسکی۔** جہاں تک میں سمجھتا ہوں خواہ اسٹالین فتح پائے یا شکست سوویٹ کا جو کچھ بھی بگڑا ہوا نظام ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اگر دوسرے ممالک میں پرولتاری انقلاب ہو جائے تب تو البتہ امید ہے کہ اشتراکی نظام اور مستحکم ہو جائے۔ بہت ممکن ہے کہ جیسے پہلی جنگ میں سرمایہ داری کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ٹوٹ گئی تھی اسی طرح اس جنگ میں شاید سرمایہ داری کی کوئی مضبوط کڑی ٹوٹ جائے۔ اس وقت ہمارے اشتراکی اصولوں کی فتح ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کی مدد سے اگر سوویٹ کو فتح بھی ہوگئی تو وہ ملک سوویٹ کو مجبور کریں گے کہ اشتراکی نظام کو خیرباد کہے بلکہ شاید حکومتی طبقہ ان کی مدد کی احسان مندی میں خود ہی اشتراکی اصول چھوڑ دے۔

لینن۔ اگر سرمایہ دار ملکوں کو فتح ہو گئی اور جنگ کے دوران میں پرولتاری انقلاب نہیں ہوا تو پھر سرمایہ داری کا تضاد دوبارہ رنگ لائے گا اور دوبارہ جنگ ہو گی

ٹروٹسکی۔ یقیناً اب دنیا کے سامنے دو راستے ہیں یا تو اشتراکی اصولوں کو اختیار کرے ورنہ تباہ ہو جائے انسان فطرتاً اپنی بربادی نہیں چاہتا۔ اس لئے لازمی ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان ایک دوسرے کی بربادی سے متاثر ہو کر اشتراکی اصول قبول کرے۔ ہم اسٹالین اور سوویٹ کی حکومت کی طرف سے مایوس ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی پرولتاری جماعت سے قوی امید ہے کہ وہ دنیا کو بربریت کی طرف جانے سے روکے گی۔

لینن۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسٹالین اور سوویٹ روس تباہ ہو سکتے ہیں لیکن وہ اشتراکی اصول فنا نہیں ہو سکتے۔ اور سرمایہ داری کا تضاد دنیا کو اس پر مجبور کرے گا کہ پھر اکتوبر کے انقلاب کو زندہ کیا جائے۔

م۔م جوہر صاحب میرٹھی

# زندگی اور موت

## سائنس کی روشنی میں

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
(چکبست)
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

جب ہم اپنے جسم اور اس کی ساخت پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو دماغ ایک سوال پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ ہم کیا ہیں کیوں بنے اور کیسے بنے؟

کیا واقعی ہمارا تعلق کسی طرح سے ایک خلیہ کے جانور امیبا سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ تعلق ہے تو اس کی کیا شہادت ہے؟

یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم انسانی وجود کی ابتدا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم کو صاف طور سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ضرور ہمارا تعلق دنیائے وجود کے کسی نہ کسی زمانہ میں اِس ایک خلیہ کے جانور امیبا سے تھا۔ ہم اور ہم کیا تمام عالم حیات اپنی زندگی ایک خلیے سے شروع کرتے ہیں۔ انڈا ایک خلیہ ہے اور مادہ منویہ کے دو چھوٹے خوردبینی کرمِ حیات (SPERMS) بھی ایک خلیے کے جانور ہوتے ہیں۔ انھیں دو خلیوں یا ان کے نواۃ کے آپس میں ایک خاص طریقہ کے اختلاط (ملاپ) سے ہمارا وجود عالم ہستی میں آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انڈے یا منی کے اجزائے تولید و تناسل (SPERMS) ایک خلیے کے جانور امیبا سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱) دونوں ایک خلیے کے بنے ہوئے ہیں۔

(۲) دونوں میں ایک ایک نواۃ موجود ہوتا ہے۔

(۳) دونوں اجسام حیاتیات کی طرح کھاتے ہیں۔ ہوا اپنے جسم کے اندر لیتے ہیں اور بیکار اجزا اپنے جسم سے خارج کرتے ہیں۔

(۴) اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں میں حیات، مع اپنے لوازمات کے موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ حیات ہے کیا شئے؛

یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر کیمیادی مرکب کی ایک خاص خاصیت ہوا کرتی ہے مثلاً پانی دو ہواؤں کا مرکب ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ معمولی درجہ حرارت پر رقیق ہوجاتا ہے۔ اونچی جگہ سے نیچی جگہ کو بہتا ہے اور جس برتن میں رکھا جاتا ہے اس کی سطح کو گیلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے مادہ حیات (Protoplasm) میں بھی چند خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

(۱) یہ مادۂ حیات بھی ایک کیمیادی مرکب ہے۔ اس میں کاربن، گندھک، آکسیجن اور پانی وغیرہ ایک خاص کیمیادی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

(۲) ہر ایک جاندار خلیے میں مادہ حیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسی مادہ حیات کی بدولت ہمارے جسم کا ہر خلیہ ہوا لیتا ہے جو کہ زندگی کی ایک نشانی ہے

(۴) ہر خلیہ کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی غذا مادۂ حیات کی زیست کو برقرار رکھتی ہے۔

(۵) فضلہ کا بدن یا خلیہ کے باہر نکلنے کی خاصیت بھی مادہ حیات ہی کی ایک ادنیٰ سی خصوصیت ہے۔

(۶) تولید و تناسل بھی مادہ حیات کی خصوصیات کا ایک کرشمہ ہے۔

ہم نے یہ دیکھا کہ ہماری حیات کا دارومدار اسی حیات پر ہے جو کہ ہمارے جسم کے ہر خلیہ میں موجود ہوتا ہے لیکن اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی صرف مادہ حیات کی خصوصیات ہی کا نام ہے یا اس میں کوئی اور راز بھی پنہاں ہے یا یوں کہیے کہ مادہ حیات میں یہ حیات آئی کہاں سے اور ہے کیا شے؛

اگر ہم حیات کو ایک طبیعاتی نظر سے دیکھیں تو ہم اس کو ایک برقی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ کلیولینڈ کے ڈاکٹر کرائل نے تو اپنے تجربات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حیات بجلی کے جاپج ہی کا نام ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی یہ رائے کسی فلسفیانہ یا خیالی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ رائے ان کے مشاہدات و تجربات پر منحصر ہے

ڈاکٹر موصوف نے ایک کتے کا تھوڑا سا بھیجہ بجلی کے ذریعہ سے جلا کر خاک کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ مادہ فنا تو ہو نہیں سکتا ہاں ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھیجے کو خاک

کی شکل میں تبدیل کرکے اس خاک میں سے کچھ نمک اور دوسرے اجزا کو کیمیاوی تحلیل سے علیحدہ کیا اور پھر اس میں کچھ لحمیات اور کچھ اور چیزیں ملا دیں۔ اب اس سفوف کو بجلی کے ذریعہ تحریک دینے سے ڈاکٹر صاحب مصنوعی زندہ خلیوں کے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کامیاب تجربہ نے ان کی امیدوں کو بڑھا دیا اور کئی اور تجربوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے امیبا پر ایک تجربہ کیا جس نے ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ حیات بجلی کی لہر ہی کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک بڑے جانفشاں تجربہ سے معلوم کیا کہ امیبا میں منفی (-) قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف بجلی کی قسم ہی معلوم کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے اعلیٰ تجربات کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس امیبا میں ایک دولٹ کے ساٹھویں (۱/۶۰) حصہ کے برابر منفی بجلی ہوتی ہے۔ یہ معلوم کرکے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوردبینی بجلی کے تار سے مثبت (+) بجلی جس کی مقدار بھی ۱/۶۰ دولٹ تھی اس امیبا میں داخل کی طبیعیاتی اصول کے مطابق نتیجہ یہ ہوا کہ دو متضاد اور ہم مقدار قسم کی بجلیوں کے ملنے سے دونوں قسم کی بجلیوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اور وہ امیبا جو کہ پہلے تیزی سے چلتا پھرتا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور نسل کو بڑھاتا تھا حیات کی یہ تمام خصوصیات کھو بیٹھا اور آخر میں اس دنیائے فانی سے عالم بقا کی طرف رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تجربات سے یہ بھی معلوم کیا کہ اگر مثبت (+) قسم کی بجلی کی مقدار اس اصلی منفی (-) قسم کی بجلی کی مقدار سے کم یا زیادہ ہو جائے تو امیبا نہیں مرتا۔ اس کو اجل کا گھونٹ جب ہی پینا پڑتا ہے جبکہ دونوں قسم کی بجلیوں کی مقدار یکساں ہو۔ اگر ایک قسم کی بجلی دوسرے قسم کی بجلی سے زیادہ یا کم ہو جائے تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متضاد ہم مقدار بجلیاں تو ایک دوسرے کا اثر زائل کر دیتی ہیں اور بچی ہوئی بجلی حیات کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا جسم امیبا جیسے سیکڑوں بلکہ لاانتہا خلیوں سے بنا ہے اور ہمارے جسم کا ہر خلیہ ایک قسم کی بیٹری ہے کم عمر اور نوجوان خلیے بہت تیز بجلی پیدا کرتے ہیں لیکن زیادتی عمر کے ساتھ اس بجلی کی طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ اسی بجلی کی طاقت کا بالکل زائل ہو جانا جیسے کہ شہر کی بجلی اور دیگر بجلی کے کام کا دارومدار پاور ہاؤس کی بجلی کی مقدار پر منحصر ہوتا ہے اسی طرح ہمارے افعال اور حرکت

وغیرہ کا دار و مدار بھی انھیں خلیہ نما بیٹریوں پر منحصر ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی حیات اور موت کی تعریف پوچھے تو ہم یوں کہہ سکیں گے کہ حیات جانور کے عالم وجود میں آنے کا وہ زمانہ ہے جبکہ بجلی کی طاقت یا اور زیادہ صحیح الفاظ میں بجلی کا پوٹینشل ( ) موجود ہو اور موت اسی قوت یا Potential کے ضائع یا منتشر ہو جانے کا نام ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ پانی ایک اونچی سطح سے نیچی سطح کو بہتا ہے اسی طرح سے بجلی یا برق ایک اونچے potential سے نیچے potential کو بہتی ہے۔

روس کے دو سائنسدانوں نے کتے کا ایک سر اور انسان کا دل ان کی موت کے کئی گھنٹے بعد تک زندہ رکھا ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹر اے کیرل کے دار التجربہ میں بیس سال کے مرے ہوئے مرغی کے بچوں کے جسمانی خلیے زندہ اور تندرست موجود ہیں۔ حالانکہ مرغی کی زندگی عام طور سے پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے جسمانی خلیات کو ایسی فضا میں رکھا کہ وہ ۲۰ سال سے زندہ ہیں۔

یہ سن کر ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ہمارے جسم کے زندہ خلیات بجلی کی قوت یا Potential کے لحاظ سے حیات ابدی رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے جانور اور اشرف المخلوقات انسان کو اجل کا جام پینا پڑتا ہے؟

دراصل یہی ایک مسئلہ ہے جس نے سائنسدانوں کے دماغ کے پرخچے اڑا دئے ہیں اور مذہب اور عالم ارواح کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا ہے ورنہ اگر حیات دائمی ہوتی تو نہ تو کوئی مذہب کا نام لیتا اور نہ جنت دوزخ کا خیال اس کو خوشی یا رنج پہنچاتا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا لیکن ہاں اگر واقعی دار التجربہ میں ایسے حالات اور فضا پیدا کی جا سکتی ہے جس میں کہ انسانی جسم کے کٹے ہوئے اعضا زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انسان کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتے؟

ڈاکٹر کیرل صاحب اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے جسم کے خلیات اگر علیحدہ علیحدہ کر لئے جائیں تو وہ غیر فانی ہیں لیکن جب وہ دو یا دو سے زیادہ ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے جسم کو

ترتیب دیتے ہیں تو ان کا تعلق پڑوس کے دوسرے خلیوں اور بھیجے سے ناقابل علیحدگی ہو جاتا ہے اور یہی خلیوں کا الجھاؤ یا ایک جگہ جمع ہونا ہماری موت اور بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک زندہ خلیہ (جیسے امیبا) اپنے زہریلے اندرونی فضلہ کو اپنے جسم سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے لیکن ان اجسام زندگی کو جن کا جسم کئی خلیوں کا بنا ہوتا ہے ان زہریلے اجزائے فضلہ کو جس کی کہ ہمارے جسم کو قطعاً ضرورت نہیں ہوتی جسم سے باہر پھینکنے کا موقعہ نہیں ملتا اور وہ زہریلے اجزا جسم کے باہر نہیں نکلتے برخلاف اس کے امیبا میں یہ اجزا جسم یا خلیہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جسم میں زہریلے اجزا کا قیام ہماری موت کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیہ کا جانور مثلاً امیبا کبھی اپنی قدرتی موت سے نہیں مرتا۔

قدرت کے اس قانون کو سن کر ہمیں اپنی بدبختی پر نہایت ہی افسوس ہوتا ہے اور فوراً ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش کیا اچھا ہوتا اگر امیبا کی طرح ہم بھی غیر فانی ہوتے لیکن موت تو انسان کے اعلیٰ وارفع ہونے کی دلیل ہے اور بغیر اس کے زندگی کا مزا ہی کیا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

عبدالحسیب صاحب
متعلم مسلم یونیورسٹی

(ترجمہ "کینڈڈا" مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

## تیسرا ایکٹ

(رات کے دس بج چکے ہیں، پردے کھنچے ہوئے ہیں اور لیمپ روشن ہیں۔ ٹائپ رائٹر اپنے کیس میں رکھا ہوا ہے۔ بڑی میز بالکل صاف کر دی گئی ہے۔ ہر بات سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کی مصروفیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کینڈڈا اور راچ بینکس آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ پڑھنے کے لئے لیمپ پنیل پر یوجین کے سر کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ وہ خود چھوٹی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی کتاب زور زور سے پڑھکر سنا رہا ہے۔ کچھ مسودات اور شاعری کی دو تین کتابیں پاس ہی قالین پر رکھی ہوئی ہیں کینڈڈا آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ پیتل کی آگ کریدنی اس کے ہاتھ میں ہے۔ آرام سے جھکی ہوئی ہے اور آگ کریدنی کو اٹھائے بہت محویت سے اس کی نوک دیکھنے میں مشغول ہے۔ پیر آگ کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جاگ تو رہی ہے مگر بالکل کھوئی ہوئی سی۔ خیالات اپنے ماحول سے میلوں دور ہیں۔ یہاں تک کہ یوجین کی موجودگی کا بھی ہوش نہیں ہے)

ی م۔ (پڑھتے پڑھتے رکتے ہوئے) دنیا کے ہر شاعر نے اس خیال کو باندھا ضرور ہے بلکہ اسے باندھنا پڑتا ہے۔ وہ مجبور ہے اس کے لئے (وہ کینڈڈا کی طرف رائے لینے کے لئے دیکھتا ہے لیکن کیا دیکھتا ہے کہ وہ کریدنی میں کھوئی ہوئی ہے) کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟ کوئی جواب نہیں! مسز مارل!

ک۔ (چونک کر) کیا؟

ی م۔ کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟

ک۔ (کافی سے زیادہ اخلاق ظاہر کرتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھی نظم ہے۔ آگے پڑھو یوجین میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اُس فرشتہ کا کیا حشر ہوتا ہے

ی م۔ (مسودہ کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہوئے) معاف کیجئے گا کہ میں نے آپ کو خواہ مخواہ اس قدر زحمت دی۔

ک۔ لیکن تم نے مجھے بالکل زحمت نہیں دی۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ میں سن رہی تھی۔ مہربانی سے اور آگے پڑھو۔

ی م۔ مگر میں نے وہ فرشتہ والی نظم تو کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ختم کر دی۔ اس کے بعد سے اور بہت سی نظمیں بھی پڑھ چکا ہوں۔

ک۔ (شرمندگی سے) اچھا تو پھر مجھے واقعی افسوس ہے۔ یوجین خیال ہے کہ اس کریدنی نے مجھ پر ہپناٹزم کر دیا ہوگا (وہ اسے نیچے رکھ دیتی ہے)

ی م۔ مجھ کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی

ک۔ تو پھر تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہیں دیا میں اسے فوراً رکھ دیتی۔

ی م۔ لیکن میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا معلوم ہوتا تھا گویا یہ کوئی اسلحہ ہے۔ اگر میں پرانے زمانہ کا کوئی ہیرو ہوتا تو میں اپنی تلوار اپنے اور آپ کے درمیان رکھدیتا۔ اگر مارل آجاتا تو وہ یہی سمجھتا کہ آپ نے کریدنی اسی لئے اٹھالی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تلوار نہیں تھی۔

ک۔ (متعجب ہو کر) کیا؟ (تعجب کی نظر سے اسے دیکھ کر) میں سمجھ نہیں پائی تمہاری نظموں نے میرا دماغ بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ آخر ہمارے درمیان تلوار کیوں ہوتی؟

ی م۔ (ٹالتے ہوئے) یونہی، کچھ نہیں (اپنا مسودہ اٹھانے کے لئے جھکتا ہے)

ک۔ نہیں یوجین، بس اب رہنے دو۔ آخر میرے شوق شاعری کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ وہ خواہ تمہاری شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ تم دو گھنٹے سے زیادہ یعنی جب سے جمیس گیا ہے۔ پڑھتے رہے ہو۔ اب میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے ڈر کر) نہیں مجھ کو باتیں نہیں کرنی چاہئیں (وہ ادھر اُدھر بھولا ہوا سا دیکھتا ہے اور پھر اکیم

کہنے لگتا ہے، میں جاتا ہوں ذرا باہر جا کر پارک میں دو ایک چکر لگا آؤں دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ بیوقوف پارک تو کبھی کا بند ہو گیا ہو گا۔ اِدھر آؤ اور قالین پر بیٹھ جاؤ اور اپنی وہی شیخ چلی والی باتیں اڑاؤ۔ میں اب ذرا تفریح چاہتی ہوں تم بھی تو چاہتے ہو گے؛

ی م۔ (ڈرتے ہوئے اور خوش ہوتے ہوئے) ہاں!

ک۔ اچھا تو پھر ادھر آؤ (وہ اپنی کرسی کچھ پیچھے دبا لیتی ہے تاکہ اس کے لئے جگہ نکل آئے۔ وہ پہلے تو کچھ ہچکچاتا ہے پھر ڈرتے ڈرتے آتشدان کے قریب بچھے ہوئے کمبل پر لیٹ جاتا ہے۔ اس کا سر کینیڈا کے گھٹنوں پر ہے اور نظر اس کے چہرے پر)

ی م۔ آج میں دن بھر اس قدر پریشان رہا ہوں کہ کیا بتاؤں اور وہ سب اس لئے کہ قاعدہ کی باتیں کر رہا تھا اور اب جبکہ بے قاعدہ باتیں کر رہا ہوں میں خوش ہوں۔

ک۔ (مسکرا کر شفقت سے) ہاں میرے خیال میں تم اب اپنے کو بڑا پختہ شریر اور تجربہ کار کامیاب فریبی سمجھ رہے ہو گے اور خود پر نازاں! کیوں نا؛

ی م۔ (اپنا سر جلدی سے اوپر اٹھاتے ہوئے اور اس کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے) ذرا ہوشیار رہیے گا۔ میں آپ سے بہت زیادہ تجربہ کار اور معمر ہوں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا (گھٹنوں پر الٹ جاتا ہے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پڑی ہوئی ہیں اور ہاتھ اس کی گردن میں ہیں۔ آواز میں جذبہ آجاتا ہے اور خون میں گرمی) کیا میں چند شریر باتیں کہہ سکتا ہوں؛

ک۔ (بغیر خوف اور سنجیدگی کے مگر اس کے جذبات کا کافی احترام کرتے ہوئے پھر بھی مادرانہ وشفقانہ طرز میں) نہیں۔ لیکن تم ہر وہ بات کہہ سکتے ہو جسے واقعی اور سچے دل سے محسوس کر رہے ہو، وہ کوئی بات ہو۔ کوئی چیز ہو مجھے ڈر نہیں ہے لیکن ہونا چاہئے حقیقت۔ کوئی وقتی حالت نہ ہو، شریر، رندانہ، شاعرانہ حالت نہ ہو۔ میں تم کو تمہاری عزت وصداقت کی قسم دلاتی ہوں کہ کسی وقتی حالت کا ذکر نہ کرنا۔ اب کہو جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو۔

ی م۔ (اس کے چہرے سے وہ شوخی کی رنگ آمیزی جو پیدا ہو گئی تھی ایک دم غائب ہو جاتی ہے آنکھیں اداس مگر چمکیلی

ہو جاتی ہیں) اب، اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جتنے الفاظ میں جانتا ہوں سب کسی نہ کسی حالت سے متعلق ہیں، سوائے ایک لفظ کے۔

ک۔ وہ کیا؟

ی م۔ (نرمی سے اور خود کو اس کے نام کی موسیقی میں کھوتے ہوئے) کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا اب میں یہی کہوں گا کیونکہ تم نے مجھے میری عزت اور صداقت کی قسم دلا دی ہے میرے دل میں تمہارا تخیل مسز مارل کی حیثیت سے کبھی نہیں ہے۔ ہمیشہ کینڈڈا کی حیثیت سے ہے۔

ک۔ ہاں، ہاں بیشک لیکن تم کینڈڈا سے کہنا کیا چاہتے ہو؟

ی م۔ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ تمہارا نام ہزاروں بار رٹا کروں کیا تم محسوس نہیں کرتیں کہ ہر بار گویا میں تمہاری تسبیح پڑھتا ہوں اور پرستش کرتا ہوں۔

ک۔ کیا تمہیں اس سے مسرت نہیں ہوتی کہ بس تم پرستش کیے جاؤ؟

ی م۔ ہاں بے حد مسرت۔

ک۔ بس یہی مسرت تمہاری پرستش اور تمہاری تسبیح کا صلہ ہے اب اس سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی تمنا ہے؟

ی م۔ نہیں بالکل نہیں۔ میں بس اب جنت میں ہوں جہاں خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

(مارل اندر آ جاتا ہے وہ دہلیز پر ایکدم رکتا ہے اور منظر پیش نظر کو ایک نظر میں سمجھ جاتا ہے)

م۔ (سنجیدگی اور متانت سے) مجھے امید ہے کہ میں حارج نہیں ہو رہا ہوں۔

(کینڈڈا تیزی سے چونک پڑتی ہے لیکن بغیر کسی گھبراہٹ کے خود پر ہنستے ہوئے۔ یوجین کینڈڈا کے ایکدم اٹھ کھڑے ہونے سے قلابازی کھا جاتا ہے لیکن بیٹھے ہی بیٹھے اپنی حالت سنبھالتا ہے اور کمبل پر اکڑوں اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کو بھی کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہے)

ک۔ جیمس تم نے تو بالکل مجھے چونکا دیا۔ میں یوجین کی باتوں میں اس قدر مصروف تھی کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولتے سنا بھی نہیں، میٹنگ کیسی رہی۔ تم تو خوب بولے ہوگے؟

م۔ میں زندگی بھر آج سے بہتر کبھی نہیں بولا۔

ک۔ بہت ہی خوب۔ چندہ کتنا جمع ہوا؟

م۔ یہ میں پوچھنا بھول گیا۔

ک۔ (یوجین سے) مسٹر ماریل ضرور آج بہت ہی اچھا بولے ہوں گے ورنہ وہ ایسی باتیں کبھی نہیں بھولتے (ماریل سے) اور دوسرے سب لوگ کہاں ہیں؟

م۔ وہ لوگ تو مجھ سے بہت پہلے چل چکے تھے۔ مجھے تو چھکارا ہی نہیں ملتا تھا۔ خیال ہے وہ لوگ کھانے کے لئے کہیں رُک گئے ہوں گے۔

ک۔ (اپنے گھریلو کام کاج کے لہجہ میں) تب تو پھر میں میری یا سے کہدوں کہ وہ سونے کے لئے جائے۔ میں جاکر اس سے کہے دیتی ہوں (وہ باورچی خانہ کی طرف چلی جاتی ہے)

م۔ (یوجین کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) کہیئے؟

ی م۔ (کمبل پر اکڑوں بہت ہی مضحک بے ڈھنگے پن سے بیٹھے ماریل کی طرح نہایت مطمئن بلکہ ہونٹوں پر شرارت کھیلتی ہوئی) کہیئے؟

م۔ کچھ کہیئے گا؟

ی م۔ صرف اتنا کہ جب تک تم وہاں پبلک میں خود کو بیوقوف بناتے رہے ہیں یہاں تخلیہ میں خود کو بیوقوف بناتا رہا۔

م۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بالکل ہی ایک دوسرے کی طرح نہیں۔

ی م۔ (استعدی سے اچھی طرح اُٹھ بیٹھتے ہوئے) بالکل، بالکل۔ بالکل ایک دوسرے کی طرح، بالکل تمہاری طرح میں یہاں ایک نیک آدمی کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جب سے تم بلند ہمتی کا مظاہرہ کر کے کینڈڈا کو یہاں میرے پاس چھوڑ گئے ـــــــ

م۔ (بے اختیارانہ چونک پڑتے ہوئے) کینڈڈا!

ی م۔ ہاں میں یہاں تک پہونچ گیا ہوں، لیکن ڈرو مت بلند ہمتی متعدی ہوا کرتی ہے۔ مجھ کو یہ بیماری تم سے لگ گئی۔ میں نے تم سے قسم کھائی تھی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی ایسا لفظ کبھی نہ کہوں گا جو تمہارے

موجودگی میں کم از کم ایک ماہ پیشتر نہ کہہ چکا ہوں گا۔

م۔ اور کیا تم نے اپنی قسم برقرار رکھی؟

ی م۔ (ایک دم کرسی کی پشت پر بیٹھتے ہوئے) ہاں کوئی دس منٹ تک تو کسی نہ کسی صورت سے برقرار رہی یعنی اس وقت تک تو میں برابر اور لگاتار اپنی اور ہر شخص کی نظمیں سناتا رہا تاکہ بات چیت کا موقعہ ٹلتا رہے۔ میں گویا جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا لیکن اندر جانے سے انکار کر رہا تھا۔ تم سمجھ نہیں سکتے کہ کس قدر بلند ہمتی کی یہ بات تھی اور کس قدر تکلیف دہ۔ اس کے بعد......

م۔ (اپنے ضبط کو بہ جبر روکتے ہوئے) اس کے بعد؟

ی م۔ (بہت بدمزگی اور معمولی طریقہ سے کرسی میں بیٹھتے ہوئے) اس کے بعد اس نے کہا کہ بس اب تمہارا پڑھنا وڑھنا میں نہیں سن سکتی۔ بند کرو۔

م۔ اور تم چنانچہ جنت کے دروازہ کی طرف آخر کار بڑھے؟

ی م۔ ہاں۔

م۔ اچھا! (غضبناک ہو کر) آگے بول۔ مردِ خدا کیا میرے جذبات کا تجھے کچھ احساس نہیں ہے؟

ی م۔ (نرمی اور موسیقیت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہوئے) اس کے بعد وہ ایک فرشتہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ ایک جلتی ہوئی تلوار تھی کہ ہر طرف گھوم رہی تھی چنانچہ میں اندر نہ جا سکا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ دراصل دوزخ کا دروازہ تھا۔

م۔ (مسرت سے پھول کر) یعنی اس نے تم کو مسترد کر دیا۔

ی م۔ (سخت حقارت سے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) نہیں بیوقوف آدمی۔ اگر وہ ایسا کرتی تو مجھے کبھی معلوم ہی نہ ہوتا کہ میں درحقیقت جنت ہی میں تھا۔ مسترد کر دیا! تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح ہم لوگ بچ جاتے! کیا خوب اطمینان کا پہلو! ارے تم تو اس دنیا میں اس کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہو (وہ نہایت حقارت سے کمرے کے دوسری طرف چلا جاتا ہے)

م۔ (جو اسی جگہ کھڑا بغیر کچھ حس و حرکت کئے برابر دیکھتا رہتا ہے) کیا تم سمجھتے ہو بوجھن کر تم اس طرح گا لیاں

دینے سے اپنے کو بہتر ثابت کر سکتے ہو۔

ی م۔ یہ گویا آپ کی آخری واعظانہ نصیحت ٹھہری۔ مارل میں تمہارے وعظوں کا قائل نہیں ہوں۔ وعظ تو میں سمجھتا ہوں تم سے بہتر میں خود دے سکتا ہوں لیکن اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں جس سے کینڈڈا نے شادی کی۔

م۔ وہ آدمی جس سے۔ تمہارا مطلب مجھ سے ہے نا؟

ی م۔ میرا مطلب عالی جناب جیمس میور مارل سے نہیں جو کہ محض ناصح اور ہوا کا ایک پھکنا ہے بلکہ میرا مطلب اس اصلی شخص سے ہے جو عالی جناب کے سیاہ کوٹ میں کہیں پوشیدہ ہے۔ اُس شخص سے جس سے کینڈڈا محبت کرتی تھی۔ تم کینڈڈا جیسی عورت سے محض اس بات پر محبت نہیں کروا سکتے کہ وہ محض تمہارے کالر کو پادریوں کی طرح بجائے سامنے کے پیچھے بند کیا کرے

م۔ (ہمت و استقلال سے) جب کینڈڈا نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا تب بھی میں ایسا ہی ناصح اور بقول تمہارے ہوا کا پھکنا تھا جیسا کہ اب تم دیکھتے ہو۔ اسوقت بھی میں سیاہ کوٹ پہنتا تھا اور میرا کالر بجائے آگے کے پیچھے سے بند کیا جاتا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اگر اپنے پیشے میں فریب سے کام لیتا تو وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی؟

ی م۔ (صوفے کے اوپر اپنے گھٹنوں کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوئے) نہیں، اس نے تمہیں معاف کر دیا جس طرح اس نے میرے بزدل اور کمزور ہونے کو معاف کر دیا بلکہ جیسا تم کہتے ہو کہ رونے کتے کے پلے ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا (محویت میں آکر) اس قسم کی عورت ملکوتی عقل و ہوش رکھتی ہے۔ وہ ہماری روحوں سے محبت کرتی ہے نہ کہ ہماری بیوقوفیوں سے یا مغالطوں سے یا ہمارے فضول خیالات سے۔ نہ ہمارے کوٹوں سے نہ ہمارے کالروں سے اور نہ ہمارے طرح طرح کے فضول چیتھڑوں سے جس میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے رہتے ہیں (اس بات پر وہ کچھ دیر تک محو رہتا ہے اس کے بعد مارل سے بڑے شوق سے سوال کرنے لگتا ہے) ہاں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم اُس آتشیں تلوار سے کیونکر بچ کر نکل گئے جس نے مجھے روک لیا۔

م۔ غالباً اس لئے کہ دس منٹ بعد کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔

ی م۔ (متعجب ہو کر) کیا!

م۔ آدمی بلند سے بلند چوٹیوں پر پہونچ سکتا ہے لیکن وہاں دیر تک رہ نہیں سکتا

ی م۔ (اُچک پڑتے ہوئے) یہ جھوٹ ہے۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ عمر بھر وہیں۔ یہ تو دوسرے لمحات ہوتے ہیں جب اس کو آرام نصیب نہیں ہوتا اور اُسے زندگی کے پر سکون جمال کا احساس نہیں ہوتا۔ آخر مجھے تم سمجھتے کیا ہو۔ میں اگر اعلیٰ بلندیوں پر اپنے لمحات نہ گذاروں گا تو کہاں گذاروں گا؟

م۔ باورچی خانہ میں۔ پیاز چھیلنے میں اور لیمپ میں تیل بھرنے میں۔

ی م۔ یا ممبر کلیسا کی میز پر معمولی ذلیل مٹی کی روحوں کی گرد جھاڑنے میں۔

م۔ ہاں یوں بھی لیکن ایسے ہی لمحات تھے جب مجھ کو وہ سنہرا موقعہ حاصل ہوا اور اس بات کا حق بھی کہ میں اس سے محبت کی التجا کروں۔ میں نے ایسے لمحات کسی سے قرض نہیں لئے اور نہ میں نے ان میں کسی دوسرے آدمی کی مسرت چرانے کی کوشش کی۔

ی م۔ (بے انتہا نا امید ہو کر آتشدان کی طرف بعجلت جاتے ہوئے) مجھے اس کا بالکل یقین ہے کہ تم نے معاملت بالکل ایمانداری سے کی ہو گی۔ بالکل اسی ایمانداری سے جس طرح کہ سیر آدھ سیر پنیر خریدنے میں کیجاتی ہے۔ (وہ آتشدان والے قالین کے کنارے پر رک جاتا ہے۔ اریل کی طرف پیٹھ ہے۔ کچھ سوچتا ہے خود سے مخاطب ہوتا ہے) البتہ میں صرف بطور ایک فقیر کے اس سے مانگ سکتا تھا۔

م۔ (چونکتے ہوئے) ایک ایسا فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

ی م۔ (تعجب سے مڑتے ہوئے) شکریہ! کہ تم نے میری شاعری کی تکمیل کر دی۔ ہاں اگر آپ کا جی چاہے تو یونہی کہہ لیجئے۔ ایک فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

م۔ (جوش سے) اور اس نے انکار کر دیا کیا میں تمہیں بتلادوں کہ اس نے کیوں انکار کر دیا۔ میں خود اسی کے الفاظ تمہیں بتلا سکتا ہوں۔ اس نے انکار اس لئے کر دیا کہ ــــــ

ی م۔ اس نے انکار نہیں کیا۔

م۔ نہیں کیا!!؟

ی م۔ اس نے سب کچھ دیا جو میں نے مانگا۔ اپنا دوشالہ دیا۔ اپنے پر دیئے۔ اپنے ماتھے کے تارے دیئے، اپنے ہاتھ کے سوسنی پھول دیئے۔ اپنے قدموں کے نیچے کا ہالا دیا۔

م۔ (اس کو پکڑتے ہوئے) اپنے بول ریچ آدمی! میری بیوی میری بیوی ہے۔ میں تمہاری یہ شاعرانہ فضولیات کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اگر اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجھ سے باندھ نہیں سکتا۔

ی م۔ (تکلف سے بغیر کسی خوف دھمک کے) ماریل! میرے قمیص کے کالر سے مجھے بیکار پکڑتے ہو۔ وہ پھر آکر ٹھیک کر دے گی جیسے اس نے صبح کیا تھا (خاموش مسرت سے) اور پھر مجھے اسی طرح اس کے ہاتھ چھونے کو ملیں گے۔

م۔ شیطان کے بچے تجھے نہیں معلوم کہ ایسی باتیں میرے سامنے کرنا کہاں تک روا ہیں؟ (یا شک کرتے ہوئے) کچھ ایسی بات ہوگئی ہے جس نے تجھے اس قدر نڈر بنا دیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب ڈر بالکل نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا اور اسی لئے پہلے تمہارے چھونے تک سے گھبراتا تھا لیکن آج صبح کو جب وہ تمہیں پریشان کر رہی تھی میں نے دیکھا کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ اس وقت سے میں اب تمہارا دوست ہوگیا ہوں۔ اب جی چاہے میرا گلا گھونٹ دو مجھے ڈر نہیں۔

م۔ (اسے چھوڑتے ہوئے) اگر یو جین تم یہ ظالمانہ کر سے نہیں کہہ رہے ہو اگر تم میں انسانی احساسات کی ایک چنگاری بھی باقی رہ گئی ہے تو کیا مجھے بتاؤ گے کہ میری عدم موجودگی میں کیا ہوا؟

ی م۔ کیا ہوا! ہوتا کیا وہی آتشیں تلوار (ماریل بے چینی سے اپنا پاؤں پٹکتا ہے) ۔۔ اچھا تو خیر سیدھی سیدھی نثر میں یہ کہ میں نے اس قدر اعلیٰ طریقہ کی محبت کی کہ مجھے کسی بات کی آرزو نہ رہی سوائے اس کے کہ میں اسی محبت کی حالت میں رہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی بلند ترین بلندیوں سے نیچے آتا تم آگئے

م۔ (بے انتہا تکلیف سے) تو گویا یہ بات اب بھی ناتمام رہی۔ پھر بھی شک و شبہ کی مصیبتیں۔

ی م۔ مصیبت! مجھ سے بڑھ کر اب خوش کوئی نہیں ہے مجھے اب کسی بات کی آرزو نہیں سوائے اُس کی خوشی کی (جذبہ میں آکر) ماریل حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں کو اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ ہم اس کے شایاں شان نہیں ہیں۔ میں ایک چھوٹا کمزور عصبی مریض، تم ایک نہایت احمق پادری۔ چلو ہم دونوں دنیا کے سفر کو چلیں، تم مشرق جاؤ اور میں مغرب اور اس کے لئے ایک نہایت لائق نہایت مناسب اور اس کی جوڑ کا بر تلاش کر کے لائیں۔ کوئی ایک نہایت ہی خوبصورت فرشتہ ہو جس کے احمریں شہپر ـــــ

م۔ یعنی کوئی بیوقوف! افسوس اگر وہ اتنی پاگل ہو گئی ہے کہ مجھے چھوڑ کر تمہارے ساتھ جانے پر تل گئی ہے تو پھر اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کون اس کے لئے محنت کرے گا؟ کون اس کے بچوں کی نگہداشت کرے گا؟ (وہ صدمے پر پریشان ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ گھٹنوں پر کہنیاں ہیں اور اپنے سر کو ہاتھوں سے دبا لیتا ہے)

ی م۔ (بے تحاشا اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) وہ تو اس قسم کے بیکار سوالات نہیں کرتی۔ اصل میں وہ مدد نہیں چاہتی بلکہ وہ خود کسی دوسرے کی حفاظت کرنا، مدد کرنا اور اس کیلئے محنت کرنا چاہتی ہے ارے احمق وہ خود کسی دوسرے کے بچوں کی نگہداشت، ان کی مدد اور ان کیلئے کام کرنا چاہتی ہو کوئی ایسا بوڑھا آدمی جو دوبارہ بچہ ہو گیا ہو۔ ارے بیوقوف ایسا شخص میں ہوں۔ ماریل ایسا شخص میں ہوں (جوش مسرت سے اٹھ کر ناچنے لگتا ہے اور کہتا ہے) تم نہیں جانتے کہ عورت کیا چیز ہے ماریل اسے فوراً بلا بھیجو اسے بلا بھیجو اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے دو ـــــ

(دروازہ کھلتا ہے اور کینڈیڈا اندر داخل ہوتی ہے۔ یوجین ایک دم ناچتے ناچتے سہم کر رہ جاتا ہے)

ک۔ (متعجب ہو کر دہلیز پر سے) یوجین یہ آخر تم کیا کر رہے ہو؟

ی م۔ (اوٹ پٹانگ پن سے) جیمس اور ہم دونوں وعظ دینے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہ ہار رہا ہے۔

(کینڈیڈا ماریل کی طرف دیکھتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ پریشان معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طرف بہت

فکرمند ہو کر بڑھتی ہے)

ک۔ تم اس کو پریشان کر رہے تھے یوجین میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی سنا تم نے؟ (اپنا ہاتھ ماریل کے کندھے پر رکھتی ہے اور اپنے غصہ کی وجہ سے اپنا اطمینان ہنر بھول جاتی ہے) میرے پیارے کو بس اب پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میں اس کی حفاظت کروں گی۔

م۔ (فخر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) حفاظت!

ک۔ (اسکی بات نہ سنتے ہوئے یوجین سے) آخر تم کیا کہہ رہے تھے؟

ی م۔ (ڈر کر) کچھ نہیں۔ میں ــــ

ک۔ یوجین! کچھ نہیں؟

ی م۔ (روا سا ہو کر) میرا مطلب یہ ۔ میں ــ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں اب ایسا پھر نہ کروں گا۔ سچ اب نہ کروں گا۔ میں اسے بالکل چھوڑ دیا کروں گا۔

م۔ (غصہ سے یوجین کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے چھوڑ دے گا! شیطان کے ــــ

ک۔ (اسے روکتے ہوئے) نہیں۔ رُک جاؤ جیمس۔ میں دیکھو اسے ٹھیک کئے دیتی ہوں۔

ی م۔ کیا آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ک۔ (سختی سے) ہاں میں تم سے بے حد خفا ہوں اور میرا قطعی ارادہ ہے تم کو گھر سے باہر نکالدوں۔

م۔ (کینڈڈا کی جرأت سے متعجب ہو کر پھر بھی یہ نہ چاہتے ہوئے کہ کسی مرد کے مقابلہ میں اس کی بیوی اسے بچائے) نرمی سے کینڈڈا! نرمی سے کینڈڈا! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔

ک۔ (اسے تھپتھپاتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں پیارے لیکن تم کو اب پریشان کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ کرنے دوں گی۔

ی م۔ (تقریباً روتے ہوئے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے) تو اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ نہیں تمہارے جانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے اتنی رات گئے تمہیں گھر سے باہر نہ نکالوں گی (زور سے) تمہیں شرم نہیں آتی بے شرم!

ی م ۔ (تنگ آکر) لیکن میں نے کیا کیا ہے ؟

ک ۔ مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا ہے اور اس قدر گویا کہ میں خود یہاں موجود تھی تم نے بہت ہی نالائق بات کی ہے تم بالکل بچوں ہی کی طرح ہو اپنی زبان کو روک نہیں سکتے ۔

ی م ۔ مجھے ایک چھوڑ دس موتیں آجائیں ! اگر میں آپ کو ایک لمحہ کی بھی تکلیف دینے کا خیال کروں ۔

ک ۔ (اس لڑکپن کی بات پر سخت تنفر ظاہر کرتے ہوئے) تمہارے مرنے سے مجھے بڑا فائدہ ہی ہو جائے گا ۔

م ۔ کینڈڈا ڈیر یہ سوال وجواب بالکل بیکار اور نامناسب ہیں ۔ دراصل قصہ یہ دو آدمیوں کا ہے اور میں ہی اسے بہتر طے کر سکتا ہوں ۔

ک ۔ دو آدمیوں کا ! کیا تم ایسے شخص کو ایک آدمی سمجھتے ہو ؟ (یوجین سے) شریر کہیں کا :

ی م ۔ (اس ملامت سے خود میں ایک عجیب ہمت محسوس کرتے ہوئے) اگر مجھے لڑکوں ہی کی طرح برا بھلا کہا جا رہا ہے تو پھر لڑکوں کا سا جواب بھی دوں گا جھگڑا اصل میں اس نے پہلے شروع کیا اور یہ مجھ سے بڑا لڑکا ہے

ک ۔ (ذرا پریشان ہوتے ہوئے کیونکہ ماریل کی شان پر دھبہ آتا تھا یہ صحیح نہیں ہو سکتا (ماریل سے) جیمس تم نے ایسی باتیں شروع نہ کی ہوں گی ۔ کیوں نا جیمس ؟

م ۔ (حقارت سے) نہیں ۔

ی م ۔ (غصہ سے) آ نیں !

م ۔ (یوجین سے) تم نے خود آج صبح اس قسم کی ابتدا کی (کینڈڈا اس سے فوراً وہ سیدھی والی گمبھ بات سمجھ جاتی ہے کہ سویرے کی باتوں سے تعلق ہے ۔ چنانچہ وہ شک سے اور تیزی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور یل اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتا ہے اس لہجہ میں گویا اس کی برتری کو صدمہ پہنچ رہا ہے) تمہاری دوسری بات البتہ درست ہے کہ میں بڑا لڑکا ہوں اس لئے زیادہ مضبوط ہوں ۔ کینڈڈا تم یہ معاملہ بس میرے ہاتھ میں چھوڑ دو ۔

ک ۔ (اسے تسکین دیتے ہوئے) ہاں پیارے کیوں نہیں میں ضرور چھوڑ دوں گی ۔ لیکن (پریشان ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج صبح کیا معاملہ تھا ۔

م۔ (اس کی بات کو نرمی سے ٹالتے ہوئے) پیاری تمہیں اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ک۔ لیکن جیمس میں (باہر گھنٹی بجتی ہے) — اونہ! تو یہ وہ لوگ آرہے ہیں (وہ دروازہ کھولنے کے لئے چلی جاتی ہے)

ی م۔ (ماریل کی طرف دوڑ کر جاتے ہوئے) ماریل، ماریل! یہ کس قدر خراب بات ہوگئی کہ وہ ہم لوگوں سے خفا ہوگئی ہے۔ مجھ سے تو اسے نفرت ہی ہوگئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟

م۔ (عجیب پریشانی کی حالت میں کمرہ میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) یوجین میرا سر چکرا رہا ہے میں تھوڑی دیر میں کہیں پاگلوں کی طرح ہنسنے نہ لگوں۔

ی م۔ (فکرمند ہو کر اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے) نہیں نہیں ایسا نہ کرنا ورنہ وہ سمجھے گی کہ تم کو میں نے پاگل بنا دیا ہے۔ ہنسنا مت۔

(غل شور اور قہقہوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکسی ل کی آنکھیں چمک رہی ہیں طرز عمل سے غیر معمولی شگفتگی عیاں ہے لیکن ہوش و حواس بجا ہیں۔ برگیس کے ساتھ داخل ہوتا ہے برگیس بدستور اپنی جگہ مطمئن ہے اور چکنی چپڑی باتیں کر رہا ہے مس گارنٹ اپنی بہترین ٹوپی اور بہترین جیکٹ جائے ہوئے ان دونوں کے پیچھے آتی ہے۔ حالانکہ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ چمک رہی ہیں لیکن بظاہر ابھی خود کو مدہوش نہیں سمجھتی۔ اپنے ٹائپ رائٹر والی میز کی طرف بیٹھ کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک ہاتھ میز پر خود کو سہارا دینے کے لئے رکھتی ہے۔ دوسرا پیشانی پر رکھتی ہے جیسے کچھ تھک گئی ہو یا کچھ چکر سا آرہا ہو۔ مارچ بینکس کو پھر اپنے شرمیلے پن کا شدید احساس ہوتا ہے اور کھڑکی کی طرف جہاں ماریل کی کتابیں رکھی ہیں چپکے چپکے کھسکنا شروع کرتا ہے)

ل۔ (انتہائی شگفتگی سے) مجھے آپ کو ضرور مبارکباد دینی چاہئے (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) آپ نے کس قدر عمدہ، کس قدر اعلیٰ درجہ کا وجدانی خطبہ دیا ہے آپ تو خود اپنے سے بڑھ گئے۔

ب۔ اس میں کوئی شک نہیں جیمس میں تو تمہارے آخری لفظ تک برابر جاگتا رہا کیوں مس گارنٹ؟

پ۔ (جھنجھلا کر) مجھے کیا معلوم مجھے تو تمہارا خیال بھی نہ تھا میں تو اپنے نوٹس لکھ رہی تھی (اپنی نوٹ بک نکالتی ہے اور اپنی مختصر نویسی کو دیکھتی ہے اور دیکھ کر تعجب سے اداس ہو جاتی ہے)

م۔ (پھاس) کیا میں بہت تیز بولا؟

پ۔ بہت ہی تیز۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نوّے الفاظ فی منٹ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی چنانچہ بہت کچھ چھوٹ گیا (غصہ میں نوٹ بک کو اپنی مشین کی طرف پھینک دیتی ہے کہ دوسرے دن دیکھا جائے گا اور اب مطمئن ہو کر بیٹھتی ہے)

م۔ (تسکین دیتے ہوئے) خیر، خیر کوئی حرج نہیں۔ جانے دو، جانے دو اچھا یہ بتاؤ کیا تم سب لوگ کھانا کھا چکے؟

ل۔ مسٹر برگیس نے آج ہم لوگوں کو بلگریو ہوٹل میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی دعوت دی۔

ب۔ (فیاضانہ شان سے) مسٹر ل یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے (انکساری سے) آپ لوگوں کی ہمیشہ ایسی ہی خاطر تواضع کرنے کے لئے تیار رہوں۔

پ۔ ہم لوگوں کو شمپین پینے کو ملی۔ میں نے تو اس سے پہلے اسے چکھا بھی نہ تھا۔ مجھے چنانچہ ذرا چکر محسوس ہو رہا ہے۔

م۔ (تعجب سے) شمپین کے ساتھ دعوت! یہ تو واقعی بہت اعلیٰ رہی۔ کیا بات تھی برگیس۔ یہ میری فصاحت کا اثر تھا کہ جس کے سبب تم اس قدر خرچ پر آمادہ ہو گئے؟

ل۔ (خطیبانہ تکلف برتتے ہوئے) آپ کی فصاحت اور مسٹر برگیس کی دریا دلی (انتہائی شگفتگی کے جوش میں آکر) اور ہاں ریل صدر بھی کیا لاجواب آدمی تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔

م۔ (نتیجہ نکال کر برگیس کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا! آ۔آ۔ہمہ۔! تو اب میں سمجھا (برگیس انکساری کے طور پر کھانسنے لگتا ہے یہ چھپانے کے لئے کہ اپنی چالاکی پر مسرور و مطمئن ہے۔ لیکس اپنے بازوؤں کو لپیٹ کر ایک شان کے ساتھ صوفے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک چکر آتا ہے لیکن خود کو سنبھال لیتا ہے۔ کینڈڈا ایک کشتی میں گلاس، لیمونیڈ اور گرم پانی کا ایک جگ لاتی ہے)

ک۔ لیمونیڈ کون پیئے گا؟ تم لوگ ہمارا قاعدہ جانتے ہو یعنی شراب سے قطعی پرہیز (کشتی کو میز پر رکھ دیتی ہے اور لیمو نچوڑنے والی مشین اٹھاتی ہے اور ہر ایک کی طرف دیکھتی ہے)

م۔ کوئی ضرورت نہیں اس کی کینڈڈا۔ یہ سب لوگ شمپین پی کر آئے ہیں۔ پر اس نے بھی اپنا عہد توڑ دیا

ک۔ (پرازرپائن سے) کیا واقعی تم نے بھی شمپین پی ہے!

پ۔ (زور دے کر) ہاں میں نے پی۔ میں نے تو صرف بیر کے متعلق توبہ کی تھی۔ بیر کو میں سخت ناپسند کرتی ہوں بمسٹر باریل آج اب اور کوئی خط تو میرے جواب لکھنے کے لئے نہیں ہے؟

م۔ ہاں بس اب آج کوئی نہیں۔

پ۔ اچھی بات تو پھر ـــ سب لوگ خدا حافظ!

ل۔ (ہمت مردانہ سے) مس گارنٹ کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں آپ کو آپ کے مکان تک چھوڑ آؤں؟ نہیں شکریہ میں خود کو اس وقت کسی پر چھوڑ نہیں سکتی۔ کاش کہ میں وہ ذلیل شئے ذرا بھی نہ پیتی۔ (وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے اس سے ٹکرا جاتی ہے اور بمشکل گرتے گرتے بچتی ہے)

ب۔ (غصہ سے) ذلیل شئے! لڑکی جانتی بھی نہیں کہ شمپین کیا چیز ہے۔ پامری اور گرینو کمپنی کی۔ ساڑھے بارہ شلنگ کی ایک بوتل! اور وہ پورے دو گلاس پی گئی!

م۔ (اس کے متعلق فکرمند ہو کر) لیکسی جاؤ اور اسے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔

ل۔ (دو گلاس سن کر اور فکرمند ہو کر) لیکن اگر وہ واقعی ـــ یعنی فرض کیجئے اگر وہ سڑک پر گانے لگے یا اسی طرح کی کوئی اور حرکت ـــ

م۔ ہاں یہی مجھے بھی ڈر ہے کہ شاید وہ ایسا کر بیٹھے۔ اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ جا کر اسے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔

ک۔ ہاں لیکسی ضرور شاباش! (وہ اس سے ہاتھ ملاتی ہے اور آہستہ سے دروازہ کی طرف ڈھکیل دیتی ہے)

ل۔ ہاں جانا مجھ پر فرض ہے مگر مجھے امید ہے اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ خدا حافظ! مسٹر باریل (سب سے مخاطب ہو کر) خدا حافظ (وہ چلا جاتا ہے اور کینڈڈا دروازہ بند کر دیتی ہے)

ب۔ وہ خود بھی دو گھونٹوں کے بعد بڑی احتیاط سے پی رہا تھا لوگ اب اتنی پیتے نہیں جتنی کہ اگلے زمانہ والے پیا کرتے تھے (آتشدان کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا جیمس بس اب گھر کے دروازہ بند کر لینے کا

وقت آگیا ہے مسٹر مارچ بنکس آپ بھی مکان چل رہے ہیں نا ؟ کیا میں راستہ میں کچھ دور تک آپ کی شرف ہمراہی سے سرفراز ہو سکتا ہوں؟

ی م۔ (ڈر کر) ہاں، ٹھیک اب مجھ کو واقعی جانا چاہیے (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے لیکن کینڈڈا سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کا راستہ روک لیتی ہے)

ک۔ (خاموش تحکمانہ لہجہ میں) تم ادھر بیٹھو چل کے۔ تم ابھی نہیں جا سکتے۔

ی م۔ (التجا کرتے ہوئے) نہیں، ہیں — میرا مطلب جانے کا نہیں تھا (آکر چپکے سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ پاپا، مسٹر مارچ بنکس آج ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے۔

پ۔ اچھا اچھا تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ جیمس (ماریل سے مصافحہ کرتا ہے اور یوجین کی طرف آتا ہے) مسٹر مارچ بنکس تم اپنے بستر کے قریب ان لوگوں سے ایک لیمپ رکھوا لینا کیونکہ ممکن ہے تم کو وہی دورہ پڑے تو وقت نہ ہو۔ اچھا خدا حافظ

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کروں گا خدا حافظ مسٹر برگیس (دونوں مصافحہ کرتے ہیں۔ برگیس دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ (ماریل کو روکتے ہوئے جو برگیس کے پیچھے اسے پہونچانے جا رہا ہے) ذرا رکنا ڈیر میں پاپا کو ان کا اوور کوٹ تو پہنا دوں (وہ برگیس کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے)

ی م (چپکے سے اُٹھ کر ماریل کے پاس جاتے ہوئے) ماریل بس اب ایک زبردست منظر پیش ہونے والا ہے۔ تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟

م۔ ذرہ برابر بھی نہیں۔

ی م۔ تمہاری ہمت پر اس وقت البتہ رشک معلوم ہوتا ہے (وہ تعریف کے طور پر اپنا ہاتھ ماریل کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے) میرے قریب رہنا۔ رہو گے نا؟

م۔ (اسے ہٹاتے ہوئے) نہیں یوجین ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرے۔ بس آج اس وقت اس کو ہم دونوں میں سے کسی کو ہمیشہ کے لئے انتخاب کر لینا ہے۔

(کینڈڈا واپس آجاتی ہے۔ یوجین ایک خطاوار اسکول کے لڑکے کی طرح چپکے سے دبکا ہوا پھر صوفے پر واپس آتا ہے)

ک ۔ (ان دونوں کے درمیان آکر یوجین سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہیں اپنے کئے پر ندامت ہے؟

ی م ۔ (عداوت سے) ہاں، دلی تکلیف۔

ک ۔ اچھا خیر تو پھر تم معاف کئے جاتے ہو۔ اور بس اب ایک اچھے چھوٹے لڑکے کی طرح جاکر بستر پر سو تو رہو۔ میں تمہیں سے کچھ تمہارے متعلق باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م ۔ (سخت انتشار سے اٹھتے ہوئے) نہیں ماریل، میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں یہیں رہوں گا۔ تم اس سے سب کچھ کہدو۔

ک ۔ (اپنے شکوک صحیح پاتے ہوئے) مجھ سے کیا کہدو؟ (یوجین کی نگاہیں اس سے چار نہیں ہوتیں وہ مڑتی ہے اور ماریل کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

م ۔ (انجام کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے) مجھے اُس سے کچھ کہنا نہیں ہے سوائے اس کے کہ (یہاں اس کی آواز نرم دگلوگیر ہو جاتی ہے) وہ دنیا میں میرا بہترین خزانہ ہے۔ اگر واقعی وہ میری ہی ہے۔

ک ۔ (اس کے اس خطیبانہ لہجہ کو برا مان کر نیز اس بات کو برا مانتے ہوئے کہ وہ اس سے گویا سینٹ میتھو کا مجمع سمجھ کر مخاطب ہو رہا ہے) میرا خیال یہ ہے کہ اگر صرف اتنا ہی کہنا تھا تو یوجین بھی اس سے کچھ کم نہیں کہہ سکتا

ی م ۔ (ناامید ہو کر) ماریل وہ ہم دونوں پر ہنس رہی ہے

م ۔ (جز بز ہو کر) اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کینیڈا کیا تم ہم پر ہنس رہی ہو۔ کینیڈا؟

ک ۔ (دبائے ہوئے غصہ سے) تمہیں یوجین بہت تیز لڑکا ہے۔ ممکن ہے کہ میں ہنسنے لگوں لیکن یہ زیادہ ممکن ہے کہ مجھے سخت غصہ آجائے (وہ آتشدان کے پاس چلی جاتی ہے اور وہاں مینٹل پر اپنا بازو رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک پیر آتشدان کے سینچوں پر ہے۔ یوجین ماریل کے پاس چپکے سے جاتا ہے اور آہستہ سے اس کی آستین پکڑ کر جھنکاتا ہے)

ی م ۔ (چپکے سے کان میں کہتے ہوئے) دیکھو ماریل۔ ہم لوگوں کو کوئی بات زبان سے نہ نکالنی چاہئے۔

م ۔ (یوجین کو ہٹاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے) کینیڈا! تم یہ دھمکی دے رہی ہو۔ مجھے اُمید تو ایسی نہیں ہے۔

ک۔ (زور سے دھمکاتے ہوئے) ہاں جمیس غالباً! یوجین میں نے تم سے جانے کو کہا تھا۔ جانتے ہو کہ نہیں؟

م۔ (اپنا پیر زمین پر زور سے مارتے ہوئے) نہیں وہ نہیں جا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہیں رہے۔

ی م۔ نہیں میں چلا جاؤں گا جو کچھ تم مجھ سے کہو گی وہی کروں گا (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ رکو (وہ رک جاتا ہے) کیا تم نے جمیس کا کہنا سنا نہیں کہ وہ نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ یہاں کا مالک جمیس ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم؟

ی م۔ (ایک نوجوان شاعر کی طرح ظلم کے خلاف برافروختہ ہوتے ہوئے) لیکن وہ مالک ہے کس حق سے؟

ک۔ (آہستہ سے) اسے بتلا تو دو جمیس!

م۔ (چونک کر) میری پیاری! مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا ایسا حق ہے جس سے میں یہاں کا مالک ہوں میں تو اس قسم کا کوئی حق نہیں جتاتا۔

ک۔ (سخت ملامت کے لہجہ میں) تم نہیں جانتے جمیس۔ ارے جمیس! (یوجین کی طرف متوجہ ہو کر) یوجین تمہیں تو معلوم ہو گا (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے لیکن اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا) ہاں تم ابھی بہت بچے ہو۔ خیر، اچھا تو اب تمہیں یہاں رہنے کی اجازت دیتی ہوں تاکہ تم یہ باتیں سیکھ لو۔ جان لو (وہ آتشدان کے پاس سے آتی ہے اور ان دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو جاتی ہے) اچھا جمیس! اب یہ بتاؤ واقعہ کیا ہے؟ بتاؤ، مجھ سے کہو!

ی م۔ (ارل کی طرف چپکے سے کہتے ہوئے) مت بتانا۔

ک۔ بولو۔ منھ سے کہو تو!

م۔ (آہستہ سے) میں چاہتا تھا کہ تمہارے دماغ کو رفتہ رفتہ تیار کروں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔

ک۔ ہاں، ہاں پیارے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم نے ایسا کیا لیکن ان باتوں کا خیال نہ کرو مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہو گی۔

م۔ اچھا تو ــــــ (رک جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک لمبی تشریح کرنا چاہتا تھا لیکن الفاظ نہیں ملتے)

ل۔ اچھا تو!

م۔ (ایکدم صاف صاف بول اٹھتا ہے، یوجین یہ کہتا ہے کہ تمہیں اس سے عشق ہے۔

ی م۔ (جلدی سے اور انتہائی گھبراہٹ سے) نہیں نہیں، نہیں نہیں نہیں کبھی نہیں مسٹر ماریل یہ میں نے کبھی نہیں کہا یہ صحیح نہیں ہے میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے اور میں نے یہ کہا تھا کہ میں تم کو خوب سمجھ پاتا ہوں اور یہ نہیں سمجھ پاتا۔ اور یہ سب اُس وقت نہیں کہا تھا جب وہ تمام باتیں آگ کے سامنے ہوئی تھیں میں قسمیہ کہتا ہوں آج صبح صرف یہ بات ہوئی تھی۔

ک۔ (واقف ہو کر) آج صبح!

ی م۔ ہاں (وہ کینڈڈا کی طرف دیکھتا ہے تاکہ یقین ان سے اور پھر آگے کہتا ہے) میرے کالر خراب ہو جانے کی وجہ یہی تھی۔

ک۔ تمہارا کالر؟ (مطلب سمجھ کر فوراً ماریل کی طرف مڑتی ہے۔ رنجیدہ اور متعجب) ارے جیمس کیا تم نے — ؟ (رک جاتی ہے)

م۔ (شرمندہ ہو کر) کینڈڈا تم جانتی ہو کہ مجھے اکثر غصہ آجاتا ہے۔ اور یہ بک رہا تھا (کانپ کر) کہ تم مجھ سے سخت نفرت رکھتی ہو۔

ک۔ (جلدی سے یوجین کی طرف مڑتے ہوئے) کیوں، کیا تم نے ایسا کہا تھا؟

ی م۔ (ڈر کر) نہیں۔

ک۔ (تقریباً غضبناک ہو کر) تو اس سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ جیمس مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔

ی م۔ نہیں نہیں۔ میں۔ میں (بہت ہمت کر کے) وہ داؤد علیہ السلام کی بیوی کا قصہ تھا۔ اور وہ واقعہ بھی گھر میں نہیں ہوا تھا بلکہ ان سے خفا ہو گئی تھیں اور نفرت کرنے لگی تھیں جب انھوں نے ان کو دوسرے لوگوں کے سامنے خطیبانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

م۔ (مناظرہ کرنے والوں کی طرح اپنا موقع پاتے ہوئے) سنا کینڈڈا! تمام لوگوں کے سامنے رقص کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اپنی ان حرکتوں سے تمام لوگوں کے دل موہ کر ان کی اصلاح کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ

سب پر اسی والی شکایت میں مبتلا تھے (کینیڈا کچھ کہنے کو ہوتی ہے لیکن وہ اپنا ہاتھ اُٹھا کر اسے خاموش کر دیتا ہے) نہیں تمہیں غصہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کینیڈا ـــ

ک۔ ظاہر کرنے کی!

م۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) یوجین صحیح کہتا تھا جیسا کہ تم نے بھی چند گھنٹے گذرے کہا تھا کہ یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کو خود تم اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کہہ چکی تھیں۔ وہ شاعر ہے اور ہر بات سمجھ جاتا ہے میں صرف پادری ہوں جو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

ک۔ (تاسف کے لہجہ میں) جو کچھ ایک بیوقوف لڑکا کہے تم اسے مان لو گے اگر وہی بات میں نے بھی مذاق میں کہدی ہو۔

م۔ یہ بیوقوف لڑکا ایک معصوم بچے کی طرح الہامی گفتگو کر سکتا ہے لیکن اس میں ایک افعی کی مکاری شامل ہوتی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تم دراصل اس کی ہو نہ کہ میری۔ اور صحیح یا غلط مجھکو بھی یہ شک پیدا ہو گیا ہے کہ شاید ایسا ہی ہو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ شک و شبہ میں مبتلا ہو کر اِدھر اُدھر پریشان مارا مارا پھروں۔ میں ایسی بھی زندگی برداشت نہیں کر سکتا کہ رہوں تو ساتھ ساتھ لیکن دل میں غبار بھرے رہوں۔ میں حسد کرنے کی ناقابل برداشت ذلت اپنے لئے روا نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ہم دونوں اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تم ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ اب میں تمہارے انتخاب کا انتظار کرتا ہوں۔

ک۔ (آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹتی ہے۔ اس عبارت آرائی سے اس کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ باوجودیکہ یہ الفاظ سچے جذبات سے کہے گئے ہیں) اچھا تو مجھے انتخاب کرنا ہے ہو کیوں نا؟ تو میرے خیال میں غالباً تم دونوں میں یہ مسئلہ بالکل طے ہو گیا ہے کہ میں دو میں سے ایک کی ہو جاؤں

م۔ (استقلال سے) بالکل! بس تم اب قطعی طور سے اپنا انتخاب کر لو۔

ی م۔ (پریشانی سے) مارلی، تم سمجھے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود آپ اپنی مالک ہے۔

ک۔ (اس کی طرف مڑتے ہوئے) ہاں میاں یوجین میرا یہ مطلب بھی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جو ابھی تم دونوں

کو معلوم ہو جائے گا۔ اچھا میرے مالکین وتابضیں ذرا یہ تو مجھے بتایئے کہ آپ لوگ اپنے انتخاب کے لئے اپنا اپنا کیا عطیہ مجھے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت میں نیلام پر چڑھی ہوئی ہوں۔ اچھا، یوجین تم کیا قیمت پیش کرتے ہو میرے لئے؟

م۔ (انتہائی تکلیف سے) کینڈڈ ——— (اس کی آواز کام نہیں کرتی۔ آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں اور آواز گلوگیر خطیب ایک زخمی جانور ہو کر رہجاتا ہے) میں بول نہیں سکتا۔

ک۔ (بے اختیار ہو کر اس کے پہلو میں جاتے ہوئے) آہ! میرے پیارے ———

ی م۔ (گھبرا کر) رکو! یہ معاملہ کی صفائی نہیں ہے ا ریل تم یہ نہیں دکھلا سکتے کہ تم کو تکلیف ہے میں خود سخت مجروح ہوں لیکن اپنی جراحت دل دکھا کر اس کو اپنی طرف ہمدردانہ راغب کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نہیں روتا۔ اس کے جذبہ رحم کو نہ ابھارو جو کچھ تمہیں کہنا ہے کہو ——— مردانہ وار کہو۔

م۔ (اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے) ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو مجھے رحم کی قیمت لگانا مطلوب نہیں ہے (اپنے کو کینڈڈا سے چھڑا لیتا ہے)

ک۔ (واپس ہوتے ہوئے رکھائی سے) معاف کرنا جیمس میں تم سے مس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اچھا اب میں تمہاری قیمت سننا چاہتی ہوں۔

م (غرور انکساری کے ساتھ) کینڈڈا میرے پاس تمہاری قیمت کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اپنی طاقت تمہاری حفاظت کے لئے۔ اپنی ایمانداری تمہارے اطمینان کے لئے۔ اپنی محبت دنیا قت تمہاری معاش کے لئے اور اپنا اثر و اقتدار تمہاری شان کے لئے بس یہی چیزیں ایک مرد ایک عورت کو پیش کر سکتا ہے۔

ک۔ (بہت ہی خاموشی سے) اور تم یوجین؟ تم کیا پیش کرتے ہو؟

ی م۔ اپنی کمزوری، اپنی بے لبسی۔ اپنی احتیاج دلی۔

ک۔ (متاثر ہو کر) یوجین یہ قیمت اچھی ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اپنا انتخاب کس طرح کروں۔

(وہ کچھ دیر رکتی ہے اور ہر دو کی طرف دیکھتی ہے گویا دونوں کو تول رہی ہے۔ ا ریل جس کا زور رخودی یوجین

کی قیمت سن کر ایکدم شکست ہو گیا ہے اب اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکتا۔ یوجین شدت اضطراب و ہیجینی سے بالکل بت کی طرح ساکت ہے)

م۔ (بھاری گلوگیر آواز میں۔ اس کی روح سخت ترین تکلیف کی وجہ سے بے اختیارانہ التجا کر رہی ہے) کینڈڈا!

ی م۔ (الگ حقارت کے لہجہ میں) بزدل!

ک۔ (معنی خیز انداز میں) میں تم دونوں میں سے کمزور ترین شخص کو اپنے تئیں حوالہ کرتی ہوں۔

(یوجین فوراً اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور اس کا چہرہ بھٹی کے لوہے کی طرح سپید پڑ جاتا ہے)

م۔ (اپنی شکست سمجھ کر سر تسلیم خم کرتے ہوئے) کینڈڈا میں تمہارا فیصلہ قبول کرتا ہوں۔

ک۔ تم سمجھے یوجین؟

ی م۔ اف! میری تو دنیا تباہ ہو گئی۔ وہ اس خوشی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

م۔ (نہ یقین کرتے ہوئے اپنا سر ایک دم مضحک انداز میں اٹھاتے ہوئے) کیا تمہارا مطلب مجھ سے ہے کینڈڈا؟

ک۔ (کچھ مسکرا کر) اب ہمیں بیٹھ کر بالکل دوستوں کی طرح اس گفتگو کو ختم کر ڈالنا چاہئے (ماریل سے) بیٹھ جاؤ پیارے (ماریل بالکل خود فراموش آتشدان کے پاس سے لڑکوں والی کرسی اٹھا لیتا ہے) یوجین میرے لئے وہ کرسی اٹھا تو لینا (آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوجین بہت خاموشی سے کرسی لاتا ہے اور ماریل کے پاس اس سے کچھ پیچھے رکھ دیتا ہے۔ خود مہمانوں والی کرسی لے لیتا ہے اور آہستہ سے اس پر بے حس بیٹھ جاتا ہے جب سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے متین، خاموش اور ہلکے لہجوں سے ان پر ایک سکوت کا عالم طاری کر دیتی ہے) تمہیں یاد ہوگا یوجین جو کچھ تم نے اپنے متعلق مجھے بتایا تھا کہ جب سے تمہاری بوڑھی دایہ فوت ہوئی کسی نے تمہاری طرف التفات سے نہیں دیکھا ہے اور کس طرح تمہارے فیشن ایبل بھائی اور بہنیں، تمہارے باپ اور ماں کے چہیتے تھے، اور کس طرح تم ایٹن میں تکلیف اٹھاتے تھے اور کس طرح تمہارا باپ آکسفورڈ میں تم کو جبراً بھیجنے کے لئے تم کو مالی تکلیف دے رہا ہے اور کس طرح تم کو پریشان، بے آسرے اور بے ٹھکانے رہنا پڑا ہے۔ ہمیشہ تنہا بے یار و مددگار۔ نفرت اور بدگمانی کا شکار۔ بے چارہ!

ی م۔ (اپنی خوبی قسمت کو مکمل کرتے ہوئے) میرے لئے میری کتابیں تھیں۔ میرے سامنے مظاہر قدرت تھے اور آخرکار

تم سے ملاقات ہوئی۔

ک۔ خیر، اس کا فی الحال ذکر چھوڑ دو۔ اب میں تمہیں اس بڑے لڑکے کے متعلق بتانا چاہتی ہوں اسکو شروع ہی سے لاڈ و پیار نے خراب کر دیا۔ ہم لوگ ہر مہینہ کم از کم دو مرتبہ اس کے والدین کے وہاں جاتے ہیں تم کبھی یوجین آنا تو میں تمہیں اس گھر کے پرانے ہیرو کی تصویریں دکھاؤں گی۔ جیمس کے بچپن کی تصویر جس میں وہ تمام بچوں سے عجیب و غریب ہے۔ جیمس کی آٹھ سال کی عمر کی تصویر جب اس نے اسکول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ جیمس کی گیارہ برس کی تصویر جب وہ اپنی ٹیم کا کپتان ہوا تھا۔ جیمس اپنے پہلے فراک کوٹ میں غرضکہ جیمس کی مختلف شاندار حالتوں کی تصویریں ہیں تم جانتے ہو کہ جیمس کس قدر مضبوط آدمی ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس نے تمہیں زیادہ اذیت نہ پہونچائی ہوگی کس قدر ہوشیار ہے کس قدر خوش و خرم (سنجیدہ ہوتے ہوئے) جیمس کی ماں اور اس کی تینوں بہنوں سے پوچھو کہ ان لوگوں نے اسے صرف مضبوط، بہادر، ہوشیار اور خوش و خرم بنانے میں کس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ مجھے کس قدر تکلیف اٹھانا پڑتی ہے جبکہ تنہا مجھے اس کی ماں اس کی بہنوں اور اس کی بیوی اور اس کے لڑکوں کی ماں سب کا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پراسی اور میریا سے پوچھو کہ گھر کے کاموں میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور خاص کر جب ہمارے ہاں کوئی ملاقاتی ہم کو پیاز چھیلنے میں مدد دینے کے لئے نہیں ہوتا۔ ان سوداگروں سے پوچھو جو جیمس کو پریشان کرنے اور اس کے دلچسپ خطبے خراب کرنے آیا کرتے ہیں۔ کون ہے جو ان کو دور رکھتا ہے؟ جب ہم لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو جیمس انہیں دیتا ہے جب نہیں ہوتا تو ان سے معافی میں مانگتی ہوں۔ میں اس کے آرام آسائش اور محبت کی خاطر گھر کو ایک قلعہ سا بنائے رکھتی ہوں اور دروازے پر ہمیشہ ایک نگراں کی طرح کھڑی رہتی ہوں کہ معمولی قسم کی فکریں اندر نہ آنے پائیں۔ میں اس کو یہاں مالک بناتی ہوں۔ حالانکہ وہ خود اسے نہیں جانتا اور ابھی کچھ دیر ہوئے تمہیں تبلا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس طرح مالک ہے (شیریں طنز سے) اور حالانکہ جب اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو پہلی فکر اسے یہ ہوئی تھی کہ ——— میرا کیا حشر ہوگا اور میرے یہاں قائم رہنے کیلئے

جانتے ہو اس نے کس چیز کی ترغیب دی۔(اس کی طرف جھک کر اور ہر جملہ پر اس کے بالوں کے لچھوں کو سہلاتی ہوئی) اپنی طاقت میری حفاظت کے لئے۔ اپنی محنت میری زندگی کے لئے۔ اپنا وقار میری شان کے لئے (زم پڑتے ہوئے) نہیں میں تمہارے دلکش نغمہ کو غلط ترتیب سے خراب کئے دے رہی ہوں کیوں نا پیارے (محبت سے اپنا گال اریل کے گال سے ملا دیتی ہے)

م۔ (بالکل از خود رفتہ ہو کر اس کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اور اس سے بالکل بھولے بچوں کی طرح ہم آغوش ہوتے ہوئے) جو کچھ تم نے کہا بالکل صحیح کہا ایک ایک لفظ صحیح۔ جو کچھ میں ہوں تمہارا ہی بنایا ہوا ہوں تمہیں نے مجھے اپنے ہاتھوں کی محنت اور دل کی محبت سے بنایا ہے۔ تم میری بیوی بھی ہو میری ماں بھی اور میری بہنیں بھی۔ ہر ایک کی محبت اور خبر گیری تم میں ملی ہوئی موجود ہے

ک۔ (اس کے بازوؤں میں ہلتی ہوئی یوجین سے) کیا یوجین میں تمہارے لئے بھی تمہاری ماں اور تمہاری بہنیں ہوں

ی م۔ (اٹھتے ہوئے سخت حقارت کے انداز میں) نہیں کبھی نہیں! اچھا تو بس اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ (ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) نہیں یوجین کیا تم اتنی رات گئے چلے جاؤ گے؟

ی م۔ (اس کے الفاظ میں اب ایکدم مردانہ لہجہ آگیا ہے لڑکوں والا لہجہ نہیں رہا) مجھے معلوم ہے کہ کونسا وقت کس بات کے لئے مناسب ہے۔ جو کچھ مجھے کرنا ہے اس کو کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔

م۔ (وہ بھی کھڑا ہو گیا) کینڈڈا اسے کوئی عجلت کی بات نہ کرنے دینا۔

ک۔ (مطمئن۔ یوجین کی طرف مسکراتے ہوئے) نہیں اس کا ڈر نہیں ہے۔ وہ بغیر خوش ہوئے زندہ رہنا سیکھ گیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب خوشی کی تمنا نہیں رہی۔ زندگی خوشی بہت بہتر اور برتر چیز ہے۔ پادری جیمس میں دونوں ہاتھوں سے اپنی خوشی تم کو دیتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے۔ اس لئے کہ تم نے اس عورت کو آسودہ کر دیا ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔ خدا حافظ۔ (وہ دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ اچھا ایک آخری بات اور سن لو (وہ رک جاتا ہے لیکن بغیر اس کی طرف مڑے ہوئے۔ کینڈڈا اس کے پاس جاتی ہے) تمہاری عمر کیا ہے یوجین؟

ی م۔ اس قدر جتنی کہ اس وقت دنیا کی عمر ہے۔ حالانکہ صبح میں صرف اٹھارہ برس کا تھا۔

ک۔ (نہارہ) اچھا تو تم میری خاطر ذرا دو جملوں کو ایک نظم میں نظم کر دینا اور مجھ سے وعدہ کرو کہ جب کبھی میرا خیال آئے گا ان کو ضرور کہہ لیا کرو گے

ی م۔ (بغیر کوئی حرکت کئے) چلے بتاؤ کیا ہیں؟

ک۔ جب میری عمر تیس برس کی ہوگی اس کی پینتالیس کی جب میں ساٹھ کا ہوں گا تو وہ پچھتر کی ہوگی۔

ی م۔ (اس کی طرف بڑھتے ہوئے) یہ تو کوئی بات نہیں ایک سو برس میں ہم دونوں عمر کی ایک ہی منزل میں ہوں گے۔ لیکن اس سے بہتر مجھے ایک بھید معلوم ہو گیا ہے جو میرے دل میں محفوظ ہے اچھا بس اب مجھے جانے دو۔ رات بہت جا رہی ہے اور موسم باہر بہت خراب ہے۔

ک۔ خدا حافظ۔ (اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے وہ اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور فوراً گھٹنوں کے بل ہو جاتا ہے وہ اس کی پیشانی چوم لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے چل دیتا ہے۔ کینڈڈا ماریل کی طرف واپس آتی ہے اپنے بازو پھیلائے ہوئے) آہ جیمس!

(دونوں ہمکنار ہو جاتے ہیں لیکن دونوں یہ نہیں سمجھ پاتے کہ شاعر کونسا بھید اپنے دل میں لے کر گیا)

(پردہ)

مترجمہ نور الحسن ہاشمی

# نوید فردا

اب غمِ دل ہی علاجِ غمِ دوراں ہوگا — دردِ کونین ہی اب مژدۂ درماں ہوگا

دورِ تاریکیٔ پیہم ہے تو غم کیا ناداں! — تپشِ زیست اگر کم ہے تو غم کیا ناداں!
شعلۂ مرگ جو برہم ہے تو غم کیا ناداں! — شعلۂ مرگ ہی اب سر بگریباں ہوگا

یہ تباہی ہے اک آبادیٔ نو کی تقریب — غرق کردے گی مشیت یہ طلسمِ تخریب
خواب ہو جائے گا آلام کا سیلاب مہیب — سرد آتشکدۂ فتنۂ دوراں ہوگا

یہ جو لہرا کے اٹھا ہے افقِ امکاں سے — پھول برسیں گے اسی ابرِ شرر افشاں سے
کیوں ہے تجھکو غمِ طوفاں کہ اسی طوفاں سے — اک نیا ساحلِ امید نمایاں ہوگا

اک نئی صبح کی تعمیر ہے تاریکیٔ شام — لمحہ لمحہ ہے یہاں قاصدِ تجدیدِ نظام
یہی شعلے کہ جو لائے ہیں خزاں کا پیغام — انہیں شعلوں سے چراغانِ بہاراں ہوگا

خود ہی اٹھ جائیں گے سرمایہ و محنت کے حجاب — رخِ گیتی نظر آئے گا برافگندہ نقاب
جگمگا دے گا جہاں کو نفسِ عالمتاب — پردۂ ابر سے خورشید نمایاں ہوگا

عدل و انصاف و مساوات کا پرچم لے کر — ابنِ آدم کے لئے جنتِ آدم لے کر
زندگی آئے گی تسکینِ دو عالم لے کر — یہ جہاں غیرتِ کاشانۂ رضواں ہوگا

سینۂ دہر سے ہٹ جائے گا سنگِ بیداد — کر سکے گا نہ کوئی روحِ بشر کو ناشاد
تازگی قلب کو بخشے گا ضمیرِ آزاد — ذوقِ پرواز بصد نازِ پر افشاں ہوگا

بند ہو جائے گا دروازۂ مکر و تزویر — نہ سنے گا کوئی افسانۂ دار و زنجیر
دل شکن ہی نظر آئے گا نہ کوئی دلگیر — دلِ انساں ہی نثارِ دلِ انساں ہوگا

جلوہ گر ہوگی زمانے میں وہ تہذیبِ عظیم — ہمہ تن شوق ہے جس کیلئے ہر قلبِ سلیم
جس کی موجوں سے رواں کوثر و تسنیم و نسیم — تازہ تر فیض سے جس کے چمنِ جاں ہوگا

شعلۂ غم کو بجھا دے گی ہوائے دوراں    سرِ آلام جھکا دے گی ہوائے دوراں
پھول کانٹوں کو بنا دے گی ہوائے دوراں    دامنِ دہر گل افروز و گل افشاں ہوگا

خود پرستی کا جہاں سوز ترانہ کب تک!    امتیازات تمدن کا بہانہ کب تک!
نسل اور رنگ کا تاریک فسانہ کب تک!    عام اب ہر شرفِ عالمِ امکاں ہوگا

یہ تمدن جسے پندارِ خود آرائی ہے    یہ تمدن کہ جو پروردہ دارائی ہے
یہ تمدن کہ جو انسان کی رسوائی ہے    یہ تمدن ہی اب اک خوابِ پریشاں ہوگا

عافیت خانۂ جمہور بنے گی دنیا!    سوزِ دل سے ہمہ تن نور بنے گی دنیا!
ہم نشینِ شہ و مزدور بنے گی دنیا!    کوکبِ امن و مساوات درخشاں ہوگا

خاک ہو جائے گی کندن انھیں میدانوں کی    خلد بن جائے گی دنیا انھیں ویرانوں کی
اب بدلنے کو ہے تقدیر بیابانوں کی    اور ہی رنگِ رخِ گردشِ دوراں ہوگا

صبحِ نو عرش سے پیغامِ بقا لائے گی    بہرِ اربابِ وفا روحِ وفا لائے گی
مژدۂ خدمتِ مخلوقِ خدا لائے گی    خدمتِ خلقِ خدا مذہبِ انساں ہوگا

بھوک اور غم کے مظالم نہ سہے گا انساں    اب نہ افلاس کی موجوں میں بہے گا انساں
کسی انساں کا بھکاری نہ رہے گا انساں    ہر بشر نازکشِ رحمتِ یزداں ہوگا

شمعِ بیداریٔ افکار فروزاں ہوگی!    آگہی جرأتِ احساس پہ نازاں ہوگی!
زندگی نغمۂ آزادیٔ انساں ہوگی!    دہر گہوارۂ آزادیٔ انساں ہوگا

کم نگاہی کی ضرورت نہ رہے گی باقی    یہ سلگتی ہوئی نفرت نہ رہے گی باقی
یہ چمن سوز سیاست نہ رہے گی باقی    ایک ہی مرتبۂ لالہ و ریحاں ہوگا

اب جسے دولتِ عرفانِ مبیں حاصل ہے    چشمِ بیدار و دلِ درد نشیں حاصل ہے
سوزِ دل سوزِ وفا سوزِ یقیں حاصل ہے    وہی تاباں و درخشاں و فروزاں ہوگا

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی)    روشؔ صاحب صدیقی

# رابندر ناتھ ٹھاکر (ٹیگور)

تری نوا تھی کہ ایک سحر کا کرشمہ تھا؛ ترا کلام تھا یا ایک طلسم زندہ تھا؛
خمار عشرت عرفاں سے نغمہ پیمائی وہ تیرے گیت نہیں سادگی کا معجزہ تھا؛

وہ سوز و درد کی لذت ترے بیان میں تھی
جو ریشہ ریشہ میں ہر دل کے کل جہان میں تھی

سرودِ گیتی کے تاروں کو کیسا ملایا تھا! دلوں کے چنگ میں اک زمزمہ جگایا تھا
خزاں نصیبوں کو مژدہ بہار نو کا دیا! پیام کیا تھا جو تو نے انھیں سنایا تھا؛

گداز و سوز کا کیسا راز آشکار کیا؟
زمین سوختہ بختی کو لالہ زار کیا!

بچوڑ کر فلک نیلمی کا سوسنی رنگ، سمیٹ کر شفق لالہ گوں کی بھولی ترنگ
ہلال صبح کی سیمیں شعاعیں ٹپکا کر ملا کے برق طربناک و صوت بے آہنگ

وہ کھینچی عیش ترنم کی جانفزا صہبا
سرورِ ہستی سے لبریز کر دیا مینا!

تو سو نے مندروں میں پھولوں کی مہک لایا تو اجڑے باغوں میں شادابی کی لہک لایا
سکھائے تو نے شگوفوں کو کس جہاں کے گیت گویا باغ کا جن سے اڑا چہک لایا؛

وہ بول جوئی کے جھڑتے تھے تیری بنسری سے
جو بھینی بھینی صداؤں کا روپ بھرتے تھے!

شرار لالہ سے آتشکدے بنائے ہیں تبسم گل انجم سے گل کھلاتے ہیں؛
چراغ پھولوں کے روشن صنم کدوں میں کئے جہاں صبا نے شگوفوں کے گیت گائے ہیں

شمیم نامہ ترے مطرب چمن کا بنی
نسیم پیک ترے پھولوں کے وطن کا بنی

وہ لوریاں سی تھیں تیری رسیلی باتوں میں — پہیلیوں کی سی الجھن وہ سیدھی باتوں میں
وہ چٹکیاں سی اچھوتے ترے ترانوں میں — وہ میٹھا میٹھا سا اک درد میٹھی باتوں میں

یہ کہنا "دل میں تو آتے ہو سامنے بھی تو آؤ!
جو گنگناتے ہو وہ گیت مجھ کو بھی سکھلاؤ"

برہ کی آگ سے دل کے دیئے کو سلگانا — دکھوں کی بتیاں ایک ایک کر کے اکسانا
کبھی یہ پوچھنا "پوجا یہ کب قبول ہوگی؟" — غموں کے داغوں کو تاروں کی طرح گنوانا

یہ کہنا "آتے کدھر سے ہو یہ بتاؤ مجھے؛
کواڑ دل کے مرے کھول کے دکھاؤ مجھے!"

کبھی وہ پتوں کی تتلاتی سرسراہٹ پر — کبھی وہ پھولوں کی شرمیلی چلبلاہٹ پر
کبھی وہ دور کے دھیمے سروں کے جھونکے پر — کبھی ہوا کے دبے پاؤں کی آہٹ پر

یہ کہنا چونک کے "دیکھو وہ آنے والے ہیں!
کدھر سے جھانکوں اندھیرے بھون میں تالے ہیں!"

جو گیت چھیڑے رباب حیات پر تو نے — اڑالے ہونٹوں سے پھولوں کے سوج خوشبو نے
بسا دئے وہ نئی آس اور امنگوں سے — جو دل کہ یاس میں مدت سے تھے پڑے سونے

سما گئی ترے نغمے کی لے زمانہ میں!
کہ جیسے چاندنی گردوں کے آشیانہ میں!

بسے دلوں میں ترے گیت جیسے پھول میں بو — سرور و کیف سے لبریز جیسے مے سے سبو
کرن خیال کی تیرے جہاں میں پھیل گئی — کہ جیسے بزم میں خوشبوئے نافۂ آہو

سبو کش مئے نغمہ ترا زمانہ ہوا
تری نوا سے کوئی تھا جو آشنا نہ ہوا!

سریلے سر ترے گیتوں کے دل میں کھبتے تھے — جو نشتروں کی طرح جاں کی رگ میں چبھتے تھے

---

نوٹ ۱۔ ۶، ۷، ۸ ان تینوں بندوں میں ٹگور کے گیتوں کے کم و بیش لفظا و خیالا دوہرائے گئے ہیں۔

کبھی چراغ سے پٹ بیجنوں کی روشنی کے خیال تیرے چمکتے تھے اور بجھتے تھے

وہ لوریاں سی تھیں تیرے اچھوتے خوابوں کی

کہ جن میں چاندنی اور رات مل کے بہتی تھی!

سما گیا تھا ترے دل میں کس جہاں کا جمال جو دل کے پردوں میں بھی چھپ کے رہ گیا تھا خیال!

سروں میں پھرتی تھیں پرچھائیاں سی شرمائی! جو ہو گیا کبھی بیتابی نظر کا سوال!

وہ کون تھا کہ جو چھپ چھپ کے گنگناتا تھا!

دھنوں میں چھن کے تری راگ کس کا آتا تھا!

شفق کے پھول تھے یا دھن ترے ترانہ کی جو ٹہنیوں میں صبح شام کے لٹکتی تھی!

تری نوا میں نہ جانے کہاں کا جادو تھا ہر ایک بات کلیجہ مسوس لیتی تھی!

سروں میں بین کے کیا بجلیاں سی کوندتی تھیں!

جو راز عشق کے کون و مکاں کو روندتی تھیں!

فضائے سوز کا تو آفتاب ہو کے رہا جہان درد میں تو انتخاب ہو کے رہا

نشاط عشق کا کیا راز تو نے کھول دیا! کہ روئے حسن ازل بے نقاب ہو کے رہا!

سرور کیف دو عالم ترے کلام میں ہے

خمار بادۂ وحدت ترے پیام میں ہے

وہ شعلہ عشق کا بھڑکایا خاک انساں میں رفو کی جگہ نہ چھوڑی فنا کے داماں میں

چراغ اشک سے الفت کا راز ڈھونڈ لیا جہان سوز کی ہر شمع شعلہ ساماں میں

نقاب تو نے اجل کا اٹھا کے دیکھ لیا

کہ زیست ماہ ازل پر کتاں کا پردہ تھا!

ستارے اب بھی وہی ہیں جو تو نے دیکھے تھے! وہ پھول آج بھی کھلتے ہیں کل جو کھلتے تھے!

نسیم صبح وہی، بلبلوں کے گیت وہی وہ اب بھی ملتے ہیں جو پہلے وقت ملتے تھے!

ہو کاروان وہی، منزل وہی ہے، راہ وہی وہی ہو عشق، وہی حسن، وہ دل کی آہ وہی!

وہی جمال وہی سازا ور وہی نغمہ　　وہی ہے مطربِ عشق اور دردکا زمزمہ

وہی بہار و خزاں ہے، وہی حیات و ممات　　وہی ہے بزم، وہی شمع و سوز پروانہ!

ظروف میکدہ ہیں جام و شیشہ و مینا

ہو مے گسار کوئی خم میں ہے وہی صہبا!

وہی ہیں حسن کے گیسو اور عشق کا شانہ　　وہی ہے ذوق خود آرائی اور آئینہ

وہی لباس بدلنا بہار کا ہر بار　　وہی شہید خزاں کا ہے شاہدِ غنچہ

سبو نئے سہی، مے بھی نئی، نیا ساقی

ہیں کیف روح کے سامان تو وہی باقی

نظر وہی ہے نظارہ ہزار تازہ ہو　　وہی ہے رنگِ گل نو بہار تازہ ہو

وہی خموشیٔ غنچہ وہی تبسم گل　　ہے دل میں داغ وہی لالہ زار تازہ ہو

ہزار پر لگیں، لیکن وہی ہے روحِ شمیم

پیامِ صبحِ ازل کا وہی ہے پیک نسیم

ہے نقش فانی ازل کے نقاب کے باہر　　کہ جیسے سایہ مہ و آفتاب کے باہر

نہ کیف بادہ ہے پیانہ میں نہ شیشہ میں　　ہے نغمہ زخمہ و تار و رباب کے باہر

دوام کا ہے ترے راز تیرے گیتوں میں

ہو جسم خاک، مگر تو رہے گا جیتوں میں

مے کہن ترے ابریق عنبریں میں نہ تھی　　بھری تھی بجلیوں میں ماہتاب کی مستی!

کبھی جو مشک ملا کر وہ بادہ تند کیا　　تو ذرّوں نوشوں میں کرتی تھی رقص مدہوشی!

اسی جہان کا صہبائی وہ جہان بھی ہے

اسی خمار کی انگڑائی آسمان بھی ہے!

(از سنٹرل جیل، لاہور)　　آصف علی صاحب بیرسٹر

*

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

## انجمن تاریخی تحقیقات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا رسالہ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۱ء (انگریزی)

مدیر شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔اے ملنے کا پتہ نمبر ۸ شبلی روڈ علی گڈھ قیمت فی پرچہ عہ، سائز ۸/۲۲×۱۸، کاغذ وطباعت بہت عمدہ۔

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کو ایک عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوا کہ کسی ملک کی آئندہ نسلوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کی سچی تاریخ لکھی جائے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر اور ہر پہلو سے دیکھ کر سمجھ سکیں کہ دنیا کی سلطنتیں صرف قوت پر قائم نہیں رہتیں بلکہ رعایا پروری پر۔ ہندوستان کی زمانہ وسطیٰ کی تاریخ جو انگریزی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں زیادہ تر سیاسی پہلو دکھلایا گیا ہے اور معاشی رخ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑہ علی گڈھ کی انجمن نے اٹھایا ہے اور چار ماہ کے بعد یہ تحقیقی رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ خدا کرے اس جد وجہد میں وہ کامیاب ہو۔ ہندوستان کی زمانہ وسطیٰ کی تاریخ جو مسلمانوں نے لکھی ہے وہ فارسی زبان میں ہے اور اس زمانہ کے علمی مذاق کے مطابق ادب و اخبار کو جدا نہیں کیا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات ادب کے استعارات اور مضمون نگاری کی بلند پروازیوں میں الجھ گئے۔ انگریزی مورخوں کو یہ اچھا موقع ملا کہ واقعات کو الجھاؤ سے نکال کر انہوں نے اپنی پالیسی کی اشاعت کے لئے ان پر رنگ آمیزی کی۔ بہت سے واقعات ہندوستان کے زمانہ وسطیٰ کی تاریخ میں موجود ہیں جن کے نفس مطلب کو انگریز مورخوں نے صرف مفقود ہی نہیں کیا ہے بلکہ جن پر اچھی طرح رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ ضرورت اس کی شدید تھی کہ اساتذہ مسلم یونیورسٹی جو اس کام کے اہل ہیں اور جن کے پاس لٹن لائبریری کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے وہ پورے تجسس کے بعد ہندوستان کی زمانہ وسطیٰ کی ایک ایسی تاریخ لکھیں جو سچے واقعات سے معمور ہو اور اس بات کو ثابت کردے کہ مسلمانوں کی ہفت صد سالہ

سلطنت صرف تلوار کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ زیر نظر اشاعت میں بہمنی حکومت کے واقعات، عہد مغلیہ کی ڈائریاں، سلاطین دہلی کا طریقہ اطلاق جاگیر شاہان تغلق کا نظام زراعت، اورنگ زیب کی پالیسی، وغیرہ مضامین بہت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ رسالہ کی چھپائی اور کاغذ باوجود آج کل کی گرانی کے قابل تحسین ہے قیمت میں کمی کی گنجائش اس وقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ اس کی ضرورت ہے کہ ایسے رسالہ کی اشاعت ملک میں وسیع ہونا لازم ہے کہ قیمت میں کمی ہونی چاہئے۔

**البیان** (جون و جولائی نمبر) قیمت ۱۲ر صفحات ۱۴۴، دفتر امت مسلمہ امرت سر۔

البیان کا یہ خاص نمبر "الوراثۃ فی القرآن" نمبر ہے۔ اس میں وراثت کا مسئلہ قرآن سے اخذ کر کے ثابت کیا گیا ہے اور بعض مروجہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

**فردوس**:۔ قیمت فی پرچہ ۶ر سالانہ للعہ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ فردوس جموں۔ کاغذ و کتابت اچھی طباعت معمولی صفحات ۴۸

بزم اردو جموں و کشمیر کا یہ ماہانہ رسالہ جون ۱۹۴۱ء سے نکلنا شروع ہوا ہے پیش نظر جولائی نمبر میں مدیر کا نام درج نہیں، مضامین کا دروبست اچھا ہے۔ سرورق اور آخری صفحہ پر کشمیر کے چند نظارے ہیں۔ انور مختار صاحب کا مضمون "ہم محبت کیوں کرتے ہیں" بہت اچھا ہے۔ ویسے بھی دیگر نثر و نظم کے مضامین خاصے ہیں صفحات کے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ کشمیر کی بزم اردو کی اس اولین سعی کی ہر ممکن طرح سے ہمت افزائی کی جائیگی

**جدید اردو** (سالنامہ) قیمت ۱۲ر صفحات ۲۰۸، ملنے کا پتہ نمبر ۳۶، مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ۔

کلکتہ سے یہ رسالہ عرصہ سے نکل رہا ہے اور اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ زیر نظر نمبر میں اچھے اچھے مقالے، ادبی شہ پارے نظمیں اور افسانے ہیں۔ بنگال میں اردو کا چرچا جس محنت اور خوبی سے اس نے قائم کر رکھا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

**رسید**:۔

**مجلہ نظامیہ** (خصوصی شمارہ) بہ یادگار فخر قوم ملا عبدالقیوم، مرتبہ ابوالخیر کنج نشیں۔ صفحات ۱۹۲ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ۔ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی۔ حیدر آباد دکن۔

**دارالاسلام** (خاص نمبر یعنی پارہ عم معہ ترجمہ تفسیر و معانی الفاظ) مرتبہ شعبہ اشاعت قران ادارہ دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ پنجاب، قیمت فی پرچہ ۸ر

# احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گونالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں (میر)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون وچرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولانا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں سے ان تک پہنچے تھے بایں ہمہ وہ اردو ادب شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطۂ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مقبول و مروج ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات اور تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے اس اعتبار سے ان کو ترقی پذیر اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پذیر اور ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سُنے

رحلت کے وقت مرحوم کا سن ۶۵-۶۶ کے لگ بھگ رہا ہوگا جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوشدلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آراء ہوا فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے مطلب براری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ اور تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہوگئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتائے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے۔

پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم لمبا قد، عینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے اکثر لائبریری پہونچتے ہیں۔ پروفیسر کرنکو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے ہوتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار Model de Luxe کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ

بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ سے کم نہ تھی

زبان و بیان یا شعر و شاعری سے متعلق باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے۔ کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اُردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اُردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کرتے کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں اِن سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں ساری عمر اسی میں گنوائی۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔

ایک دن شعبۂ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ سودا کا بستہ ساتھ تھا اردو شعراء کا مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی، اور کام کیا شروع کر رکھا ہے ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نووارد کا ان سے تعارف کرایا گیا۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا غیر حاضر رہے ہیں۔ نووارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ مسودہ کی طرف مائل ہوں مولانا نے مطلق التفات نہ کیا اس سے نہ تو نووارد کی دلجمعی ہوئی نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی۔ مولانا نے کسی قدر اکتا کر مسودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہکر مسودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرائت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہئے مفت میں بلوا دیں!

مولانا نے بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نووارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا

ایک دوست نے مولانا کو انتہائی رازدار سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولانا کے دل میں جاگزیں ہو گیا ہے اور بقول غالب "سینہ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنی اَن سنی کرتے جاتے تھے اور جب انھیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھر کم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور نکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کر لی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کر لی جتنی انھوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جد وجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پسپا نہ ہوں گے چنانچہ میں نے روک تھام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اٹھ کر بھاگا۔ مولانا باآں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بیٹھے بیٹھے ہی فرمایا رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی در Rearguard action "ریر گارڈ ایکشن"[1] (جنگ پسپائی) سے پورے طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہی ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں مولانا میں ابھی آتا ہوں مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی۔ میں گر گیا مولانا نے راز فاش کر دیا تھا

مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے

---

[1] اس سلسلہ میں غالب کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق ۔۔۔ جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

چنانچہ مرحوم کے عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اسوقت نظر آتی جب مولٰنا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولٰنا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طرح سے وابستہ رہتے جیسے مولٰنا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولٰنا کے قریب جاکر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولٰنا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے انکی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے پاجامے۔ سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شگفتگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیصیں پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، مولٰنا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قل آعوذیت تھی، قل آعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل آعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جا سکتا لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہانتک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یابی و نفع رسانی کا تعلق ہے۔

پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و دنیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چپو لیں سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے۔ تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیبی کو گذرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب کبھی ان پر فقرے بھی چست کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا، بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جبکہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستاں کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری، تصنیف و تالیف تحقیق و تدقیق میں گذار دی۔ اپنے استاد کے مسلم الثبوت پیرو تھے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی جیتی جاگتی شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان، محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے

سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جارہے ہیں صحت زبان اور مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے۔ کس کو فکر وفرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جارہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔

مولٰنا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گذرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیحضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولٰنا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا عالم یہ تھا کہ شعبہ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے۔ علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جارہی ہے مشکل سے تین چار دن گذرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہوگئی۔ مولٰنا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اسوقت ہوسکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرعہ طرح دیدیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کردیں۔ مولٰنا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہوگئے آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہوجاتا تھا ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستینیں چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ، یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر صاحب کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پہ پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرع طرح دو دیکھیں

کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا، مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے مشاعروں میں نافذ کر دیے جائیں تو کیسا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے بڑا اچھا ہو کمبخت گویوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں "فیصل" میں کس کس قسم کے وحوش وطیور کہاں کہاں سے کھنچکر آتے ہیں اور صید وصیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں بکہ بانوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے یاد ہے!

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادے لب ولہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں ۔۔۔ بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

فرمائیں معاف نوجوانان سخن ۔۔۔ بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو صف اول کو مدنظر رکھکر پڑھا گیا، مجمع سے وہ نعرۂ تحسین وتہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت ۔۔۔ یہ مصرف خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف وانہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعراء مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے یہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گذرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور ومطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا چنانچہ

رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدردانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے مہربانیت پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنئیے۔

**صاحب۔** (سرخ ہو کر اور مع کرسی میری طرف رخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

**میں۔** (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب!

**صاحب۔** (چیں بجبیں ہو کر) بے شک مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی۔ ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

**میں۔** جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

**صاحب۔** (نہایت غصّہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں!

**میں۔** شعر پڑھنے

**صاحب۔** شعر!

**میں۔** شعر، جناب والا!

**صاحب۔** اپنے شعر!

**میں۔** مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

**صاحب۔** لیکن یہ ہوا کیا!

**میں۔** ہوتا ہوا تا کچھ نہیں عالیجاہا لیکن مانتا کوئی نہیں۔

**صاحب۔** تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے!

میں۔ جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرمالیں بہت سی باتیں واضح ہوجائیں گی۔

صاحب۔ بہت خوب مولانا کو میرے ہاں لانا۔(کسی قدر زہرخند فرماکر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

(دوسرا منظر)

پردہ وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوئے صاحب یک لخت جھجکے لیکن فوراً ہی سروقد ہوکر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرساں حال نہ تھا۔ البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے۔ یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سروقد کھڑے ہوگئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہوگئی۔

(ڈراپ سین)

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھ چکے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ دبرہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے۔ معلوم ہوا بعض طلبا کلاس میں سکوت وسکون قائم نہیں رہنے دیتے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔

معاملہ رفت وگزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی فرمایا۔ رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گذارنے اور تفریح وتفنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہیں کرلیں علم تو ان کو ملنے کا نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر وقیمت رکھتی تھیں اب وہ مردود

ہو چکی ہیں حفظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیئے نہیں لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کا شکار ہیں۔

مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا۔ بولے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجئے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کر لیتے ہیں۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ۔۔۔ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو در کنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس وضعداری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ۔ کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوئے، یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ راگست سنہ ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہونچ گئی۔

اگست سنہ ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا، مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی کہ مولانا احسن صاحب کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہونچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اور کیوں

حضور، سنتا ہوں خنداںؔ[1] شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب اور کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت متولی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیجدیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں!

عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] راقم الحروف کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ جو اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

# گرانی اور ہندوستان

وہ زمانہ تو بہت دور گیا جب سیاسی جنگیں لڑی جایا کرتی تھیں۔ اب تو معاشی لڑائیوں کا زور ہے ہر فریق دوسرے کو معاشی زک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے اثاثوں کو ضبط کرنا بحری ناکہ بندی، سامان لانے اور لیجانے والے بدرقوں پر حملے، دشمن کے کارخانوں اور گوداموں پر گولہ باری اور اپنے علاقوں کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے پہلے خود ہی ہر طرح تباہ کر دینا کامیابی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ نازیت، فاشیت، اشتراکیت، جمہوریت، شہنشاہیت اب صرف سیاسی اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ ان میں معاشی مفہوم بھی پنہاں ہیں۔ بلکہ ہر "یت" کا بذات خود ایک مکمل معاشی نظام ہے اور ان ہی مختلف نظاموں میں کشمکش جاری ہے۔ پھر چونکہ ذرائع حمل ونقل کی آسانیوں، صنعتی ترقیوں اور تجارت خارجہ کی سہولتوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک بین الاقوامی معاشی نظام کے دائرے میں آگئی ہے اس لئے یہ کشمکش اور زیادہ شدید نظر آنے لگی ہے کوئی ملک اپنی روزانہ کی استعمال کی معمولی معمولی چیزوں کو لے لے اور دیکھے کہ وہ کہاں کہاں سے آ رہی ہیں، ربڑ پنسل، پالش کی ڈبیاں۔ استروں کے بلیڈ، صابن، تیل، رومال وغیرہ دیکھنے میں کس قدر حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر دنیا کے دور دراز ملک ان چیزوں کو مہیا کرتے ہیں جب بھلا معمولی چیزوں کا یہ حال ہو تو پھر اہم اور ضروری کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ لڑائی دو ملکوں کے درمیان ہوتی ہے مگر اس کا اثر ساری دنیا پر پڑتا رہتا ہے۔

موجودہ جنگ کی طرح تو آج تک دنیا میں کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ اس جنگ میں ساری دنیا کے ملک تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک حملہ کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ دوسرے مدافعت کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ تیسرے غیر جانبدار، یہ تقسیم کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ہر بڑی لڑائی میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر دوسری لڑائیوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تعداد زیادہ رہا کرتی تھی لیکن اس لڑائی کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں غیر جانبداروں کی تعداد کم ہے اور نسبتاً روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں بھی بعض نام نہاد طور پر غیر جانبدار ہیں ورنہ وہ کسی ایک فریق کے ساتھ ہیں مثلاً امریکہ آئینی طریقہ پر تو لڑائی میں شریک نہیں لیکن وہ کھلے بندوں اتحادیوں کا ساتھ دے رہا ہے یا اسپین علی الاعلان محوری طاقتوں کی طرفداری کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ملک ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حقیقی معنوں میں غیر جانبدار ہیں۔ اس طرح یہ دائرہ بہت ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ایسی صورت میں دنیا جنگ کے معاشی اثرات سے جتنی بھی متاثر ہو کم ہے۔

جنگ کا ایک عام معاشی اثر گرانی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم گرانی کے اسباب اور ہندوستان پر اس کے اثرات کو ظاہر کرنے کی حد تک محدود رہیں گے۔

گرانی کے اسباب | گرانی کیوں ہوتی ہے؟ اس مختصر سے سوال کا جواب دو چار لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا گرانی کے اسباب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں اپنی ضروریات کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ جو دوسرے ملکوں میں پیدا یا تیار ہوتی ہیں اور وہاں سے ہمارے ملک میں آتی ہیں دوسرے وہ چیزیں جو خود ہمارے ملک کے اندر پیدا یا تیار کی جاتی ہیں۔ اب باہر سے آنے والی چیزوں کو لیجئے ان کی قیمت اس لئے گراں ہوتی ہے کہ

(۱) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دشمن یا ان کے ساتھی ہیں اس لئے مال وہاں سے نہیں آ سکتا۔

(۲) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دوست ہیں۔ مگر ان کی توجہ جنگ کی طرف ہے اس لئے وہ ذخائر حرب زیادہ تیار کرتے ہیں اور دوسرے مال بہت کم تیار کرتے ہیں اور جب ان کے یہاں مال ہی کم تیار ہو تو وہ باہر بھی زیادہ مقدار میں نہیں بھیجا جا سکتا۔

(۳) اس زمانہ میں غیر جانبدار ملک نئے بازاروں پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر سمندری خطروں، بیمہ کی شرح میں اضافوں، ریلوں اور دوسری چیزوں کے کرایوں میں اضافہ کی وجہ سے اس مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مگر اس وقت دنیا کا کوئی بڑا ملک ایسا نہیں جو جنگ میں شریک نہ ہو اور یا سہلے متحدہ براہ راست

جنگ میں شریک نہیں مگر بالواسطہ طریقہ پر اس کی ساری توجہ جنگ اور ضروریات جنگ کی طرف لگی ہوئی ہے) اب رہ گئے چھوٹے چھوٹے ملک تو ان کے یہاں نہ ایسی صنعتی ترقی ہوئی کہ وہ نئے بازاروں پر قبضہ کر سکیں اور نہ اتنے جہاز کہ دوسرے ملکوں کو سامان بھیج سکیں۔ دراصل یہ فوقیت تو یورپ کے چند چھوٹے چھوٹے ملکوں مثلاً ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک وغیرہ کو حاصل تھی کہ وہ باوجود رقبے میں چھوٹے ہونے کے اور آبادی کی کمی کے بین الاقوامی تجارت میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے جنوبی امریکہ اور ایشیا کے اکثر ملک رقبے اور آبادی میں ان سے کافی بڑے ہیں لیکن ان کو یہ بات میسر نہیں۔ گویا اس طرح ہندوستان کی درآمد کو بڑا نقصان پہونچا اور باہر سے آنے والی اشیا کی مقدار گھٹ گئی اور ان کی قیمت بڑھ گئی۔

دوسری طرف خود اندرون ملک پیدا ہونے والی چیزوں کو لیجئے ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جن کی ہمیں بھی ضرورت ہے اور وہ جنگی اغراض و مقاصد کے لئے بھی ضروری ہیں مثلاً پٹرول، تیل، روئی، دھاگہ، کپڑا، اون، کمبل، چمڑے کا سامان، لوہے اور لکڑی کا سامان، زرعی پیداوار میں۔ ربڑ، شکر وغیرہ اب جو کارخانے فوجی اغراض کے لئے ان کو استعمال یا تیار کر رہے ہیں انکی ضرورت اہم اور شدید ہے اور ان کے پاس ایسے خریدار بھی ہیں جو اس سامان کی قیمت بھی زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ ایسے کارخانے خام مال کی قیمت زیادہ دے سکتے ہیں۔ یہ مزدوروں کو بھی زیادہ اجرت دیتے ہیں اور ان کا مال باوجود گرانی کے فروخت بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام کارخانوں سے خام مال اور مزدور ادھر آنے لگتے ہیں مگر دوسرے کارخانے بھی اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں، مجبوراً وہ بھی زیادہ قیمت اور زائد اجرت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں یعنی اس طرح عام اشیا کی لاگت بڑھ جاتی ہے لہذا ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر یہ اضافہ ایسا ہے جو بادی النظر میں ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے لیکن عوام اور ناواقف لوگوں کو اس وقت حیرت اور تعجب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو ان کے ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں مثلاً پان یا دودھ، پھل، ترکاریاں، مچھلی، دودھ، غلے وغیرہ جو کہیں باہر نہیں جاتے مٹی کے برتن، گھڑے، مٹکیاں، گملے وغیرہ ان چیزوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہندوستان کے کسی

ایک حصہ میں پیدا ہوتی ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں میں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ مزدوروں کی اجرت، اخراجات نقل وحمل اور باربرداری بڑھ جاتے ہیں۔ نئے نئے ٹیکس لگ جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا بار اشیا کی قیمتوں پر پڑکر ان میں اضافہ کردیتا ہے۔ دوسری طرف وہ چیزیں ہیں جو بالکل مقامی طور پر بنتی ہیں اور وہیں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی اچھی مثال مٹی کے برتن ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی نیا ٹیکس لگا نہ یہاں مزدوروں کی اجرت بڑھی کیونکہ یہ سب کام کمہار اور اس کا خاندان کرتا ہے اور نہ ان چیزوں کو اِدھر سے ادھر منتقل کرنے میں اخراجات بڑھتے ہیں۔ نیز ان کی بنوائی پر اتنا ہی وقت اور محنت صرف ہوتی ہے جتنی کہ پہلے ہوتی تھی پھر ان کی قیمت میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں روپیہ کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ یعنی جو چیز پہلے ایک روپیہ میں خریدی جا سکتی تھی اب اس کے دو روپے دینا پڑتے ہیں بالفاظ دیگر روپیہ آٹھ آنے کی برابر ہو گیا ہے لیکن غریب کمہار ان نکتوں سے ناواقف ہے البتہ وہ یہ جانتا ہے کہ پہلے وہ دس گھڑے روز بناتا تھا اور ان کو ایک آنہ فی گھڑے کے حساب سے فروخت کرکے دس آنے روز کما لیتا تھا اور ان دس آنوں میں وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی بھر لیتا تھا اور کچھ آنے بچا بھی لیتا تھا جو اس کے کپڑے لتوں میلے تہواروں اور تقریبوں پر کام آتے تھے۔ اب بھی وہ دس گھڑے بناتا ہے اور ان کو دس آنے میں بیچتا ہے مگر اب اس رقم کو جب وہ اپنی ضرورتوں پر صرف کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ بچت تو درکنار اس کے روزمرہ کے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے، اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی تعداد بڑھا دے تاکہ اس کو اتنی رقم ملنے لگے کہ اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں مگر ایک تو یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ روزانہ بیس گھڑے بنا لیا کرے۔ دوسرے اس کو اتنے خریدار بھی نہیں ملتے جو یہ گھڑے خرید لیا کریں، تیسرے طبعاً ہر انسان آرام پسند ہوتا ہے یعنی وہ کم کام کرکے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا آسان نسخہ یہی ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی قیمت میں اضافہ کردے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے عام چیزوں کی قیمت بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی گھڑوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس تجزیہ پر غور کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ کیوں ان چیزوں

کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جن کو جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

گرانی کا دوسرا سبب اضافہ اجرت ہے یعنی جب جنگ کے زمانہ میں چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگتی ہیں تو مزدوروں کو نقصان پہونچنے لگتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور ان کی پہلی اجرتوں سے ان کی ساری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں لہذا وہ اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ابتدا میں ان کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ابھی چیزوں کی قیمتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا کہ اجرت بڑھائی جائے۔ مگر جب مطالبات شدید ہوتے جاتے ہیں اور ہڑتالوں اور در بندیوں کی نوبت آنے لگتی ہے تو اجرتوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح لاگت بڑھ کر چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے

گرانی کا تیسرا سبب حقیقی دولت کی پیدائش میں کمی کا ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں سارے ملک کی توجہ سامان حرب یا جنگی اغراض کے لئے ضروری سامان تیار کرنے کی طرف رہتی ہے۔ کپڑے، لوہے، فولاد، چمڑے کے وہ کارخانے جو پہلے ملک کی عام ضرورتوں کے لئے چیزیں تیار کرتے تھے اب جنگی اغراض کے لئے سامان بناتے ہیں یا ان کی تیار کردہ چیزوں کی بڑی تعداد جنگی اغراض کے لئے خریدی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ملک میں ضرورت کی عام چیزوں کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مقدار کی کمی باقی ماندہ اشیا کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ اب اس زمانہ میں چونکہ نفع کافی ہوتا ہے اس لئے نئے نئے کاروبار کھلنے کی توقع کی جا سکتی ہے مگر جنگ کے زمانہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ خام مال کی قیمت کی زیادتی، اجرتوں میں اضافہ، شرح سود کی زیادتی، مقدار زر کی کمی اور سب سے بڑھ کر خریداروں کی کمی کی وجہ سے نئے کاروبار چلا کر نفع حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اور ہر معاشرہ میں ایسے اولوالعزم اور بلند حوصلہ آدمی کم ہوتے ہیں جو غیر معمولی خطرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کا مقصد جنگی اغراض کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی شعبہ میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں میسر آ جاتی ہیں اس وجہ سے نئے کاروبار کھلنے کے باوجود اس کمی کی تلافی کو پورا نہیں کیا جا سکتا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

گرانی کا چوتھا سبب تجارت خارجہ میں تخفیف ہے یہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے جس کا ذکر

ابتدا میں کیا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہمارے حلیف یا غیر جانبدار ملک باوجود خطروں، بیموں اور کرایوں کی شرحوں میں اضافہ کے زیادہ سے زیادہ مال درآمد کرنے کو تیار رہیں تو خود ہمارے پاس بھی اس قیمت کا مال یا خدمات ہونا چاہئیں جتنی قیمت کا مال باہر سے منگوایا جا رہا ہے۔ تجارت خارجہ کا یہی اصول ہے کہ وہ زر یا سکوں کی بدولت نہیں چلتی بلکہ ہر ملک اسی قدر مال درآمد کر سکتا ہے جتنا کہ وہ برآمد کرنے کے لئے تیار ہو یعنی اصولاً ہر ملک اپنی زائد اشیاء یا خدمات کو ہی برآمد کرتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں جب ملک کی حقیقی دولت کی پیدائش ہی گھٹ جائے تو اس کے پاس زائد اشیا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہیں خدمات یا ہندوستان جیسے زرعی ملکوں میں زرعی پیداواریں تو ان کا رخ بدل جاتا ہے مثلاً وہ لوگ جو جنگ سے پہلے حملہ کرنے والے ملکوں میں بینکاری یا بیمہ یا دوسرے کام کرتے تھے اب ان خدمتوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور خود ملک میں ان کی خدمات منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب رہیں زرعی پیداواریں تو وہ پہلے ان ملکوں کو برآمد کی جاتی تھیں جہاں سے ہم کو اپنی ضرورت کے مطابق مختلف سامان کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اب وہ حلیف ملکوں کو جاتی ہیں۔ پھر بعض وقت حلیف ملک ان کی قیمت (ان کے مساوی دوسری اشیا) بھی فی الوقت ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ہندوستان کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا یعنی اس طرح ہم اپنی رہی سہی زائد چیزوں کے منافع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

گرانی کا پانچواں سبب نفع کمانے کی ناجائز خواہش ہے عموماً ہر شخص ہر وقت (اگر اس کو موقع ملے) ناجائز منافع حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ مگر جنگ کے زمانہ میں بعض امکانات اس توقع کو بڑھا دیتے ہیں اور اس وجہ سے خوب نفع ستانی ہوتی ہے۔ اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں جنگ نے طول کھینچ لیا تو ملک میں باہر سے آنے والی چیزوں کی مقدار گھٹ جائے گی اور ان کی قیمت بڑھ جائیگی اور اس وقت جن لوگوں کے پاس مال ہوگا ان کو خوب نفع ہوگا لہذا وہ ابھی سے اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دیتے ہیں اور یہ ظاہر کر کے کہ ان کے پاس بہت تھوڑا مال ہے اس کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک طویل عرصہ تک وہ ناجائز منافع حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے والے بڑے بڑے تھوک فروش تاجر

ہوردو کا نذار ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ریڈیو بحری تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے سارے حالات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ نیز جس طرح حکومتیں کسی آنے والی جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی پہلے سے غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں مثلاً بین الاقوامی حالات سے انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ عرصہ میں دو ملکوں کے تعلقات خراب ہوجانے والے ہیں لہٰذا وہ پہلے ہی سے وہاں سے کثیر تعداد میں ضروری سامان منگوا لیتے ہیں۔ اس طرح اپنے ذخیروں کی مقدار بڑھا لیتے ہیں۔ پھر ہر تھوک فروش کے پاس ایسا سامان کثیر مقدار میں ہوتا ہے جو کم قیمت پر خریدا گیا تھا مگر حالات میں تبدیلی ہوتے ہی وہ ایک دم چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً جس دن حکومت برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں اور مقبوضوں نے جاپانی اثاثوں کو ضبط کیا اس کے دوسرے دن بمبئی میں بعض جاپانی چیزوں کی قیمت دوگنی ہوگئی۔ اس قسم کی من مانی کارروائیاں ملک پر بڑے بڑے اثرات ڈالتی ہیں اور بعض اوقات صورت بہت ہی نازک ہوجاتی ہے، جیسا کہ اس مرتبہ ہندوستان میں ہو رہا ہے اور حکومت کو کوشش کرنا پڑتی ہے کہ اس ناجائز منافع کی روک تھام کرے۔ چنانچہ اس مرتبہ جنگ شروع ہوتے ہی نگرانی نرخ اشیا کے سلسلہ میں دو ایک کل ہند کانفرنسیں ہوئیں جس میں سارے برطانوی صوبوں اور اکثر بڑی بڑی ریاستوں نے اشتراک کیا۔ بعض صوبوں میں حکومت کی جانب سے چیزوں کے نرخ مقرر کئے گئے بعض جگہ سرکاری دوکانیں قائم ہوئیں۔ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں۔ مگر ان عارضی بندشوں سے منافع ستانی کی حقیقی روک تھام نہ ہوسکی اور یہ شکایت اب پھر بڑھ گئی ہے چنانچہ پھر حکومت ایک کانفرنس کے انعقاد پر غور کر رہی ہے۔

گرانی دراصل ایک چکر ہے یعنی جب ایک چیز گراں ہوتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی گراں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ گیہوں یا چاول کی ہندوستانی فوجوں یا دوسری فوجوں کے لئے باہر بھیجنے کی ضرورت ہوئی اس۔ لئے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اب ملک کے وہ غریب لوگ جو پہلے گیہوں یا چاول کھاتے تھے ان کے بجائے دوسرے معمولی اور ارزاں غلے مثلاً جوار، باجرہ، رائی، کودوں وغیرہ کھانے لگے گویا اب ان چیزوں کی مانگ بڑھی اور یہ قاعدہ ہے

کہ جب کسی چیز کی مانگ بڑھتی ہے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہذا ان چیزوں کی قیمت بڑھ گئی یہی اصول دوسری تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے اور ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسی کو عام گرانی کہا جاتا ہے جس کے اثرات بہت شدید اور اہم ہوتے ہیں۔

گرانی کے اثرات گرانی کے اسباب معلوم ہونے کے بعد اس کے اثرات معلوم کرنا ضروری ہیں۔ گرانی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ معین آمدنی پانے والوں کو نقصان ہونے لگتا ہے۔ اس طبقہ میں تین قسم کے آدمی شامل ہیں ایک کارخانوں کے مزدور، دوسرے متفرق مزدوری کرنے والے، اور تیسرے حکومت کے ملازم، پہلا طبقہ بہت کچھ منظم ہے اس پر حکومت کی بھی کوئی بندش نہیں۔ ان کی انجمنیں اور سبھائیں بھی ہیں ان کے جلسے اور کانفرنسیں بھی ہوتی رہتی ہیں یہ شروع میں آئینی اور پرامن طریقوں پر اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان کے مطالبے تسلیم کرلئے جاتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے ورنہ ہڑتالوں اور در بندیوں کی نوبت آتی ہے بالخصوص جب جنگی مقاصد کو ان سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو اور نازک حالات ہیں حکومت کی مداخلت ضروری ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو حکومت کو کارخانوں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا ہے جیسا کہ آج کل ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکثر مقامات پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں اب تک صورت حال کبھی اتنی نازک تو نہیں ہوئی لیکن پولیس کی نگرانی اور پہرہ، لاٹھی چارج، مزدوروں کی گرفتاریاں اور سزائیں اور مزدوروں کے کارخانوں اور منتظمین پر حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو تھوڑی بہت مداخلت بھی کرنا پڑتی ہے، بہرحال ان متحدہ کوششوں سے ان کو فائدہ پہونچ جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ متفرق مزدوروں کا ہے نہ ان کی کوئی انجمن ہے نہ رہنما، پھر یہ مختلف پیشوں میں مصروف رہتے ہیں آئے دن ان کے آقا اور مالک بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی منظم کوشش کرکے اپنی اجرت نہیں بڑھوا سکتے لیکن عام حالات کے ساتھ ساتھ بتدریج ان کی اجرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب تک ان کی اجرت اس معیار پر پہونچتی ہے ان کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس گروہ کے نکمے اور کام چور آدمی اس مجبوری دورے سے تنگ آکر محنت سے جی چرانے لگتے ہیں اور جائز طریقوں کے بجائے ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں چنانچہ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل، خون اور طبقہ واری فسادات

میں اضافہ ہونے لگتا ہے جس میں بعض وقت دوسری پریشان حال اور غیر منظم جماعتیں بھی مل جاتی ہیں۔ چنانچہ بمبئی میں حال ہی میں ایک ایسا فساد ہوا جس میں ایک طبقہ کی دوکانیں اور سامان لوٹ لیا گیا اور باقی چیزوں میں آگ لگا دی۔ یہ صورتیں ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں اور حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ سرکاری ملازموں کا ہے۔ یہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گرانی کی وجہ سے ایک طرف اس کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ دوسرے نئے نئے ٹیکسوں یا چندوں کا بار بھی اس پر پڑتا ہے۔ پھر یہ نہ تو ہڑتال کر سکتا ہے اور نہ کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ دوسرے غیر آئینی طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ البتہ درخواستوں پر درخواست دیے جاتا ہے اور جب حکومت یقین کر لیتی ہے کہ اس کی حالت قابل رحم ہے تو وہ اس کو گرانی الاؤنس یا بھتّہ کے نام سے کچھ رقم دینے لگتی ہے مگر جس کی مقدار عموماً کم ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرانی کا اثر زراعت پیشہ طبقہ پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنی پیداواروں کی قیمتیں زیادہ ملنے لگتی ہیں مگر ہندوستانی کاشتکار کو گرانی سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا کیونکہ وہ خود فروشندہ نہیں ہے بلکہ اس کے اور اصل خریدار کے بیچ میں بہت سے آدمی مثلاً مہاجن بنئے، دلال آڑھتیے اور تھوک فروش بطور درمیانی آدمیوں کے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نفع کی بڑی تعداد ان لوگوں کی جیب میں چلی جاتی ہے اور کاشتکار کو جو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے وہ عام گرانی کی نذر ہو جاتا ہے۔

گرانی کی وجہ سے حکومتیں اپنے محکموں میں، آجر اپنے کارخانوں میں تخفیف شروع کر دیتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے لوگ اس زمانہ میں گرانی کی وجہ سے اپنے مجوزہ کاموں کو ملتوی کر دیتے ہیں اس طرح ملک میں بیروزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جنگ اور اس کے متعلقہ کاموں میں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح بہت سے تخفیف شدگان اور بیروزگاروں کو کام مل جاتا ہے اور ان لوگوں کو اجرتیں بھی زیادہ ملتی ہیں۔ مگر عام گرانی کی وجہ سے ملک کی مادی خوشحالی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ جنگ کے خاتمہ پر اس عارضی چہل پہل اور رونق کے بڑے بھیانک اثرات

مرتب ہوتے ہیں۔

گرانی میں حکومت بھی متاثر ہوتی ہے جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کو طرح طرح سے مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنگی اغراض کے لئے بڑی بڑی رقمیں قرض لینا پڑتی ہیں اور چونکہ یہ رقمیں غیر پیدا آور ہوتی ہیں اس لئے ان کے اصل اور سود کا بار حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے جن چیزوں کی خریداری کی ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ دینا پڑتی ہے سرکاری ملازموں کو گرانی کا الاؤنس دینا پڑتا ہے۔ پھر ملک سے باہر جانے والی فوجوں کی تنخواہوں میں اضافہ نئی فوجوں کی بھرتی مقتولین کے وارثوں کو انعام، ناقابل کار مجروحین کو وظیفے، سپاہیوں کے لئے عمدہ قسم کی غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام اور سب سے بڑھ کر اسلحہ کی تیاری کا خرچ ایسا ہے جو اچھی سے اچھی حکومت کی کمر توڑ دیتا ہے۔ ایک طرف تو اخراجات بڑھتے ہیں دوسری طرف اندرونی اور بیرونی تجارت میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کڑوڑگیری اور دوسری مدوں کی آمدنی کم ہونے لگتی ہے۔ ان کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے تین طریقے ہیں، تعمیری اور مفاد عامہ کے کاموں میں تخفیف کر دی جاتی ہے نئے نئے محصول لگائے جاتے ہیں اور سب سے اہم قرضہ لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ملک کے باشندوں پر گرانی کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک طرف ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے، دوسری طرف نئے نئے محصولوں کا بار بڑھتا ہے، تیسرے ان کو مختلف فنڈوں میں چندہ یا امداد دینا پڑتی ہے۔ اس طرح ملک کا عام معیار زندگی پست ہو جاتا ہے، بہت سی تعیشات اور تفریحات کم ہو جاتی ہیں اور باوجود ظاہری گرم بازاری اور رونق کے اندر ہی اندر گھن لگتا رہتا ہے جو نہ معلوم ساری مستحکم اور مضبوط عمارت کو کس وقت منہدم کر دے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ جنگ میں فتح بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہو سکتی اور قربانی جس قدر زیادہ اور بڑی ہو گی اسی قدر فتح و نصرت قریب اور آسان ہو گی لہٰذا حکومت سے لے کر ایک معمولی باشندہ تک کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اسی وجہ سے گرانی کے مصائب کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

# استحصال

استحصال کا مفہوم[1] انگریزی لفظ اکسپلائیٹیشن ( Exploitation ) کے لئے استحصال کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ استحصال سے مراد دوسروں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ساہوکار اور کاشتکاروں کو لیجئے۔ ان کے حالات ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ ساہوکار بالعموم پڑھے لکھے ہوشیار، معاملہ فہم اور مالدار ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے کاشتکار بالعموم ان پڑھ اور مفلس وقلاش ہوتے ہیں۔ آئے دن انھیں قرض کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور قرض لئے بغیر چارہ نہیں لہذا ساہوکار ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔ سود در سود کا حساب جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حاصل کردہ اصل کی قلیل مقدار تھوڑی ہی مدت میں بڑھتے بڑھتے سود کی اجتماع کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاشتکار اس کی ادائی سے قاصر رہتے ہیں اور یہیں سے ساہوکار کے ظلم وزیادتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ کاشتکار انتہائی محنت کے ساتھ ہل چلاتے ہیں بوتے۔ پانی دیتے۔ فصل کی نگہبانی کرتے اور جب وہ تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹتے اور غلہ صاف کرتے ہیں غلہ کہ ابھی مکان میں منتقل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ساہوکار یا اس کے گماشتے آپہونچتے ہیں کاشتکار منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور سارا غلہ ساہوکار کے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ساہوکار کو اس کی پرواہ نہیں کہ کاشتکار کے بیوی بچے بھوکوں مریں گے۔ اسے تو بس اپنے اصل اور سود کی ہی فکر ہوتی ہے۔ ساہوکار کے اس طرز عمل کو عمرانی اصطلاح میں استحصال کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کاشتکاروں کے افلاس۔ شدت احتیاج اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود دولتمند بنتا اور انھیں مفلسی کے عمیق غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔

---

[1] استحصال کے متعلق وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر عمرانیات ایڈورڈ السورتھ راس نے زیادہ تحقیق کی ہے استحصال کے مفہوم اور اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے متعلق راس نے اپنی کتاب اصول عمرانیات میں مفصل بحث کی ہے اس مضمون کی تیاری میں مذکورہ کتاب سے مدد لی گئی ہے۔

دیہی معیشت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی قدر خوشحال کسان بھی غریب اور نادار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ جب کبھی کوئی مفلس اور حاجت مند مزدور ان کے ہاں جاتا ہے اور قرض کی درخواست کرتا ہے تو کسان بہت ہی معمولی رقم قرض دے کر ان سے زیادہ مدت تک کام کرنے کا وعدہ لیتے ہیں۔ مزدور چونکہ مجبور ہوتا ہے لہذا جو بھی شرائط پیش کئے جائیں قبول کر لیتا ہے۔ سو روپیہ دے کر تین یا چار سال تک کام کرنے کا وعدہ لینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ غریب مزدور بالعموم شادیوں کے لئے قرض حاصل کرتے ہیں اور نتیجۂ حسب معاہدہ تین یا چار سال تک اقل ترین معاوضہ کے ساتھ ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کسانوں کا مزدوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی استحصال پر مبنی ہے۔

استحصال کا جذبہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک حیوانی جذبہ ہے جو انتہائی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب انسان استحصال پر اتر آتا ہے تو وہ دوسروں کی بھلائی یا برائی اور نفع ونقصان کا یا تو خیال ہی نہیں کرتا یا خیال کر لینے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص جو جماعت یا جو قوم جس قدر زیادہ خود غرض ہوگی اس میں استحصال کا مادہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔ ہمدردی اور ایثار کے جذبات استحصال کے بالکل منافی ہیں۔ یہ جذبات جس قدر زیادہ کارفرما ہوں گے استحصال کی قوت اسی قدر کمتر نظر آئے گی۔

استحصال کوئی نئی چیز نہیں ظلم وزیادتی اور حق تلفی (خواہ وہ معاشی ہو۔ سیاسی ہو یا معاشرتی) کا دوسرا نام استحصال ہے۔ استحصال کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ بنی نوع انسان کی تاریخ۔ تہذیب وتمدن کے ابتدائی دور سے لے کر عہد حاضرہ تک ہر زمانے، ہر دور، ہر خاندان ہر قبیلہ اور ہر قوم میں اس کی بیسیوں مثالیں ملیں گی فرقہ واریت، طبقہ واریت، بین الاقوامی کشمکش، پست تاجرانہ ذہنیت، Commercialization اور پست پیشہ ورانہ ذہنیت Professionalization جذبہ استحصال ہی کا نتیجہ ہیں۔ فرقہ وارانہ منافشات طبقہ واری کشمکش اور بین الاقوامی لڑائیاں محض اس وجہ سے نمودار ہوتی ہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی اور ایک قوم دوسری قوم کی حق تلفی کرنا چاہتی ہے۔ ایک فرقہ، طبقہ یا قوم کی جانب سے حق تلفی کی کوشش اور دوسرے فرقے، طبقے یا قوم کی جانب سے تحفظ اور دفاع کی جدوجہد اور بالآخر ایک

کے غالب آنے اور دوسرے کے مغلوب ہونے سے استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں

استحصال کی قسمیں | اگر ہم استحصال کی ماہیت پر غور کریں تو اس کا دائرہ بہت وسیع نظر آئے گا چنانچہ سہولت تفہیم کی خاطر استحصال کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔

(۱) جنسی استحصال — **Sexual Exploitation**

(۲) معاشی استحصال — **Economic Exploitation**

(۳) مذہبی استحصال — **Religeous Exploitation**

(۴) انانی استحصال — **Egotic Exploitation**

ا۔ جنسی استحصال: جنسی استحصال، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مقصد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ اور لطف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذاتی عیش اور آرام کی خاطر ایک سے زائد بیویاں رکھنا۔ ان کے آرام و آسائش کا خیال نہ کرنا اور صرف لطف اندوزی کو اپنا مقصد قرار دینا جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ مرد کا منشا عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ لونڈیاں رکھنے کا طریقہ بھی جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ لونڈیوں سے نہ صرف محنت شاقہ لی جاتی تھی بلکہ جنسی جذبات کی تکمیل کے لئے انھیں عارضی آلہ کار بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ غلامی کا طریقہ بہت بڑی حد تک مسدود ہو چکا ہے تاہم اب بھی روپے اور پیسہ کا لالچ دے کر مفلس و نادار۔ لیکن شریف عورتوں کی عصمت دری کا طریقہ جاری نظر آتا ہے جو کہ استحصال کے سوا کچھ نہیں۔ قدیم زمانے میں فاتح اقوام کے پیش نظر روپیہ پیسہ کے علاوہ خوبصورت عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں جس کا مقصد مفتوحین کی بے بسی اور بیچارگی

---

لہ راقم نے استحصال کی جو قسمیں بیان کی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان سے استحصال کے دائرہ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کہنے کی بجائے معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی استحصال کہیں تو یہ تقسیم زیادہ منطقی اور اصولی ہوگی اور اس سے استحصال کی اولیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کو معاشرتی استحصال کے تحت رکھا جا سکتا ہے۔ سیاسی استحصال سے ایسا استحصال مراد لیا جانا چاہئے جو سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر کیا جاتا ہے۔ معاشی استحصال کا مقصد معاشی مفاد ہوتا ہے اور معاشرتی استحصال معاشرتی خود غرضی کی بنا پر ہوتا ہے

جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ اکثر مرتبہ خراج میں نہ صرف مال و اسباب بلکہ حسین اور خوبصورت عورتیں بھی طلب کی گئی ہیں۔ بعض ایسے تاریخی واقعات بھی موجود ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے ملک کی حسین ترین عورتوں کو محل میں داخل ہو جانا پڑتا تھا۔ عورتوں کی مرضی کے خلاف انھیں اس طرح محل میں داخل کر دالینا بھی جنسی استحصال ہی کی ایک شکل ہے

۲۔ معاشی استحصال :۔ جس طرح جنسی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ و لطف حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح معاشی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے معاشی استفادہ کرنا ہے۔ دوسروں کو ان کی محنت کے حقیقی معاوضے سے محروم رکھنا اور اس سے خود استفادہ کرنا معاشی استحصال ہے۔ معاشی استحصال کی بہترین مثال سرمایہ داری سے ملتی ہے۔ سرمایہ دار غریبوں کی ناداری اور افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی آمدنی کا مدار غریبوں کی محنت پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار غریب مزدوروں کو ان کی محنت کا حقیقی معاوضہ نہیں دیتے۔ وہ جس قدر محنت کرتے ہیں انھیں اس سے کم معاوضہ ادا کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

معاشی استحصال صرف سرمایہ داروں تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی متعدد مثالیں ملیں گی۔ اکثر خاندانوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک کماتا ہے اور دس کھاتے ہیں دیگر اراکین خاندان محض اسلئے محنت کرنا نہیں چاہتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں۔ لہذا ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ غیر پیدا آور اراکین کمانے والے رکن کا استحصال کر رہے ہیں۔

اکثر اصحاب میں خاطر مدارات کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے لہذا بعض خود غرض دوست احباب ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر وقت ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور ان کی آمدنی کا قابل قدر حصہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے خرچ کروا لیتے ہیں۔

نیچ طبقوں کے بعض سست اور کاہل مرد محض اپنی بیویوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ محنت کرتی ہیں اور یہ اس کا پھل کھاتے ہیں۔ وہ مصیبت اٹھاتی ہیں اور یہ آرام سے رہتے ہیں۔

افراد اور جماعتوں کے علاوہ قومیں بھی ایک دوسرے سے استحصال کرتی ہیں۔ جنگ اور لڑائی میں

بالعموم معاشی اغراض، مفادات کار فرما ہوتے ہیں طاقتور حکومتیں کمزور حکومتوں پر اپنا تسلط قائم کر لیتی ہیں اور ان ملکوں سے استحصال کرتی ہیں انھیں ان سے کوئی سروکار نہیں کہ مفتوح اور زیر اقتدار ممالک کے باشندے غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتی ہیں کہ انھیں کس قدر دولت مل رہی ہے۔ خود غرضی کے تحت ہمدردی اور ایثار کے جذبات پامال ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کریں تو معاشی استحصال کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ استحصال کی دوسری قسموں کے مقابل معاشی استحصال کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ہر طرف اسی کا عمل درآمد وسیع پیمانے پر نظر آتا ہے

۳۔ مذہبی استحصال :۔ مذہبی استحصال سے مراد کسی ایک مذہب کے افراد کا دیگر مذاہب کے افراد کو قوت واقتدار کے ذریعہ اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ مذہب کی اشاعت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک جبر و تشدد کے ذریعہ اور دوسرا بذریعہ تشہیر۔ دوسری صورت میں افراد کو تبدیل مذہب کا اختیار ہوتا ہے لیکن پہلی صورت میں وہ مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں جبر و تشدد کا عنصر شامل ہوگا وہیں استحصال کی صورت نمودار ہوگی۔ فاتح اقوام کا مفتوح اقوام کو اس امر پر مجبور کرنا کہ وہ ان کا مذہب اختیار کریں مذہبی استحصال ہے۔

۴۔ انانی استحصال :۔ اس سے مراد ایسا استحصال ہے جو اپنی انانیت۔ شان و شوکت اور عظمت و سطوت کو ظاہر کرنے کیلئے کیا جائے۔ اکثر دفاتر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماتحتین جب کبھی مثلیں اور کارروائیاں لے کر حاکم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انھیں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے کیونکہ کارروائیوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں اور انھیں بیٹھنے کی اجازت نہ دینا اور اسی کو اپنی بڑائی سمجھنا انانی استحصال ہے۔ اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لیے دوسروں کی تذلیل اور مصیبت کا خیال نہ کرنا انانی استحصال کی نمایاں خصوصیت ہے انانی استحصال کی تشریح کرتے ہوئے راس نے لوئی چہار دہم کے بارے میں لکھا ہے کہ "بادشاہ کے محل میں دریچہ جسے آکس آئی Ox Eye کہتے تھے، تھا۔ بادشاہ جب بیدار ہوتا یا آرام کرنے جاتا تو اس دریچہ سے گذرتا اور اپنے وفادار درباریوں سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اس دریچہ کے پاس جمع ہو کر اس کے خوابگاہ کو جانے یا خوابگاہ سے باہر نکلنے کا مشاہدہ کریں مطلق العنان بادشاہوں کے حالات زندگی سے انانی استحصال کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مشیخت کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور اس کو پورا کرنے کے لئے وہ انانی استحصال

پڑا تڑا آتا ہے

استحصال کے مختلف طریقے ۔ روزمرہ زندگی میں استحصال کے مختلف طریقے نظر آئیں گے ذیل میں ہم چند اہم طریقوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) بچوں کا استحصال والدین کے ذریعہ - موجودہ زمانے میں پیدائش بر پیمانہ کبیر اور مشین کے وسیع استعمال کی وجہ سے عورتوں کے علاوہ بچوں سے کام لینے کے بھی زیادہ مواقع نکل آئے ہیں چنانچہ غریب اور نادار والدین غربت اور ... سے مجبور ہو کر کمسن بچوں کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں ملازم کرواتے ہیں اور اس طرح خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں بعض والدین تو محض چھوٹے بچوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اولاد کی تربیت ان کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں قبل از وقت ذریعہ آمدنی بنانا استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ چونکہ چھوٹے بچے کلیتہً والدین کے قابو میں ہوتے ہیں لہذا وہ ان کی ہدایت کے مطابق محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں غریب اور مفلس گھرانوں میں بچوں کی کثرت کسی قسم کا بار نہیں تصور کی جاتی بلکہ زائد بچوں کی خواہش محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

(۲) عورتوں کا استحصال مردوں کے ذریعہ - روزمرہ زندگی میں ہمیں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ مرد عورتوں کی مجبوریوں کی سے ناجائز استفادہ کرتے ہیں۔ بالخصوص غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب طبقوں اور جماعتوں میں بالعموم عورتوں کے ساتھ بہت زیادتی کی جاتی ہے۔ انھیں طرح طرح سے دکھ دیا جاتا ہے اور ان کے آرام کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں علی العموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت محض مرد کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ چونکہ عورت کی پرورش کا مدار مرد کی کمائی پر ہوتا ہے لہذا مرد اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ نیچ طبقوں کے بعض خودغرض مرد ایک سے زائد بیویاں بھی اس غرض سے رکھتے ہیں کہ وہ آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں انھیں ملازم کرواتے ہیں اور ان کی آمدنی خود حاصل کر لیتے ہیں۔

(۳) غریبوں کا استحصال امیروں کے ذریعہ - امیروں کے پاس دولت ایک ایسا اہم حربہ ہے جس کے

ذریعہ وہ غریبوں پر کامل تسلط جما لیتے ہیں اور ان سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دولت کے ذریعہ انھیں ذلیل وخوار کیا جاتا ہے۔ ان سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ غریب عورتوں کی عصمت دری کیجاتی ہے اور ہر طرح کی معاشی سیاسی اور معاشرتی زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ غریب کمزور اور بے زبان ہوتے ہیں امیروں کا مقابلہ نہیں کرسکتے اور مجبوراً ان کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں

(۴) اقلیت کا استحصال اکثریت کے ذریعہ۔ چونکہ اکثریت کی قوت زیادہ ہوتی ہے لہذا وہ اقلیت پر حاوی رہتی ہے اور اس سے استحصال کرتی ہے۔ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہایت شدید ہے۔ یہاں کی اقلیتیں اکثریت سے بدگمان ہیں۔ ان کا خیال ہے اگر حکومت اکثریت کے ہاتھ میں چلی جائے تو وہ ان کی حق تلفی کرے گی اور ہر طرح کے استحصال کو روا رکھے گی۔ لہذا وہ قبل از وقت اپنے حقوق کی حفاظت چاہتی ہیں۔

(۵) محنت پسندوں کا استحصال غیر محنت پسندوں کے ذریعہ۔ فقیروں کی قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی نظر آتی ہے جو تنو مند، قوی ہیکل اور کام کرنے کے قابل ہوتی ہے لیکن محض اس وجہ سے محنت کرنا پسند نہیں کرتی کہ محنتی اور جفاکش لوگ اپنی کمائی کا ایک جزو اسے بطور خیرات دیدیتے ہیں۔ فقیروں کا یہ طرز عمل استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ مشترک خاندانوں میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر محنت پسند افراد کین محنت پسندوں کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں، کام تو کرسکتے ہیں لیکن کام کرنا اس لئے نہیں پسند کرتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں

(۶) نادانوں کا استحصال ہوشیاروں کے ذریعہ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نادان اور غیر تعلیم یافتہ افراد ہوشیار اور تعلیم یافتہ افراد کے پنجے میں بہ آسانی آسکتے ہیں۔ ہندوستانی کسانوں کو محض اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بیسیوں جگہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دیہات میں پٹیل پٹواری اور ساہوکار، منڈی میں دلال اور دفاتر میں منشی، محرر اور وکیل ان سے استحصال کرتے ہیں۔ کسان انتہائی محنت سے غلہ پیدا کرتے لیکن جہالت اور لاعلمی کی بنا پر حقیقی معاوضے سے محروم رہتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبہ کو لیجیے ہر جگہ ہوشیار اور چالاک افراد نادان اور سیدھے سادے افراد سے استحصال کرتے ہوئے دکھائی دیں گے

(۷) غیر منظم افراد کا استحصال منظم افراد کے ذریعہ: تنظیم قوت اور طاقت کا ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ جو جس قدر زیادہ منظم ہوگا وہ اسی آسانی کے ساتھ غیر منظم افراد پر اقتدار اور تسلط حاصل کر سکے گا۔ تسلط اور اقتدار کے ساتھ ہی استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں۔

(۸) مریدوں کا استحصال مرشدوں کے ذریعہ: ۔مرید اپنے مرشدوں کے بہت معتقد ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھتے اور ان کا کہا ماننا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں لہذا مرشد، پادری اور برہمن اپنے عقیدت مندوں کی اس خصوصیت سے ناجائز طریق پر مالی اور دیگر قسم کا فائدہ حاصل کرتے ہیں جو استحصال ہی کی ایک قسم ہے

(۹) مفتوحین کا استحصال فاتحین کے ذریعہ: ۔جنگ اور لڑائی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ جماعتوں یا اقوام سے استفادہ کیا جائے۔ ہر زمانے میں مختلف اقوام سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کو روا رکھا ہے۔ فاتح اقوام کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوح اقوام پر ظلم و زیادتی کو ظلم و زیادتی ہی نہیں سمجھتیں۔ چونکہ مفتوحین بے بس اور کمزور ہوتے ہیں اس لئے فاتحین کو ہر طرح کی آزادی اور استحصال کا موقع حاصل رہتا ہے۔

(۱۰) محکوموں سے استحصال حاکموں کے ذریعہ: ۔قوت و اقتدار کے ذریعہ ہر جائز چیز بھی روا رکھی جاتی ہے۔ محکوم اپنے حاکم کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس طرح حاکمین کے لئے ظلم و زیادتی، حق تلفی اور استحصال کے کافی مواقع نکل آتے ہیں۔

<u>استحصال کے قوانین</u> طبیعت یا فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے استحصال کی طرف زیادہ یا کم رجحان ہوتا ہے۔ مثلاً (الف) جو افراد طبعاً سست، کاہل اور تن آسان ہوتے ہیں ان میں استحصال کرنے کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف استحصال کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ وہ استحصال کرنے میں نہایت مستقل مزاج ہوتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ (ب) اسی طرح جن افراد میں ہمدردی اور ایثار کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ یا تو استحصال سے قطعی پرہیز کریں گے یا بہت کم اس کی طرف مائل ہوں گے (ج) جو افراد جس قدر زیادہ خود غرض ہونگے وہ استحصال کی طرف اسی قدر زیادہ مائل ہوں گے۔ (د) جن افراد میں ظلم و زیادتی کرنے کی بجائے ظلم و زیادتی سہنے کا مادہ جس قدر زیادہ ہوگا اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے ذریعہ استحصال روا رکھیں گے۔

(۲) شعورِ ہم جنسیت استحصال کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے۔ شعورِ ہم جنسیت سے مراد وہ احساس ہے جس کی بنا پر ہم دوسرے افراد کو اپنا ہم رتبہ اور ہم جنس سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت پایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے مقابلتاً محدود پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت نہیں پایا جاتا وہ ایک دوسرے سے وسیع پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم جنس افراد کے مابین غیر ہم جنس افراد کے مقابل محدود پیمانے پر استحصال ہوتا ہے۔

(۳) استحصال کی بدولت ہم جنس اور ہم شعور جماعتوں اور گروہوں کی جداجدا تشکیل عمل میں آتی ہے جن جماعتوں یا گروہوں کے مفادات ایک ہوتے ہیں وہ آپس میں متفق اور متحد ہو جاتے ہیں تاکہ دوسری جماعتوں یا گروہوں سے استحصال کریں یا انہیں اپنا استحصال کرنے سے روکیں۔ آجروں یا مزدوروں کی انجمنوں کا قیام استحصال یا استحصال سے بچنے کی خاطر عمل میں آتا ہے۔ مزدور جب دیکھتے ہیں کہ آجران سے استحصال کر رہے ہیں تو وہ اپنی انجمن قائم کر لیتے ہیں تاکہ مدافعت کی جا سکے جب آجر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد کی وجہ سے مزدوروں کی قوت بڑھ گئی ہو تو وہ بھی اپنے استحکام کی خاطر علیحدہ علیحدہ انجمن قائم کرتے ہیں تاکہ متفقہ طور پر مزدوروں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

(۴) استحصال اور قوت استحصال لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ جب تک کسی فرد، جماعت یا قوم میں استحصال کی قوت باقی رہتی ہے اس وقت تک استحصال کو برابر روا رکھا جاتا ہے لیکن جب یہ قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ استحصال سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب قوت و اقتدار جاتا رہتا ہے تو انسان ظلم و زیادتی کو چھوڑ کر عجز و انکساری اور محبت و ملنساری کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ استحصال کے لئے استحصال کے موقعوں کا ہونا ضروری ہے۔ جب مواقع حاصل ہوں تو استحصال کنندگان اپنے فعل سے کبھی نہیں چوکتے۔ جن افراد یا جماعتوں کا وہ استحصال کرتے ہیں انکی زبوں حالی، آفت اور مصیبت سے پورے طور پر واقف ہوتے ہیں بظاہر ہمدردی بھی جتلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود استحصال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

(۵) بیرونی تسلط، اندرونی اور مقامی استحصال کے منافی ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی ملک پر دوسری قوم کا قبضہ اور تسلط ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اندرونی اور مقامی استحصال کرنے

والے اداروں کے مواقع مارے جاتے ہیں۔ بیرونی قوت اندرونی اور مقامی استحصال کرنے والی مختلف اکائیوں کو یا تو ختم کر دیتی ہے یا کلیتہً اپنے زیر اقتدار لے لیتی ہے۔

(۶) استحصال کی راہ میں جو افراد یا جماعتیں رکاوٹ ڈالتی ہیں اگر انھیں بھی اپنا شریک کار بنا لیا جائے تو پھر استحصال علیٰ حالہ جاری رہ سکتا ہے۔ فرض کیجئے ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کر رہی ہے۔ اب اگر تیسری قوم مداخلت کرے اور اول الذکر کو استحصال سے روکنے کی کوشش کرے تو اس کا بہترین حل یہی ہوتا ہے کہ مخل ہونے والی قوم کو بھی شریک استحصال بنا لیا جائے۔ خاندانی زندگی سے قومی زندگی تک مختلف اداروں کے مابین اس قانون کا عمل درآمد عام نظر آئے گا۔

(۷) بین استحصال (Open Exploitation) کے مقابل مخفی استحصال Masked Exploitation زیادہ دیرپا اور خطرناک ہوتا ہے مخفی استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جس کے حقیقی مضر اثرات پورے طور پر واضح نہ ہوں۔ یہ استحصال بظاہر شدید نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں مکر و فریب کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ برعکس اس کے بین استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جو علانیہ طور پر کیا جائے اور جس کے اثرات پورے طور پر واضح ہوں۔ مثلاً بچہ سقہ کا چند روزہ راج بین استحصال پر مبنی تھا۔ نادر شاہ کی لوٹ اور غارت گری بھی بین استحصال ہی پر مبنی تھی۔ برعکس اس کے مغربی ریاستوں کا ایشیائی ممالک کا ناجائز استفادہ مخفی استحصال پر مبنی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر محکوم قوموں کی حقیقی صنعتی اور تجارتی ترقی کو روکنا اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی مصنوعات اور دیگر قسم کی پیداواروں کے لئے وہاں پر وسیع بازارات فراہم کرنا یا اپنے ممالک کے باشندوں کو قابل لحاظ تعداد میں غیر ضروری طور پر محض ان کی پرورش کی خاطر محکوم ممالک میں ملازم رکھنا۔ یا محکوم ممالک کے باشندوں کو عام اور فنی و حرفتی تعلیم سے محض اس وجہ سے محروم رکھنا کہ جاہل اور ان پڑھ محکومین سے بہت آسانی کے ساتھ استحصال کیا جا سکتا ہے، مخفی استحصال کی مثالیں ہیں۔ کیونکہ اس تمام جدوجہد کا مقصد محکوم قوم سے مخفی طریق پر استحصال کرنا ہوتا ہے۔ استحصال کے یہ طریقے اس لئے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں کہ ان کے مضر اثرات سے عوام پورے طور پر واقف نہیں ہوتے۔ ان طریقوں سے بین استحصال کے مقابل زیادہ استحصال ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود استحصال

کی شدت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ مخفی استحصال کے لئے انگریزی میں ماسکڈ ایکسپلائیٹیشن کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔

(۸) معاشرتی حالات جوں جوں پیچ در پیچ ہوتے جائیں گے اور جوں جوں ہماری زندگی کا انحصار ایک دوسرے پر بڑھتا جائے گا تو مخفی استحصال کے مواقع زیادہ نکلتے جائیں گے۔ مثلاً ابتداً باہمی جھگڑوں اور مناقشات کے تصفیوں کے لئے پنچایت کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اور اس میں استحصال کے زیادہ مواقع نہ تھے لیکن جب عدالتیں قائم ہوئیں بڑے بڑے عملے کام کرنے لگے منشی محرر، وکیل اور بیرسٹر نمودار ہوئے اور معمولی سے جھگڑے کا فیصلہ مدتوں میں ہونے لگا تو ساتھ ہی ساتھ استحصال کے موقعوں میں بھی بہت زیادتی ہو گئی۔ غرض مندوں کی شدتِ احتیاج سے فائدہ اٹھانے، رشوت لینے اور طرح طرح کے ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے بیسیوں مواقع نکل آے۔ اگر طرز معاشرت سیدھا سادا ہوتا تو یہ سب مواقع دستیاب نہ ہوتے۔ ایک وہ زمانہ گذرا ہے جبکہ لوگ اپنی غذا آپ تیار کر لیتے تھے لیکن تقسیم عمل کی وجہ سے جب ہوٹلوں کا طریقہ مروج ہوا اور ان کی کثرت ہوئی تو پست تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے مالکان ہوٹل کے لئے استحصال کے مواقع نکل آئے۔ خالص گھی کے بجائے چربی استعمال کرنا۔ تازہ گوشت کی بجائے باسی گوشت استعمال کرنا۔ زعفران کی بجائے رنگ دینا۔ باسی اور بدبودار سالنوں کو دوبارہ گرم کر کے مرتج مسالے دینا اور پھر تازہ سالنوں کی طرح فروخت کرنا۔ چائے میں افیون کا خفیف جزو شامل کرنا تاکہ گاہک مخصوص چائے کے عادی ہو جائیں اور صرف انھیں کے چائے خانے میں آئیں تاکہ ان کے لئے زیادہ منافع کمانے کے مواقع مہیا ہو سکیں، یہ سب باتیں اسی لئے ممکن ہوئیں کہ ہماری اجتماعی زندگی زیادہ پیچ در پیچ ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ تقسیم عمل کے طریق کو ہماری معاشرت میں زیادہ سے زیادہ دخل ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ ہماری معاشرت کا ناگزیر عنصر بن گیا ہے موجودہ زمانے میں اس طریق کے وسیع ترین استعمال کی بدولت ہماری معاشرت خاندانی، قبیلہ واری اور قومی مدارج سے گذرتے ہوئے بین الاقوامی رتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کا، ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا یا ایک فرقہ و طبقہ دوسرے فرقے و طبقے کا

محتاج نظر آتا ہے بلکہ ایک قوم دوسری قوم کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح معاشرہ کا ایک رکن دوسرے رکن کی امداد کا محتاج ہوتا ہے تقسیم عمل کی درجہ بدرجہ ترقی کے ساتھ ساتھ استحصال کے دائرے بھی وسیع تر ہوتے گئے حتیٰ کہ شخصی استحصال خاندانی استحصال ہیں۔ خاندانی استحصال قبیلہ واری استحصال میں اور قبیلہ داری استحصال قومی استحصال میں تبدیل ہو چکا ہے۔ موجودہ جنگ محض استحصال کی جنگ ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کرنا چاہتی ہے لیکن دوسری قوم دفاعی تدابیر اختیار کرتی ہے نتیجہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری عام نظر آتی ہے۔ استحصال کے یہ تمام مواقع معاشرتی زندگی کی پیچ در پیچ صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ بالخصوص مخفی استحصال کو موجودہ نظام معاشرت سے بہت تقویت پہونچی ہے۔

(۱۰) استحصال کو کلیتہً مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت تخریبی جذبہ ہے اور اس کی بدولت بحیثیت مجموعی عام خوش حالی متاثر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم قطعی معنی میں اس کی بیخ کنی کرنا چاہیں تو بہ حالات حاضرہ یہ چیز ناممکن ہے۔ کیونکہ جب تک انسان میں ذاتی مفاد، خود غرضی۔ جلب منفعت اور مشیخت کے جذبات موجود ہیں یا جس وقت تک بڑائی اور چھوٹائی۔ امیری اور غریبی۔ قوی اور کمزور۔ زبردست اور زیردست، فاتح اور مفتوح اور حاکم و محکوم کے مدارج اور مراتب موجود ہیں اس وقت تک استحصال بھی باقی رہے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف تدابیر کے ذریعہ ہم استحصال کے حدود کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔

قوتوں کا توازن استحصال کا بہترین سدِ باب ہے۔ اگر ہم استحصال کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی قوتوں کو متوازن کرنے کی کوشش کریں اور یہی استحصال کا موزوں ترین حل ہے۔ یہ سوال کہ مختلف قوتوں میں کیونکر توازن قائم کیا جا سکتا اور اس کے بعد کس طرح استحصال میں کمی ہو سکتی ہے نہایت وسیع ہے لہٰذا ہم استحصال کی ماہیت، اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

محمد ناصر علی ایم۔ اے (عثمانیہ)

# ربط کے نصب العین کا ارتقا

تعلیم اخلاق نشو ونما کے ساتھ ساتھ ایک خالص ساجی عمل بھی ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر نئی تعلیم کا سب سے پہلا پیغمبر بھی وہی شخص ہو جو ایک گمراہ سماج اور بھٹکی ہوئی سیاست کو راستہ دکھانے اور سنوارنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں زمانے کے رخساروں سے کچھ حجاب اٹھاتا ہوں۔ لیجئے میں آپ کو آج سے ایک سو تیئیس سال پہلے کے جنیوا میں لے آیا۔ یہاں ایک گھڑی ساز رہتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام ژان ژاک ردسو ہے۔ دونوں باپ بیٹے رات بھر کتابیں پڑھنے میں گذار دیتے ہیں۔ روسو آوارہ فطرت واقع ہوا ہے۔ اسے جنگل کی تفریح اور پاپیادہ سفر کرنے کا عشق ہے۔ روسو میٹ پانے کے لئے ایک سرکاری وکیل کا محرر بنتا ہے۔ پیرس میں موسیقی کی تحریریں بیچتا ہے۔ وینس کے فرانسیسی سفیر کا سکرٹری بنتا ہے اور پھر ادیب بن جاتا ہے اور ایسا ادیب جس نے ایک پوری قوم اور اس کے ذریعے ایک پورے نظام تمدن و سیاست کا نوشتہ عمل بدل دیا۔ روسو خود چوری کرکے ایک بے قصور لڑکی کو مجرم ثابت کر سکتا ہے وہ اپنا مذہب بدل کر ایک مالدار عورت سے صرف ضرورتاً عشق بھی کر سکتا ہے اور خود اپنے بچوں کو اپنی زندگی میں یتیم خانہ بھیج سکتا ہے لیکن یہی شخص اور یہی روسو ایک وقت سماج اور سیاست کو دعوت انقلاب دینے کے لئے ایک ہاتھ میں "معاہدہ عمرانی" کے نام سے ایک نئی توریت اور دوسرے ہاتھ میں "ایمیل" کے عنوان سے ایک نئی تعلیمی انجیل لئے ہوئے زمانے کے سامنے آتا ہے۔ اس کی توریت کا پہلا جملہ ہے "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے" اور اس کی انجیل کی پہلی آیت کچھ یوں ہے "ہر چیز جو صانع قدرت کے ہاتھ سے آتی ہے اچھی ہوتی ہے لیکن ہر وہ چیز جو انسان کے ہاتھ میں پڑتی ہے خراب ہو جاتی ہے"

اب تک کوئی پیغمبر اپنے ساتھ بیک وقت دو الہامی کتابیں لے کر نہیں آیا تھا۔ کچھ یونہی سمجھ لیجئے کہ لوگ روسو کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کی ایمیل کو آگ میں جھونکا اور اسے خود گرفتاری سے بچنے کیلئے

فرانس سے سوئٹزرلینڈ بھاگنا پڑا۔ لیکن ایمیل سوئٹزرلینڈ میں بھی "معاہدۂ عمرانی" کے ساتھ ساتھ ممنوع قرار دیدی گئی لیکن روح کی پکار نہ قانون دبا سکتا ہے اور نہ اس کا صحیفہ آگ میں جل کر فنا ہو سکتا ہے۔ ایمیل کو نذر آتش کر دیا گیا تھا لیکن ایمیل آج ہمارے پاس ہے۔ بالکل وہی جو روسو نے لکھی تھی۔

ایمیل ایک بچہ ہے روسو نے اسی عنوان سے بچپن سے لے کر بیس سال کی عمر تک اس کی تعلیم و تربیت کا حال ایک کہانی کی شکل میں لکھا ہے۔ فی الحقیقت ایمیل بچوں کا قرآن ہے روسو سے پہلے بچے کو ایک چھوٹا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس پر ہر وہ بات جبر کی جاتی تھی جو بڑوں کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی تھی۔ روسو نے سب سے پہلے بچہ کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کی زندگی، اس کی دلچسپیوں اور اس کے رجحانات پر زور دیا بالفاظ دیگر تعلیم کا خارجی اور مصنوعی عمل روسو کے ہاتھوں زندگی کا فعل اور فطرت کا عمل بنا۔ روسو نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم فطری قوتوں کی ترقی کا نام ہے نہ کہ علم و فن کے حصول کا۔ روسو نے (۱) انسان (۲) اشیا (۳) فطرت ۔ ان تین چیزوں کو تعلیم کا سرچشمہ مانا ہے فطرت سے بیشتر انسانی قویٰ کا اندرونی نشوونما، جبلتیں، صلاحیتیں اور رجحانات مراد ہیں۔ اشیا، حواس کے ذریعہ اس نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور انسان، انسان کو زندگی کے تجربے سکھانے کا آلہ ہے۔

روسو تعلیم میں تصنع کا کس حد تک مخالف ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ بچوں کے ہاتھ میں چاندی سونے کے جھنجھنے دیکھنے کے بجائے وہ کسی پیڑ کی ایسی شاخ دیکھنا چاہتا ہے جس میں گھنگروؤں کے بجائے سوکھے ہوئے بیج بجتے ہوں۔ روسو کے قول کے مطابق پانچ سے بارہ سال تک کی عمر کا زمانہ زندگی کا سب سے نازک زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں حواس کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے۔ "جو کچھ انسان کے ذہن میں داخل ہوتا ہے وہ حواس کے ذریعہ داخل ہوتا ہے عقل و خرد کا پہلا روپ حواس کا روپ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے جن استادوں سے فلسفہ کا سبق ملتا ہے وہ ہمارے پاؤں ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہیں اور ہماری آنکھیں ہیں"۔ اس سے آگے کی منزل میں روسو ایک حرفے کی تعلیم بھی تجویز کرتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ روسو کا عام اصول بذریعہ تجربہ ہے "کوئی بات بچے کو اس لئے نہ جاننے دو کہ تم نے اسے بتائی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس نے اسے خود سمجھا ہے۔ اسے سائنس سیکھنا نہیں ہے۔ اسے

سائنس تحقیق کرنا ہے۔.... میں کتابوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں ایسی چیزوں کے متعلق بات چیت کرنا سکھا دیتی ہیں جن سے فی الحقیقت ہم واقف نہیں ہیں۔"

روسو ذہن و حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسم سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی کمزوری تمام برائیوں کی جڑ ہے "بچہ جتنا کمزور ہوگا اسی قدر دوسروں پر حکومت کا خواہشمند ہوگا اور جتنا مضبوط ہوگا اسی قدر فرمانبردار ہوگا۔ تمام نفسانی خواہشات کمزور جسم کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور تمام خرابیاں کمزوری کے باعث وجود میں آتی ہیں" روسو نے جسمانی تربیت کے لئے ورزشیں تجویز کی ہیں۔ لیکن یہ ورزشیں عموماً وہی ہیں جو کبھی اہل اسپارٹا نے وضع کی تھیں اور جنھیں فلاطون نے بھی اپنی ریاست کے فلسفیوں کے لئے قابل قبول سمجھا تھا۔

ایمیل سے جو مختصر اور ضروری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو جانا چاہیئے کہ روسو، بچوں والوں پر بچوں کو اور الفاظ پر عمل کو قابل ترجیح سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ذہن کے ساتھ ساتھ حواس اور جسم کی تربیت بھی اتنی ہی اہم تھی۔ یہ ضرور ہے کہ روسو نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا جس سے ایک ہی چیز ذہن، حواس اور جسم تینوں کی ہم آہنگ تربیت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ اس نے حرفے کی تعلیم بھی تجویز کی ہے لیکن حرفے سے کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا اس کا مقصد نہیں تھا۔ اس نے ایمیل کو حرفہ اس لئے سکھایا تھا کہ وہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھے۔ لیکن باوجود اس کے اس کی پیغمبرانہ اور مجتہدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس نے فضا میں ایک آواز پیدا کی اور اس کی بدولت ہم نے۔

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے!

ابھی میں نے عرض کیا کہ روسو کا سب سے بڑا کام یہی تھا کہ اس نے فضا میں ایک آواز پیدا کی۔ اب اگر آواز میں خلوص و صداقت ہے تو اس آواز کو نئی قوتیں دے کر اسے پھیلانے والے بھی پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ گو خود روسو کے وطن میں روسو کی آواز نہ سنے جانے کے برابر سنی گئی اور انگلستان میں بھی عقیدتمندوں کی کثرت کے باوجود کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو سکا لیکن جرمنی میں روسو کے نئے تعلیمی اصولوں کو جامہ پہنانے کی کوشش ضرور کی گئی۔ بیسڈو نے (۱۷۲۳ء تا ۱۷۹۰ء) جہاں روسو سے متاثر ہو کر صحیح مذہب اور

صحیح اخلاق کے لیے جہاد کیا وہاں اس نے تعلیمی اصلاح کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ بیڈو نے نہ صرف تعلیمی معاملات میں اختیار رکھنے والے لوگوں اور ماں باپوں کے لیے بچوں کی تعلیم سے متعلق پوری چار جلدیں لکھ ڈالیں، بلکہ اس نے تعلیم بذریعہ عمل کے اصول پر بچوں کو مادری زبان اور لاطینی پڑھا کر تجربہ بھی کیا اور پہلی مرتبہ ثابت کیا کہ اس طریقہ سے بچے کم وقت میں اور بغیر گرانی محسوس کئے ضروری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ بیڈو نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بچوں کا ادب پیدا کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر روسو نے اصول کی بنیاد ڈالی تھی تو بیڈو نے اسی اصول کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ بیڈو کی کوشش کہاں تک کامیاب تھی اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ۱۷۷۴ء میں جرمنی میں ایک مدرسہ فلن تھروپی نم کے نام سے کھلا اور اس کی مثال میں اور بہت سے مدرسے بھی کھلے۔ ان تمام مدرسوں کا نصب العین اصلاحی تھا۔ ان مدرسوں میں بچوں کو بچہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ زبان کی تعلیم قواعد کے ذریعہ سے نہیں بلکہ بول چال کے طور پر دی جاتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ جسمانی تربیت کی اہمیت بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم میں جسمانی فعالی کے ساتھ تال سُر کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ حرفہ بھی تعلیمی اور سماجی اغراض کی بنا پر شریک تعلیم تھا۔ تصویروں اور چیزوں کے ذریعے اسباق پر زور دیا جاتا تھا اور مدرسہ اور مدرسہ کی چار دیواری سے باہر کی زندگی میں ربط اور تطبیق کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک بڑی تصویر کا پہلا خاکہ ہی تھا۔ ابھی رنگ کاری سے پہلے اصل خطوط ہی کو زیادہ نمایاں اور روشن کرنے کی ضرورت تھی یہ کام سوئزرلینڈ کے ایک مصلح پستالوزی (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۷ء) کے ہاتھوں ہونا تھا پستالوزی کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اور اپنی ساری قوتیں تعلیم کے تجربے پر صرف کیں۔ اس نے بننا تو چاہا تھا پادری، وکیل، کسان اور نہ جانے کیا کیا لیکن قدرت کو اسے مدرس بنانا مقصود تھا۔ اس نے خود اپنے بچہ کا مطالعہ کیا اور اس پر تعلیمی تجربے کئے۔ اس کے بعد غریبوں اور مفلسوں کے بچوں کے لئے ایک صنعتی مدرسہ چلایا۔ اس مدرسہ میں زراعت اور کاتنے بننے کی قسم کے کام سکھائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رہتا تھا لیکن اس مدرسے میں دستکاری ذریعہ تعلیم نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو ہمارا مقصد پستالوزی کے ہاتھوں ہی پورا ہو جاتا۔ اس کمی کو چھوڑ کر پستالوزی ہمارے سئے

نصب العین سے سب سے زیادہ قریب لے آتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس نے تعلیم کو سماج کی اصلاح کا آلہ سمجھا ہو اور مدرسہ کو بچے کے لئے دوسرا گھر بنانے کی کوشش کی ہو بلکہ اس نے مشاہدہ کو تدریس کی بنیاد بنا دیا اور اشیا کے ذریعہ تعلیم عام کردی اس طرح اس نے ذہن اور حواس کی ہم آہنگ تربیت کا پورا پورا التزام کر دیا۔

حواس اور ذہن کی نشو ونما میں جسم برابر کا حصہ دار فروبل (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کے ہاتھوں بنا فروبل نے سب سے پہلے ذہن اور حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی زندگی عضلاتی یا جسمانی فعالی کو بھی جگہ دی اور اسی چیز کو حواس کی نشو ونما اور ذہنی تعلیم دونوں کا ذریعہ بنایا۔ فروبل نے نجی طور پر بچوں کو پڑھانا تو ۲۳ سال کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا اور اس ابتدائی تجربے کی کامیابی سے متاثر ہو کر اس نے ۴۴ سال کی عمر سے باقاعدہ تعلیمی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک کسان کی جھونپڑی میں پانچ بچوں کے سہارے سے ایک مدرسہ کھولا۔ اس مدرسے کا نام سنیں گے آپ؟ ۔ بہت شاندار نام ہے۔ "یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن"۔ کسان کی اس جھونپڑی ۔ نہیں میں نے غلط کہا اسی "یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن" میں فروبل نے اس طریقہ تعلیم کی بنیاد ڈالی جو "بالک گھر" کے نام سے مشہور ہے۔ فروبل کے نزدیک تعلیم کا پورا عمل بچوں کی ذہنی نشو ونما اور ان کی شخصیت کے آزادانہ اظہار کا عمل ہے۔ وہ ہر بچہ کو ایک دیوتا کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق "اپنی دنیا بنائے اور دیکھے کہ وہ ٹھیک ہے" وہ ہر بچہ کو صحیح معنی میں ایک خالق کا درجہ دینا چاہتا ہے اور اس کی قسمت کو اسی کے افعال واعمال سے معنون کرنا چاہتا ہے۔ اس مدعا کو ذہن میں لئے ہوئے فروبل نے اُن کی رنگین گیندوں، لکڑی کے استوانوں، مکعبوں گولوں اور دوسری شکلوں کے ٹکڑوں سے بچوں کے لئے کچھ مشغلے تجویز کئے ہیں۔ یہ مشغلے تبدریج آسان سے مشکل ہوتے جاتے ہیں اور بچے اپنی خود فعالی ہی میں اپنے ذہن کے نشو ونما کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں اور انھیں وہ ذریعے مل بھی جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کا اصول جمود نہیں حرکت ہے۔ بچہ کو اگر آپ کچھ سکھانا چاہتے ہیں تو اسے خوش رکھنا ضروری ہے اور خوش رکھنا کیا معنی رکھتا ہے یہ مسٹر جے اے جیکین کے الفاظ میں سمجھئے۔ ان کے الفاظ اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں ترجمہ کر کے آپ کو ان کے صحیح لطف سے محروم

کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پہلے خود پوچھتے ہیں :-

What is happiness for the child ?

اور پھر خود جواب دیتے ہیں :-

It is the free functioning of all faculties. It is action. It is expression. It is finding one's self. It is coming into one's own. It is the flight of the arrow winging its way to the mark.

فرول کے بچے کو وہ خوشی پوری طرح حاصل ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ وہ کسی وقت لکڑی کے یہ آٹھ ٹکڑے لے کر بیٹھتا ہے اور ایک معصوم فرشتہ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے کہ ان سے کچھ بن بھی سکتا ہے یا نہیں۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں کو مختلف صورتوں میں لگا کر رکھتا ہے۔ اس نے آٹھوں ٹکڑے پہلے ایک قطار میں لگائے۔
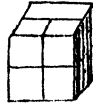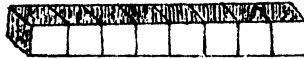
لیکن یہ چیز کچھ اسے جچی نہیں۔ اس نے پھر ترتیب بدلی۔ اس نے چار چار ٹکڑوں کی دو قطاریں بنائیں۔
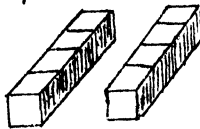
یہ کچھ بہتر صورت معلوم ہوئی۔ اس نے اور سوچا۔ اس مرتبہ اس نے تین تین ٹکڑوں کی دو قطاریں بنا کر باقی کے دو ٹکڑے ان کے بیچ میں رکھدئے
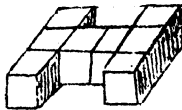
ذہن ہنوز مصروف ہے۔ نگاہیں ہنوز نئے خاکے کی متلاشی ہیں اور ہاتھ ہنوز مضطرب ہیں۔ اس نے اس دفعہ تین ٹکڑے ایک قطار میں رکھے اور چار اس کے نیچے لگا دئے۔
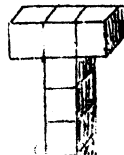
لیکن اس مرتبہ ایک ٹکڑا بچ رہا یہ اس کا کیا کرے؟ قوت تخلیق نے پھر ایک نئی شکل اختیار کی۔
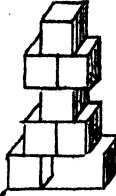
یہ شکل نئی تو ہے اور اس کے بنانے والے کو پسند بھی آئی لیکن یہ چیز آخر ہوئی کیا؟ اس الجھن سے وہ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے فوراً لکڑی کے یہ ٹکڑے لئے
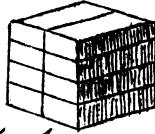
اور ذہن کو واقعاً دو ایک پیچ ذرا زور کے دے ڈالے۔ ایک خاکہ بنایا بگاڑ دیا، دوسرا بنایا اور بگاڑ دیا۔ بالآخر ایک اور نئی چیز بن ہی گئی۔ اور یہیں اس کی جنت مکمل ہو گئی —— یہ ایک بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت ہے۔ اب یا تو وہ اس بادشاہ کی کہانی اپنے ذہن سے نکالے گا، یا کسی سے سنے گا وہ خود بادشاہ بنے گا، خود تلوار ہاتھ میں لیکر جنگ کرے گا۔ خود شکست کا خوف اور فتح کا غرور محسوس کرے گا۔ امیری اور غریبی، ظلم اور انصاف، بھلائی اور برائی کے سارے خاکے اسے اسی تصویر میں نظر آئیں گے۔ پھر کسی فرصت میں وہ کاغذ سے اس بادشاہ کے کپڑے بنائے گا اور مٹی سے اس کے کھانے پینے کے برتن بنائے گا۔ الغرض جب تک وہ اس بادشاہ کی زندگی اپنی زندگی نہیں بنالے گا اس وقت اسے چین نہیں آسکتا۔
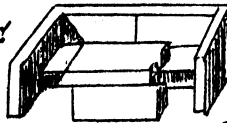
بعض لوگ کہیں گے کہ واہ صاحب! بس بچوں کو انھیں چونچلوں میں بہلائے رکھئیے! اور پڑھنا لکھنا خاک بھی نہیں لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ کیا اس کے آٹھ لکڑی کے ٹکڑوں کا حساب چار اور چار آٹھ، تین اور تین چھ اور دو آٹھ اس کے لئے حساب کا پہلا سبق نہیں ہے؟ وہ بادشاہ کی کہانی سن کر اسے اپنے دوستوں کو سنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ کہانی اس کے لئے زبان کا پہلا سبق نہیں ہو سکتی؟ وہ مٹی کے برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اور کیا ہے اگر سائنس کی بنیاد نہیں ہے — ہاں یہ ضرور ہے کہ بچہ یہاں اپنی اپج کا بادشاہ ہے وہ آپ کے احکام کا غلام نہیں۔ وہ ابھی سے اپنا ذہن اور اپنے ہاتھ پاؤں کا استعمال کرنا سیکھتا

ہے اور جب وقت وہ مصروف ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا وجدان — جسم، حواس اور ذہن سب ہی مصروف ہوتے ہیں اور "مکمل انسان" اسی طرح پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح پیدا کیا جاتا ہے۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے کہ یہاں بچے کے مشاغل اور مصروفیتیں صرف اشارتی (Symbolic) حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ اُون کی گیندوں ریشم کے فیتوں اور پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے اپنی دنیا بنا سکتا ہے وہ اینٹ پتھر اور بغیر صاف کی ہوئی لکڑی سے بھی کوئی عالم پیدا کر سکے گا۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ ایک صاف ستھرے کمرے میں اُجلے کپڑے پہنے لکڑی کے رنگین مثلثوں کو ترتیب دے کر کوئی ڈیزائن بنا سکتا ہے وہ دنیا میں — گرد و غبار اور تھپیڑوں کی دنیا میں بھی — اپنا اور دوسروں کا مقام پہچان سکے گا یہ خوابوں کی دنیا ہے، یہ تصورات کا عالم ہے اور اس لئے کیوں نہ ہم بچوں کے مشغلوں اور ان کی مصروفیتوں کو دنیا، سماج اور زندگی سے براہ راست وابستہ کر دیں۔ بچے کٹے کٹائے پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے ایک ذہنی مکان کیوں بنائیں۔ وہ سچ مچ اینٹ، مٹی اور لکڑی سے چھوٹا ہی سا سہی لیکن اصل مکان کیوں نہ بنائیں۔ زندگی میں بے شمار خدا کے بندوں کو اینٹیں اٹھانی پڑتی ہیں اس لئے ہمارے بچے بھی اینٹیں اٹھانے میں کیوں تکلف محسوس کریں۔ دنیا میں لاتعداد انسانوں کو مٹی میں ہاتھ پاؤں ڈالنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کیا ہوا اگر ہمارے بچوں کے ہاتھ پاؤں بھی گارے میں بھر جائیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ لکڑی کاٹ کر اسے صاف کرتے ہیں اس لئے کوئی حرج نہیں اگر ہمارے بچے بھی یہ کام کریں۔ انہیں مدرسے سے نکل کر بہرحال دنیا میں جانا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس بزم کبر و ناز میں کس کو کہاں جگہ ملے گی۔ اس لئے بچوں کے کردار کی ایسی داغ بیل کیوں نہ ڈالیں جو انہیں ہر مرکز پر کامیاب انسان بنا سکے۔

"بالک گھر" پر کچھ یہی تنقید ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ماہر تعلیم جان ڈیوی کی بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو شکر چڑھی ہوئی کونین کی گولی کھلانے سے بہتر یہ ہے کہ اسے کونین کی سادہ گولی دیجائے تاکہ کھانے والے کو معلوم تو ہو کہ کونین کا ذائقہ بالآخر ہوتا کیا ہے۔ اسی لئے تعلیم کے سلسلے میں ڈیوی ان شغلوں کو ترجیح دیتے ہیں جو تمدنی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ تمدن کی بنیادیں اس وقت سے پڑی ہیں جس وقت سے انسان نے آگ جلانا، گھر بنانا، کاشت کرنا، کپڑا بننا وغیرہ شروع کیا

ہے۔ اس لئے مدرسہ میں اسی قسم کے مشغلوں کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ اس طرح ہر اُس بچے کے لئے جو اس راہ پر کام کرے گا۔ جگ بیتی آپ بیتی بن جائے گی۔ پھر تاریخ بتاتی ہے کہ علم ان نتائج ہی کی منظم صورت ہے جو انسان کو عمل کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں زراعت کو ایک مرتب و مدون علم کی صورت اختیار کئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہے لیکن بہ حیثیت ایک اہم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے۔ اس لئے ہمارے طلبہ بھی وہی راستہ کیوں نہ اختیار کریں جس پر نسل انسانی چل چکی ہے۔

اس اصول کے ماتحت جو طریقہ تعلیم وضع کیا گیا ہے وہ منصوبے کا طریقہ تعلیم ہے۔ بچے اپنی پسند سے کوئی منصوبہ منتخب کر لیتے ہیں۔ وہ مدرسہ میں میلاد کرنا چاہیں یا دوکان کھولنا چاہیں یا میلہ کرنا چاہیں۔ انھیں اپنی راہ میں لکھنے پڑھنے، حساب لگانے تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی جہاں جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے وہ بڑے شوق سے اپنے کام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور کسی ضرورت کا سامنے آنا اور شوق کے ساتھ اس کا حل سوچنا ہی ذہنی تربیت اور باقی رہنے والی تعلیم کی بنیاد ہے۔ علم فی الحقیقت بچوں کے لئے کبھی شعوری مقصد نہیں بن سکتا ہے۔ ان کے لئے علم کو انھیں کے مرغوب مشغلوں کا نتیجہ ہونا چاہیے۔

لیکن منصوبے کے طریقہ میں تین باتیں ذرا کھٹکنے والی ہیں۔ اول یہ کہ سال بھر ایک منصوبہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے ایک دشواری تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ نصاب بعض وقت صفائی کے ساتھ منصوبی مشاغل سے مربوط نہیں ہو پاتا۔ یہ دشواری ہندوستانی مدرسوں کے لئے خاص دشواری ہے کیونکہ یہاں منصوبہ نصاب کے لئے ہے نصاب منصوبے کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک منصوبے کے بعد دوسرا منصوبہ اور دوسرے منصوبے کے بعد تیسرا منصوبہ منتخب کرنا ممکن ہے بچوں کی توجہ کے انتشار کا باعث ہو اور اس دوسری مشکل سے ایک اور تیسری خامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ بچہ متعدد قسم کے کام کرتے رہنے کے باوجود کسی ایک کام میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔

منصوبے میں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی ماہرین تعلیم نے منصوبے کی حدود کو اتنا وسیع کیا کہ ایک طرف تو وہ پورے سات سال کا منصوبہ بن جائے اور دوسری طرف اس کے ذریعہ دیا ہوا

نصاب بھی زیادہ سے زیادہ پڑھایا جا سکے اور سب سے زیادہ یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے تک کسی ایک ایسی دستکاری میں اتنی مہارت حاصل کرے جو اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو ذریعہ معاش بھی بن سکے اور یہ بات حاصل کی گئی ہے مختلف مشغلوں کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے حرفے کو تعلیم کا ذریعہ یا مرکز بنا کر لیکن دیکھنا ہے کہ کیا کوئی ایک حرفہ مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بن سکتا ہے اور کیا ہمیں خود کسی ایک حرفے کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہیئے۔

حرفوں کی اضافی اہمیت اور ان سے ربط کا مسئلہ | حرفوں کو سب سے پہلے نصاب میں داخل کرنے کا سہرا فن لینڈ کے سر ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی سوئڈن، جرمنی، امریکہ وغیرہ ممالک نے بھی حرفے کی تعلیم کو بچوں کے مدرسوں اور استادوں کے مدرسوں دونوں میں شامل کیا لیکن حرفے سے بچوں کے جبلی رجحانات کی تسکین کے علاوہ اسے اقتصادی اور خالص تعلیمی غرض سے اختیار کرنا بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم بنانے والوں کا امتیاز ہے۔ بنیادی قومی تعلیم نے یوں تو ہر اس حرفے کی اجازت دی ہے جو تعلیمی صلاحیت رکھتا ہو اور زندگی کے زیادہ سے زیادہ دائروں کو چھو کر گذرتا ہو لیکن تین حرفے بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے خود بھی تجویز کئے ہیں۔ وہ تین حرفے ہیں۔ باغبانی و زراعت، کاتنے بننے کا کام اور لکڑی گتے کا کام۔ ان حرفوں کو تجویز کرتے وقت یقیناً اس کمیٹی کے سامنے کل ہندوستان کا ماحول اور سماجی نظام تھا۔ باغبانی پہلی پانچ جماعتوں کے لئے لازمی حرفے کے طور پر نصاب میں داخل ہے اور اسے عام سائنس کے نصاب میں بھی پوری پوری جگہ دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی برما کو چھوڑ کر چونتیس کروڑ کی آبادی کا ۹۳ فیصدی دیہات میں رہتا ہے اور اس حصہ کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ ہندوستان کی کل قابل کاشت زمین ۲۲۷،۸۶۹،۹۷۲ ایکڑ ہے یعنی ایک فرد کے لئے ایک ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان کو بھوکوں مرنے سے بچنا ہے تو اسے اپنی زمین کو زیادہ سے زیادہ احتیاط اور بہتر سے بہتر طریقوں پر جوتنے بونے کی کس قدر ضرورت ہے۔

کاتنے بننے کی اہمیت ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ہے کہ ہم اندازاً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کپڑے کی خرید کے سلسلے میں باہر بھیجتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا یہ فعل ہے اور دوسری طرف یہ بھیانک

حقیقت ہے کہ ہماری آمدنی کا اوسط پینتالیس روپیہ سالانہ یعنی ایک آنہ گیارہ پائی یومیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کل ہندوستانیوں کی آمدنی ہم سب پر یکساں بانٹ دی جائے تو مشکل سے چنے اور صرف چنے کھانے کو مل سکتے ہیں۔ انھیں بھی جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور موٹروں میں چڑھتے ہیں اور انھیں بھی جو جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور پاپیادہ چلتے ہیں۔ وہ تو یوں کہیے کہ دولت کی تقسیم کے غلط ہنگاموں میں نہ ہمیں مفلسی نظر آتی ہے نہ اس کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ یہ قومی افلاس کسی حد تک دور ہو سکتا ہے اگر ہم کم از کم وہ ساٹھ کروڑ روپیہ ہی اپنے اس مزدور اور اپنے اس غریب کے لئے روک لیں جو کام کرنا چاہتا ہے اور جسے کام نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا وہ کسان بھی جس کا خون ہمارے تمدن کے خاکے میں رنگ و نور پیدا کرتا ہے ــــ وہ کسان بھی فاقوں سے بچنے کے لئے تکلی کا سہارا لے سکتا ہے۔ اس لئے کاتنے بُننے کا کام ہماری دیہی زندگی کو بھی زیادہ خوشگوار بنا سکتا ہے اور فی الحقیقت اسی میں ہماری نجات ہے۔

ٹیگور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دیہات عورتوں کی مانند ہیں جن کی بدولت قوم کی گود آباد رہتی ہے"

باغبانی و زراعت اور کتائی بنائی کے حرفوں کی قومی ضرورت مسلم لیکن لکڑی گتے کے کام کی کوئی اتنی وسیع اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہاں ان لوگوں کے بچے جنھیں باغبانی اور زراعت سے کوئی واسطہ نہ پڑ سکے اور جنھیں کاتنے بُننے کے کام میں کوئی سیاسی یا اعتقادی تکلف محسوس ہوتا ہو وہ ضرور اس حرفے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اقتصادی اور قومی حیثیت سے نہ سہی لیکن اس حرفے میں کاتنے بُننے کے کام کے مقابلہ میں ایک بڑی برکت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے تنوع پسند طبیعتوں کے لئے اس حرفے میں تسکین کا بہت سامان موجود ہے۔ کاتنے بُننے کے کام کی یکرنگی شاید بعض وقت تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اور ممکن ہے، بچوں کو روز وہی تکلی۔ وہ ہی روئی۔ وہ ہی دھاگا، وہ ہی انداز نشست وہ ہی ہاتھ کا ایک مخصوص سمت میں نپی ہوئی اونچائی تک اٹھنا اور تکلی کی گھوں گھوں کی آواز گراں اور بہت گراں گزرے ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ بچے اس کام کا مقصد سمجھ لیں گے اور اس لئے اگر کبھی تلخی محسوس ہوئی بھی تو وہ اسے دوا کے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیں گے لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ بچہ جب تک کم از کم نو سال کا نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے کسی مقصد کے سمجھنے یا کسی مقصد کو حاصل کرنے کے شوق کی امید

نہیں کی جاسکتی۔ یہ اندیشہ گاؤں کے بچوں کی زندگی میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ گاؤں میں بچے سادہ زندگی اور تنوع سے ایک حد تک بے نیاز ماحول کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے عملی کام کی یکرنگی کو بھی اسی طرح برداشت کرلیتے ہیں جس طرح کوئی شخص گردش روز و شب کا عادی ہوجائے۔ شہر کے بچے البتہ تنوع کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں۔ ان کے ماحول میں نئے نئے خاکے ذرا جلدی جلدی بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس حرفے کو بھی پسند نہ کریں جو انہیں بس ایک ڈگر پر لے جائے۔ ہر روز ہر مہینے اور ہر سال۔ اسی لئے کاتنے بننے کے حرفے میں بچوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا بھی زیادہ موقع نہیں مل سکتا ہے۔ باغبانی کرنے والا بچہ ہر مرتبہ نئی قسم کی کیاریاں بناتا ہے۔ لکڑی، گتے کا کام کرنے والا ہر مرتبہ نئی چیز پیدا کرتا ہے اور نئے ڈھنگ سے لیکن کاتنے میں سوائے اس کے کہ کوئی بچہ اپنے سوت کا نمبر گھٹا بڑھا لے اور تو کچھ نہیں کرسکتا بدقسمتی سے سوت کا نمبر گھٹانا بڑھانا بھی اکثر بچوں کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے تنوع اور اظہار شخصیت کے موقعوں کے اعتبار سے کاتنے بننے کا حرفہ ذرا گھٹیا درجے کا حرفہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بننے کے کام میں خود فعالی، اظہار شخصیت اور اعلیٰ تخئیلی قوتوں کے استعمال اور نشو و نما کا بدرجہ اتم موقع موجود ہے لیکن بننے کے کام کے لئے ایک بچے کو صرف دو سال اور وہ بھی مدرسے کی زندگی کے آخری دو سال ملتے ہیں۔ ایک اور بات جو باغبانی اور گتے لکڑی کے کام کی حمایت میں اور کاتنے کے خلاف کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر حرفوں کے مقابلے میں آخر الذکر حرفہ حواس کی تربیت اور جسمانی اعضا کی نشو و نما کے اتنے زیادہ امکانات نہیں رکھتا۔ باغبانی میں حواس کی تربیت کے لئے نہ صرف ہر وقت رنگ و نور اور نغمہ و ترنم کی ایک جنت موجود ہے بلکہ اس میں عضلاتی اور جسمانی فعالی کا ہر مناسب و متوازن موقع ہے۔ کیاری کے کنارے بیٹھے بیٹھے سوکھی پتیاں چننے سے لے کر پھاوڑے سے زمین کو کھودنے کا سخت کام تک کیا جاسکتا ہے۔ گتے لکڑی کے کام میں بھی یہ تمام برکتیں موجود ہیں لیکن وہ اس جمالیاتی لطافت سے محروم ہیں جو باغبانی کو ہر اعتبار اور ہر پہلو سے ممتاز بناتی ہے۔ ہاں تکلی ذہن کو گیان دھیان کا عادی بناسکتی ہے۔ جہاں خیال چوکا اور دھاگا ٹوٹا اور کائنات ہاتھوں سے گئی! میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالمجید صاحب (مصنف قیصالوزی) سے پونہ میں پوچھا "آپ کا تکلی کے متعلق کیا خیال ہے؟" فرمانے لگے: "بڑے مزے

کی چیز ہے۔ دماغ کو کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو لیکن جہاں تکلی نے دو ایک چکر کھائے اور معلوم ہوا کہ کائنات نظر کے سامنے گھوم رہی ہے۔ لیکن یہ ایک بالغ ذہن ہی کی صلاحیت ہو سکتی ہے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ تکلی کائنات اور دھاگا نور ازل کی ایک کرن بن سکتا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں مستقبل کے ہندوستان کے لئے ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے جلووں کا انتظار کیا کریں یا ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو کارگہ حیات میں پھاوڑے سنبھالے اپنے حصے کی ایک ایکڑ زمین جوتنے بونے پر مستعد نظر آتے ہوں؟

یہی نہیں بلکہ جہاں تک خالص تعلیم کا معاملہ ہے۔ یعنی حرفے کے ذریعہ نصاب کے مضامین پڑھانا وہاں بھی کاتنا بننا باغبانی کے معیار کو نہیں پہونچتا۔ لکڑی گتے کے کام میں بھی ربط کے امکانات محدود ہیں اس حرفے کے ذریعہ حساب بآسانی پڑھایا جا سکتا ہے لیکن اس سے اونچی جماعتوں میں حساب کے ربط کے زیادہ موقعے نکلتے ہیں۔ حالانکہ گتے کے کام سے ہمیں پہلی دو جماعتوں کا نصاب پڑھانا ہے۔ براہ راست گتے سے حساب میں، وزن پیمانے، سکے، رقبہ، جیومیٹری کی شکلیں وغیرہ۔ سماجی علم اور عام سائنس میں آمد و رفت کے ذرائع چینیوں کا تمدن رنگوں کی بناوٹ، پانی، زہر وغیرہ قسم کے موضوع پڑھانے کا اچھا موقع ہے لیکن کاتنے بننے کے کام میں ابتدائی جماعتوں کے حساب پڑھانے کا زیادہ بہتر موقع ملتا ہے مگر آگے چل کر کھینچ تان کو زیادہ دخل دینا پڑے گا۔ عام سائنس بآسانی پڑھائی جا سکتی ہے اگر کپاس بونے کا کام بھی شامل ہو لیکن شہر کے مدرسوں میں یہ انتظام ناممکن ہوگا۔ سماجی علم کا ربط کاتنے بننے کے اصلی کام سے زیادہ کپڑے کی تجارت کی ترقی اور اس کی تاریخ سے ہوگا اور یہی اس حرفے کا سب سے بڑا عیب ہے۔ باغبانی بے شک ان کوتاہیوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہے۔ اس کی افضلیت اس میں ہے کہ عمل اور حد درجے متنوع قسم کے عمل کا موقع ہے۔ چنانچہ یہاں بیشتر مضمونوں کا ربط باغبانی کی تاریخ سے نہیں بلکہ باغبانی کے کام سے ہوتا ہے اور یہی ربط کی بہترین صورت ہے۔ باغبانی نباتاتی دنیا حیوانی دنیا، تمدنی دنیا اور قدرتی مظاہرات — سب پر بیک وقت ہمارے لئے دروازے کھول دیتی ہے لیکن باغبانی کے حق میں یہ سب کچھ کہہ دینے کے باوجود پاسکی اور حرفے کے حق میں اس سے بھی

زیادہ کہہ سکنے کے باوجود ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک حرفہ ربط کے تمام مقاصد پورے کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر حسین کمیٹی نے خود ربط کے ۰ وار مرکز ۔۔۔ یعنی بچے کا سماجی ماحول اور طبعی ماحول بھی تجویز کئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حرفے کے ساتھ ساتھ ان دو مرکزوں کے اضافے سے ربط کی گنجائشیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔ اور سمجھ بوجھ رکھنے والے استاد کو ربط کا صحیح موقع نکالنے میں کبھی اور کہیں ناکامی نہیں ہو سکتی۔ بالآخر ہم نصاب میں بچوں کو پڑھاتے بھی کیا ہیں؛ یقیناً وہی چیزیں جو سماج اور قدرت ہمارے چاروں طرف پھیلائے ہوئے ہے اور اس لئے نصاب کا کوئی موضوع ان دو مرکزوں سے الگ کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتا لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں عمل کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں بعض استاد یہ بات بھول جاتے ہیں اور وہ نہ صرف نصاب کے تمام مضمونوں کو ایک اور صرف ایک حرفے سے مربوط کرکے پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم بنیادی قومی تعلیم کا تمام نصاب کاتنے دھننے کے کام سے یا لکڑی گتے کے کام سے مربوط کرکے پڑھا سکتے ہیں۔ میں ایک کے متعلق نہیں متعدد مدرسوں کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش پہ نازاں ہیں۔ یہ کوشش تو بری نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش سے کوئی اچھا تعلیمی نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ کو بھی جواب نفی میں دینا ہوگا۔ جہاں تک حساب کا تعلق ہے یہ چیز تو بلا تکلف ہر تعلیمی اور غیر تعلیمی شغل سے مربوط ہو سکتی ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں زبان کے سبق بھی چاہے جس حرفے اور چاہے جس شغل سے مربوط ہو سکتے ہیں لیکن عام سائنس اور سماجی عمل کے مضمونوں کے لئے ربط کا ایک اور صرف ایک مرکز ڈھونڈنا بہت ناروا کوشش ہے۔ ٹریننگ کے دوران میں ہماری جماعت ایک مدرسے میں نمونے کے کچھ سبق دیکھنے گئی۔ یہاں ایک سبق دیکھا۔ استاد کو زبان کے سبق میں ایک چینی بچے کی کہانی پڑھانی تھی استاد نے بچوں سے سوال کیا سب سے پہلے کس ملک میں کاغذ بنا؟ "چین میں" بچوں کا جواب تھا۔ اس کے بعد استاد نے اہل چین کے رہن سہن کے طریقوں پر، ان کے لباس پر، ان کے تفریحی مشاغل، ان کے قانون فوجداری، ان کے مذہب پر اور ان کے زبان و ادب پر گفتگو کرنے کے بعد وہ سبق شروع کیا سبق زبان کا تھا۔ زبان کے سبق کا مقصد و مدعا معلوم۔ لیکن یہ استاد زبان کے سبق کے مقصد کو کس حد تک حاصل کر سکے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے

کہ انھوں نے ۴۵ منٹ ربط کے شوق میں تمہیدی گفتگو پر صرف کیے اور صرف ۱۵ منٹ اس سبق پر۔ ایسا ہوا کیوں اس کی وجہ صاف ہے استاد کو مدرسہ کے نگراں کی جانب سے اس سبق کو کتے کے کام سے مربوط کر کے پڑھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہدایت بے۔ آپ کو تعجب ہوگا یہ سبق خود اپنی جگہ سماجی ماحول سے مربوط تھا۔ اس سبق کے ابتدائی حصے میں ذکر تھا کہ کس طرح ان بچوں ہی کے شہر میں ایک چینی ڈاکٹر ہیں اور اُن کا ایک بچہ ہے وغیرہ وغیرہ اگر اصل سبق میں یہ تمہید موجود نہ ہوتی تو بھی اس سبق کا ربط سماجی ماحول سے ہو سکتا تھا گلیوں میں چھری چاقوؤں پر چینی دھار رکھنے والوں کا منظر چینی بچوں کا تماشہ کرتے ہوئے کبھی کبھی نظر آنا چینیوں کا بڑی سی گٹھری میں ریشم لادے لادے پیچھے پھرنا ایسی باتیں نہیں جنھیں شہر کے بچوں اور بالخصوص اس شہر کے بچوں نے جہاں یہ سبق پڑھایا جا رہا تھا نہ دیکھا ہو۔ ایک اور مدرسے میں استاد کو دیکھا کہ اس نے بچوں کو روئی دکھا کر پوچھا "روئی کا رنگ کیسا ہے؟" سوال کی صحت اور عدم صحت کو چھوڑیے دیکھنا یہ ہے کہ جب بچوں نے جواب دیا "سفید" تو پھر استاد نے پوچھا "برف کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟" بچوں کا جواب پھر وہی تھا۔ یعنی "سفید" اب کیا تھا استاد جس نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے وہ انھیں مل گئی "بس تو آج ہم تمہیں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا حال پڑھائیں گے"۔ اور بچوں نے کتاب سے وہ سبق پڑھنا شروع کر دیا

جہاں تک میری معلومات اور ذاتی تجربے کا دخل ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط فہمی لوگوں میں اور عام قسم کے استادوں میں تین مرکزوں سے پھیلتی ہے۔ وہ مرکز ہیں ٹریننگ اسکول، مہاتما گاندھی کی ذات، اور ربط کی وہ مثال جو ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہے۔ ٹریننگ اسکولوں میں حرفوں سے ربط کے متعلق طالب علموں کو کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کیونکہ جو استاد انھیں ربط پڑھاتا ہے وہ حرفے کا عمل نہیں جانتا اور جو استاد حرفہ سکھاتا ہے، وہ نہ ربط کے نظری پہلو سے واقف ہوتا ہے، نہ نصاب اس کے سامنے ہوتا ہے اور نہ اس حرفے کی نشو ونما اور اس کی تاریخ اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ نظری اور عملی کام کے اس فرق کو صاف طور پر اس حقیقی مثال سے سمجھ لیجیے کہ ایک ٹریننگ اسکول میں طریقہ تعلیم پڑھانے والا استاد مڈل پاس ہے۔ ربط پڑھانے والا استاد ایک ایم اے ہے۔ حرفہ سکھانے والا استاد ایک نشی پاس ہے اور مشقی سبقوں کی جانچ کرنے والوں میں ایک چوتھا درجہ پاس پی ٹی سی ہے۔ پھر طالب علم کے سامنے

بعض وقت یہ مجبوری ہوتی ہے کہ اس کو اپنے سبق کی مخصوص حرفے سے مربوط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے
جس ٹریننگ اسکول کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے اس میں باقاعدہ شقی سبقوں کے پروگرام میں ربط کا مرکز ویج
کردیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے کسی حصے کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ورنہ پیش کردیتا۔ ایک اور گمراہ کن
چیز یہ ہے کہ بعض ٹریننگ اسکولوں میں حرفہ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیمی اہمیت کچھ خود بخود
دب جاتی ہے۔ میری ایک عزیزہ مارچ کے شروع میں ایک بیسک ٹریننگ سنٹر دیکھنے گئیں اور اس کے
بعد انھوں نے مجھے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"ہم پچھلے ہفتہ بیسک ٹریننگ کالج دیکھنے گئے ہم نے وہاں دیکھا کہ یہ کام کس طرح ہوتا ہے
ہم سب نے وہاں ابری بنانا سیکھا۔ میں اپنی بنائی ہوئی ابری کے دو نمونے بھیجتی ہوں
کہئے یہ ٹھیک ہیں نا؛ یہ میری پہلی کوشش ہے ...... اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال
بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے۔"

یہ آخری ٹکڑا "اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال کثر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے" سنا آپ نے؛
پھر مہاتما گاندھی نے اکثر و بیشتر جب بھی اس تعلیم کا ذکر کیا تو انھوں نے دیہی حرفوں کے کسی اور
تعلیمی شغل کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ انھوں نے بار بار (ہریجن کے متعدد مضمونوں میں، ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ
پر پیش لفظ میں، پونہ کانفرنس کے موقع پر اپنے پیغام میں) یہی کہا ہے کہ تعلیم دیہی دستکاریوں کے ذریعہ
ہونی چاہئے۔ عقیدت چونکہ ہندوستان کے ذہن پر اب بھی غلبہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں
اگر بعض لوگ مہاتما گاندھی کے الفاظ سے متاثر ہو کر تعلیمی معاملے کو بھی جسے حد درجہ سائنٹفک ہونا چاہئے
محض اعتقادی معاملہ بنالیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے پونہ کانفرنس میں فرمایا تھا کہ "میں بنیادی تعلیم کا
سند یافتہ استاد نہیں ہوں میرے پاس ایک ہی سند ہے اور وہ اعتقادی ہے" آگے چل کر ان صاحب
نے فرمایا کہ کس طرح دستکاری اور تخلیقی مشاغل کے ذریعہ تعلیم کا اصول سمجھنے۔ سے بعد انھوں نے کاتنا
سیکھا اور پھر تعلیم دینا شروع کردیا۔ اعتقاد کا سوال تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے تو یہ چیز آپ کو اصولاً
غلط اور مضر معلوم ہوگی بنیادی قومی تعلیم ہمارا بہت زیادہ قیمتی تجربہ ہے اس لئے ابھی اسے زیادہ سے

زیادہ محتاط ہاتھوں میں رہنے کی ضرورت ہے۔

ذاکر حسین کمیٹی نے حرفے کے ساتھ ساتھ سماجی اور طبعی ماحول کو بھی ربط کے مرکز قرار دے کر اپنا پورا پورا حق ادا کر دیا لیکن جب عام استاد اسی رپورٹ میں کاتنے بننے کے کام سے پورے سات سال کے نصاب کے ربط کے امکانات دیکھتے ہیں تو وہ یا تو سماجی ماحول کو بالکل بھول جاتے ہیں یا انھیں اتنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ربط کے یہ امکانات محض اس لئے تجویز کئے تھے کہ ہر مدرس اپنی جگہ سمجھ بوجھ سے کام لے کر آزادانہ حیثیت سے مگر صحیح کام کرے گا۔ ہوا بدقسمتی سے یہ کہ عقیدت نے سمجھ بوجھ کو یہاں بھی تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی حیثیت سے اس تجویز کئے ہوئے ربط میں کہیں کہیں جھول نظر آئے گا چند مثالیں آپ خود ملاحظہ فرمائیے۔

جماعت اول:- افریقہ میں اہرام بنانے والے غلام کا مال۔ ربط مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کا لباس۔

جماعت دوم:- حضرت موسیٰؑ کی کہانی۔ ربط:- قدیم زمانے کا لباس۔

جماعت سوم:- تھرا پلی کی جنگ۔ سقراط وغیرہ۔ ربط:- قدیم زمانے کے لباس کی سادگی اور خوبصورتی

جماعت چہارم:- سمندر گپت، کالیداس، آریہ بھٹ ربط:- زمانہ قدیم میں کپڑے کی تجارت۔

جماعت پنجم:- پیغمبر اسلام کی سوانح حیات۔ ربط:- آنحضرت کا سادہ لباس۔ وغیرہ وغیرہ

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو جانا چاہیے کہ ربط اور کھینچ تان میں کیا فرق ہے۔ اہرام بنانے والے غلاموں کی زندگی میں ان کا لباس کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا عنوان "غلامی" اور "مشقت" ہو سکتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر اسلام پر ہر گفتگو میں ان کے پیغام کی اہمیت باقی تمام دوسری چیزوں پر حاوی رہے گی۔ تھرا پلی کی جنگ میں اس لباس کی کیا حقیقت جو اسپارٹا اور ایران کے سپاہی پہنتے تھے۔ ہاں ایک طرف ملک گیری کی ہوس اور دوسری طرف حب وطن کا جوش — یہ اس جنگ سے متعلق زیادہ قریب حقیقتیں ہیں۔ سمندر گپت کے لئے حکمرانی، کالیداس کے لئے شعر و ادب اور آریہ بھٹ کے لئے علم و تحقیق طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ انھیں اپنے زمانے میں کپڑے کی تجارت سے کیا واسطہ؟

اہرام اور اہرام بنانے والوں کا ذکر کیا ان شاہی عمارتوں کے ذکر سے مربوط نہیں ہو سکتا، جو بچوں کے ماحول میں ہوں یا جنہیں بچے جانتے ہوں؟ ایک طرف اہرام بنانے والوں کو پیاز کھانے کو ملتی تھی، دوسری طرف تاج محل بنانے والے کاریگروں کو زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔ اہل یہود اور اہل اسلام کے بانیان مذہب کا رشتہ بڑی آسانی سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ان بے شمار مذہبی تہواروں سے جو سال میں ایک نہیں کئی واقع ہوتے ہیں۔ تھرماپلی کی جنگ موجودہ جنگ سے کس قدر ملی ہوئی چیز ہے۔ اسی طرح سمندر گپت، کالیداس اور آریہ بھٹ ہم سے کچھ دور نہیں ہیں۔ حکمرانی، شعروادب اور علم و تحقیق زندگی میں روز کا شغل ہیں۔

کچھ غلطی دراصل یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے ربط کو عام تعلیمی طریقوں سے الگ کوئی چیز سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ربط کا مسئلہ صاف صاف سبق کو پیش کرنے کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے ربط کا طریقہ چند خطوں سے محدود و محصور طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں دائرہ در دائرہ اور اس کے امکانات گنجائش در گنجائش ہیں۔ ربط فی الحقیقت کوئی خارجی اصول نہیں ہے، وہ فی الحقیقت سبق کی بنیاد ہے اور سبق کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ وہ جماعت کے سامنے کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ سبق سبق ہوگا اگر بچوں میں اس کے لئے صحیح شوق پیدا کر دیا گیا ہو اور بچوں میں شوق اسی وقت پیدا ہوگا جبکہ انھیں اپنے پچھلے تجربوں سے منسلک اپنی زندگی سے ہم رشتہ اور اپنے مشاغل سے متصل سبق میں ایسی معلومات کی امید ہو جو انھیں کسی نہ کسی اعتبار سے آگے بڑھا سکے۔

ایک استاد اپنی جماعت میں جاتا ہے اور کہتا ہے "نکالو سورج کی روشنی والا سبق" استاد یہ سبق اس لئے پڑھانے کہ وہ مجبور ہے اور بچے یہ سبق اس لئے پڑھ لیں کہ وہ مجبور ہیں تو بات دوسری ہے۔ لیکن اگر کوئی بچہ کھڑا ہو کر استاد سے پوچھ بیٹھے کہ "ہم یہ سبق اس وقت کیوں پڑھیں؟" تو استاد کے سامنے جو نازک صورت ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ ایک استاد کے بچے صبح مدرسے کے پھولوں کی کیاریاں اور گملے وغیرہ صاف کرنے کے لئے جاتے ہیں بچے دیکھتے ہیں کہ ایک کونے میں جو گملا رکھا ہوا ہے اس کی پتیوں اور پھولوں کے رنگ میں وہ تیزی اور خوبصورتی نہیں جو باہر کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں میں ہے یہاں استاد کے لئے سورج کی روشنی پر بچوں کو معلومات دینے کا کتنا اچھا موقع ہے

فرض کیجئے کہ ایک مدرسے کا استاد خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس میں اجمیر جاتا ہے۔ جب وہ لوٹ کر آتا ہے تو ایک جماعت کے بچے اسے درجے میں بلا کر عرس کے حالات سنتے ہیں۔ وہ استاد اسی موقع پر انھیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا وہ سبق بھی پڑھا دیتا ہے جو ان کے نصاب میں داخل ہے۔

ایک استاد اپنے بچوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا کمرہ کچھ ویران ویران سا ہے۔ بچے کمرہ کو سجانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ استاد بچوں کے سامنے کاغذ کی پٹی یا ابری کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے کئی ڈیزائن پیش کرتا ہے ایک ڈیزائن مربعوں سے بنا ہوا ہے، ایک دائروں سے اور ایک مثلثوں سے بچے آخری ڈیزائن پسند کر لیتے ہیں۔ اب بچوں کو یہ مثلث خود کاٹنے ہیں بچے خود ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ مثلث ایسا ہے جس کا ہر ایک ضلع برابر ہے۔ وہ استاد سے اسے آسانی سے بنانے کا طریقہ پوچھتے ہیں۔ استاد انھیں متساوی الاضلاع بنانا سکھا دیتا ہے بچوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کمرہ سجانے کے لئے حاشیہ بنا رہے ہیں یا مثلث متساوی الاضلاع بنانا سیکھ رہے ہیں۔

یہ مثالیں میرے خیال میں ربط کی اچھی اور صحیح مثالیں ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین استاد بچوں کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے کہ بچوں کو یہ بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ان پر کوئی چیز جبر کی جا رہی ہے۔ بلکہ بچے اس نئی چیز کو اپنی ذاتی کوشش اور کھوج کا نتیجہ سمجھتے ہیں چنانچہ انھیں وہی خوشی ہوتی ہے جو کولمبس کو امریکہ دریافت کرکے ہوئی ہوگی مربوط سبق بچوں کے شوق کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔

ربط کی کچھ اور صورتیں | تعلیم میں ربط کا مسئلہ تخلیقی مشاغل کے ذریعہ یا بچوں کے سماجی اور طبعی ماحول کے ذریعہ تعلیم دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ربط کا مسئلہ ہمہ جہتی مسئلہ ہے چنانچہ یہاں سبق کا ربط سبق سے نکل سکتا ہے روزمرہ کی زندگی میں جب بھی کسی مدرسہ کا ٹائم ٹیبل ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مختلف مضمون میں اوپر سے نیچے تو کوئی رشتہ ہے مثلاً تیسرے گھنٹے میں روزانہ انگریزی یا دوسرے میں روز حساب لیکن ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ٹائم ٹیبل میں مضمونوں کا رشتہ دائیں بائیں سے بھی ہے یعنی اگر تیسرے گھنٹے میں انگریزی ہے۔ چوتھے میں تاریخ، پانچویں میں جغرافیہ، چھٹے میں ڈرائنگ اور ساتویں میں اردو ہے تو اس کے باوجود کہ یہ گھنٹے

ٹائم ٹیبل میں الگ الگ ہیں۔ نہ تیسرے کا کام چوتھے سے الگ ہے نہ چوتھے کا پانچویں سے، نہ پانچویں کا چھٹے سے جن مدرسوں میں ہر مضمون کے استاد الگ الگ ہوتے ہیں وہاں تو البتہ ہر مضمون ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جاتا ہے لیکن جہاں جماعت کے استاد موجود ہوں وہاں تو پہلے گھنٹے سے لے آخری گھنٹے تک کام میں کوئی مصنوعی تقسیم ہوتی ہی نہیں چاہیئے۔ مضمون خود اپنی جگہ الگ الگ ہونے کے باوجود مجموعی حیثیت سے ایک وحدت ہیں۔ اور ہم زندگی میں خود ان مضمونوں کو وحدت کی حیثیت سے استعمال بھی کرتے ہیں جس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اسوقت مجھے تاریخ تعلیم، نفسیات تعلیم، اصول تعلیم، طریقہ حصول تعلیم، اقتصادیات زبان، ڈرائنگ اور حساب سب سے یکجائی طور پر کام لینا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ مختلف مضمونوں کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی۔ ادب کی تعلیم کے ساتھ مصوری، موسیقی، تاریخ جغرافیہ اور سائنس غرض وہ کونسی چیز ہے جو وابستہ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس خیال کے بھی گذرے ہیں کہ مختلف مضمونوں میں سے کسی ایک مضمون کو مرکز بنا کر بقیہ تمام مضمونوں کو اس ایک مضمون سے مربوط کر کے پڑھایا جائے۔ ہربرٹ جو تعلیم کا مقصد دوماسیرت کی تعمیر سمجھتے تھے (اور ہمیں ان سے اختلاف کرنے کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے) تاریخ کو مرکزی حیثیت دے کر ادب، ریاضی، جغرافیہ، ڈرائنگ اور سائنس سب ہی کچھ اس کے ذریعہ پڑھا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اگر کسی جماعت میں اکبر کی شخصیت کو مرکز بنایا گیا ہے تو اکبر سے متعلق زبان کے نظم و نثر میں سبق، ہندوستان کے ان حصوں کا جغرافیہ جن پر اکبر نے حکمرانی کی، گجرات پر فوج کشی کے سلسلے میں سمندر اور اس کے ساتھ سائنس کے مسائل اور اکبر کے زمانے کے ملازموں کی تنخواہوں اور تعداد سے مربوط سوالات، اکبر کے زمانے کے لباس عمارتوں اور ہتھیاروں وغیرہ کی تصویریں۔ سب ہی کچھ پڑھایا جائیگا ہمارے ایک اور بزرگ کرنل پارکر مطالعۂ قدرت کو مرکزی حیثیت دے کر ربط کی کچھ یہی صورت تجویز کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا طریقہ ہے۔

ربط کی اس صورت کو نفسیاتی حمایت بھی حاصل ہے۔ بچہ دنیا کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا جن آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے لئے انسان اور فطرت، دنیا اور دنیا کی مختلف چیزیں الگ الگ کوئی معنی نہیں رکھتیں تاوقتیکہ بالغ ہو کر وہ چیزوں میں امتیاز کر سکتا ہے اور ان کی اضافی اہمیت سمجھ سکتا ہے۔ وہ کسی چیز کو

سے اوران دونوں کو ٹیبل لیمپ سے اپنے شعور کی ابتدائی زندگی میں الگ الگ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جس کمرہ میں رہتا ہے اس کی کتابیں، اس کی تصویریں، اس کی کرسی، اس کی میز، اس کا لیمپ سب ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں اور پورا کمرہ کا کمرہ اس تمام سامان کے ساتھ ایک وحدت کا درجہ رکھتا ہے۔ بڑا ہوکر وہ ضرور میز کو میز اور کرسی کو کرسی سمجھنے لگتا ہے۔ گویا یہاں ربط کا مسئلہ امتیاز کا مسئلہ ہے اور تجزیے میں تحلیل کا رشتہ نکلتا ہے۔

ہربارٹ اور پارکر نے ربط کی جو صورت تجویز کی ہے اس کو سامنے رکھکر ہم جماعت میں ربط کی یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں کہ ہم کسی مضمون کے کسی سبق کو کسی مضمون کے کسی موضوع سے مربوط کرلیں۔

ایک استاد ایک جماعت کو دوسرے گھنٹے میں شہد کی مکھیوں پر بچوں کو سبق پڑھانے جاتا ہے۔ استاد کو معلوم ہے کہ یہ بچے گھر کی مکھی کا حال پڑھ چکے ہیں۔ استاد اپنا سبق اس طرح پیش کرتا ہے۔

گھر کی مکھی کہاں پیدا ہوتی ہے؟

گندگی میں

گھر کی مکھی کس چیز پر زندگی بسر کرتی ہے؟

گندگی پر

گھر کی مکھی ہماری دوست ہے یا دشمن؟

دشمن

لیکن آج ہم ایک ایسی مکھی کا حال پڑھیں گے جو گندگی میں پیدا ہونے کے بجائے صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوتی ہے جو گندگی پر پرورش پانے کے بجائے رنگ و نور کی دنیا میں ملتی ہے اور انسان کو تکلیف پہونچانے کے بجائے اس کے لئے دنیا کی سب سے اچھی نعمتوں میں سے ایک نعمت مہیا کرتی ہے۔ بچے ایک دم پکار اُٹھے "شہد کی مکھی! ماسٹر صاحب!!" ربط کا حق اسی منزل پر پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اس پورے سبق میں یہی التزام تھا کہ نئی معلومات کی ساری عمارت منزل بہ منزل انھیں بنیادوں پر بنی تھی جو بچوں کی پچھلی معلومات نے تیار کی تھی

ایک استاد نے دوسرے گھنٹے میں ایک جماعت کو دارائے اعظم کی کہانی پڑھائی اور اسے بغیر بچوں کے شوق کو تکلیف پہونچائے گھنٹے کے ساتھ ختم کر دیا۔ تیسرے گھنٹے میں استاد کو شہد کی مکھیوں کی رانی کا حال پڑھانا تھا۔ استاد نے بچوں سے کہا کہ "اب تک تو ہم نے انسانوں کی دنیا میں راج کرنے والے ایک راجہ کا حال پڑھا۔ اب جانوروں کی دنیا میں حکومت کرنے والی ایک رانی کا حال پڑھیں گے۔" استاد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے تھے کہ بچوں کے شوق میں تازہ جان پڑ گئی۔

بعض اسباق میں خود بخود دوسرے اسباق سے ربط کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ایک جماعت کے بچوں نے حالی کی یہ نظم پڑھی (مجھے پوری نظم یاد نہیں۔ یادداشت سے نقل کرتا ہوں)

جھٹپٹے کے وقت سرِ شام ایک مٹی کا دیا　　ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا

تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں　　راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا

یہ دیا بہتر ہے اُن فانوس اور اس لیمپ سے　　روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جنکی سدا

..................　　..................

سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اس نظم کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ "روشنی کا مینار" سبق بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور اس کے ساتھ "ہفت عجائبات عالم" "تمدن کے عجوبے" وغیرہ دوسرے زبان، معلومات اور سماجی علم کے سبق۔

بیلجیم کے مدرسۂ جدید کے بانی واسکونسلو کی نظر میں ایک ہی دن میں ریاضی، لکھنا، پڑھنا، تاریخ، جغرافیہ طبیعات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے۔ ایک جرأت آزمائی کی جا سکے لیکن اس کا تعلیمی نتیجہ صفر ہوگا۔ کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں۔ واسکونسلو نے مضمونوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی تھی کہ ایک مضمون سے متعلق کل سبق ایک جگہ مربوط سلسلے میں اکٹھے ہو جائیں اور اس طرح کہ انھیں بھی ماحول و حالات سے بھی ہم رشتہ کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ اپنے طلبہ کے لئے گرمی کے موسم میں حیوانات اور نباتات وغیرہ کا مطالعہ تجویز کرتے ہیں اور سردی کے موسم میں طبیعیات و کیمیا کا مطالعہ۔ ان کے طلبہ جس موضوع

کو لیتے ہیں اس پر صبر اور استقلال سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہمیں بھی نصاب میں اکثر ایسے مضامین ملیں گے جن کی ترتیب کو نظر انداز کر کے ہم انھیں بآسانی ایک سلسلے میں اور بہتر طریقے سے پڑھا سکتے ہیں۔ بعض مصنفین بھی مدرسین کا کام آسان کرنے کے لئے اب ایک موضوع سے متعلق مضمونوں کو کتابوں میں ایک ساتھ درج کرنے لگے ہیں۔

بنیادی قومی تعلیم کو تنگ نظر سے دیکھنے والے استاد ممکن ہے ربط کی ان صورتوں کو قابل قبول نہ سمجھیں لیکن میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ خود ہمیں ربط کی ان صورتوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے اس میں سماجی علم کے بعض عنوانوں کو زبان کے سبقوں کے لئے بھی تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ افریقہ کے بونوں، آسٹریلیا کے وحشیوں، عہد قدیم کے عبرانیوں، رومیوں اور ہندوستانیوں کی زندگی سماجی علم کے ساتھ ساتھ زبان کے نصاب میں بھی شامل ہے (صفحہ ۱۵۹[1]) اور وہ بات جس کی تحریک واسکو نسلونے کی ہے پورے نصاب کی جان ہے۔ عہد قدیم کا مصر، عہد قدیم کا چین عہد قدیم کا ہندوستان ایک دوسرے سے ہم تعلق موضوع ہیں۔ چنانچہ یہ تمام موضوع نصاب میں اجتماعی حیثیت سے ایک ہی جگہ موجود ہیں اور ان میں باہمی ربط کا جو موقع ہے۔ وہ بھی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں۔ (صفحہ ۱۵۸)

فضل الدین اثر

---

[1] حوالہ صفحہ نصاب بنیادی قومی تعلیم انگریزی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۸ء

# نئی تعلیم کے پڑھانے والے کیسے ہوں؟

اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو گاندھی جی نے کانفرنس میں لوگوں کو دیا تھا کہ پڑھانے والے وہ لوگ ہوں جو میٹرک فیل ہوں۔ اس میں ملک کے مختلف پڑھے لکھے لوگوں کے معیار کے مطابق ایک بات کہدی ہے اس سے اسکیم کے پڑھنے والوں اور چلانے والوں کو معیار کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جو مڈل پاس، میٹرک پاس اور ایف۔اے۔ بی۔اے پاس کے معیار کو سمجھتے ہیں انھیں اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس معیار کے پڑھے لکھے لوگ اس اسکیم کو چلا سکتے ہیں اگر اُن کی خاطر خواہ تربیت ہو جائے۔ اُس وقت نئی تعلیم کی ابتدا تھی۔ گاندھی جی کا یہ جواب کافی تھا لیکن اب جبکہ کام کرنے اور کرانے والوں نے نئی تعلیم کے کام کو شروع کر کے کچھ تجربہ کیا ہے تو استاد کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا جارہا ہے۔ کام کرنے اور کرانے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ استاد کو موجودہ تعلیمی معیار کے علاوہ کیا کیا باتیں آنی چاہئیں۔ اس میں کیا کیا استعداد ہونی چاہئے اور کن کن امور میں اس کی تربیت ہونی چاہئے۔ نئی تعلیم کے بسیط نصاب کے لئے جس میں دنیا کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ زمانے کے حالات اور واقعات کو مع ان کے اسباب کے ترتیب دیا گیا ہے۔ صرف میٹرک فیل پاس اُستاد کافی نہیں ہوسکتا۔ اس نصاب کو پڑھانے کے لئے بی۔اے پاس اُستاد بھی دقت محسوس کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کا نصاب پرانی تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اس کے انداز اور انھان کی بنیاد ہی بالکل الگ ہے وہ تو موجودہ تعلیمی حالت میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ تو استادوں شاگردوں اور سرپرستوں میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس نصاب میں نفس مضمون سے واقفیت ہی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں بہت سی باتیں نئی ہیں۔ میٹرک تک ان میں سے کئی باتیں نہیں بتلائی جاتی ہیں۔ پہلی اور دوسری ہی جماعت میں کئی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھانے والے نہیں جانتے۔ پھر اس میں تو سبھی کو دقت ہوتی ہے کہ ان باتوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے؟ اور ان کا سلسلہ کس طرح شروع کیا جائے؟ دوسری طرف اس تمام نصاب کے پڑھانے میں ان تمام بنیادی

باتوں کا خیال رکھنا ہے جس پر نصاب میں زور دیا گیا ہے اگر پڑھانے کے دوران میں نصاب کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا گیا تو محض واقعات اور حالات کا بچوں کو بتلا دینا بالکل بے سود ہوگا۔ نصاب میں جو باتیں رکھی گئی ہیں وہ چند مقاصد کے ماتحت رکھی گئی ہیں۔ اگر نفس مضمون کے پیش کرنے کے دوران میں یا اس کے بعد وہ مقاصد نہیں حاصل ہوئے تو محض مجوزہ باتوں کا پیش کر دینا بالکل بے سود ہوگا۔ لہذا پڑھانے والے ان مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

مربوط پڑھائی کا خیال تو ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بالکل نیا ہے۔ پہلی دونوں صورتوں میں تو کچھ نہ کچھ کامیابی ہو جاتی ہے لیکن ربط کے تصور ہی سے بڑی پریشانی ہوتی ہے بعض لوگ تو اس کو بالکل مہمل سی بات سمجھتے ہیں اور نہ جاننے والوں کے لئے واقعی بالکل مہمل بات ہے جن لوگوں نے بالکل سیدھے سادے طریقہ سے تعلیم حاصل کی ہے اُن کے لئے یہ بات بالکل نئی ہے۔ تمام نصاب کو حرفہ، سماجی ماحول اور قدرتی ماحول میں سمو دیا جائے بالکل نیا خیال ہے (صرف ہندوستان میں) ہم جو دوسروں کے کئے ہوئے تجربہ پر انحصار کرتے ہیں اور اپنا کوئی تجربہ نہیں کرتے محض عقلی دلائل کی طاقت پر ہر نئی بات کو مہمل ہی خیال کرتے ہیں۔ یا مان تو لیتے ہیں لیکن بغیر سمجھے بوجھے کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کے کام کرنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو قدرتی ماحول اور سماجی ماحول کو نہیں سمجھتے اور سمجھیں کیسے جبکہ ہمارے ذہن تاریخ، جغرافیہ، مدنیات، مطالعہ قدرت، مطالعہ اشیاء اور حفظان صحت کے عنوانات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں ہمیں یہ نام نا مانوس سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان سے ربط دے کر کسی مضمون کو پڑھانا بالکل عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اخبارات، رسالوں، جلسوں اور ٹریننگ اسکولوں میں بار بار اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ پھر بھی اس بات میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی دو اُستاد اس کو ایک طریقہ پر نہیں سمجھتے اور نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت بالکل مختلف ہے اور اس طریقہ کے سمجھنے کے لئے کمزور ہے اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں ہر تعلیمی تحریک میں کم و بیش ایک قسم کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے اور کام کرنے والے اس طریقہ کے تمام اصولوں کی ایک حد تک پابندی کرتے ہیں اور تجربہ کے بعد اختلاف پیش کرتے ہیں اور اپنے اصولوں کو تجربہ کی روشنی میں بدلتے ہیں لیکن ہم اصولوں کو بدل بدل کر

تجربہ کرتے ہیں۔ کسی ایک اصول کو پیشِ نظر رکھکر تجربہ نہیں کرتے۔ ہم پہلے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اصول صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تجربہ کرتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو سارا الزام اسکیم کو دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں پڑھانے والوں میں چند خاص خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ ہمارا کام پھر بھی موجودہ مدارس کے طریقۂ کار کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔ سب سے ضروری بات یہ ہونا چاہئیے کہ جو استادی تعلیم کا کام کر رہے ہوں وہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک قومی کام کر رہے ہیں جس میں ذاتی مفاد کو بڑی حد تک قربان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خیال سے وہ قومی تعلیم کا کام نہیں کر رہے تو اُن کے کام میں وہ خوبی اور وہ زور نہیں ہوگا جو ہونا چاہئے۔ نئی تعلیم کی روح کو قائم رکھنے کے لئے بھی اس بات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ بنیادی خوبی ہے جس سے طلبا میں وہ ذہنیت نہیں پیدا ہوگی جو آج کل کی مروجہ تعلیم سے پیدا ہو رہی ہے اور جس سے قوم کا ہر طرح نقصان ہو رہا ہے۔ جو استاد اس خیال سے کام کریں گے ان کے کام میں بدلی نہیں پائی جائے گی اور خاص امنگ کے ساتھ کام ہوگا اور اگر کام کرتے کرتے کبھی ناکامیابی ہوگی تو استاد کبھی ہمت نہیں ہارے گا۔ اکثر کام کرنے والوں کو میں تنخواہ کی کمی کی شکایت کرتے سنتا ہوں۔ قومی کام کرنے والوں کو یہ شکایت نہیں کرنی چاہئیے۔ ہندوستان میں جب تک تعلیم کے لئے حکومت کافی روپیہ خرچ نہیں کرتی اور قومی مدارس میں اس کے لئے کافی روپیہ فراہم نہیں ہوتا استادوں کا تنخواہ کی کمی کی شکایت کرنا فضول ہے اس سے کام بھی خراب ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ بھی نہیں نکلتا یعنی تنخواہ کے معیار بڑھنے کی کوئی سبیل نہیں نکلتی اور کام برائے نام ہوتا ہے ہمیں یہ بات نظرانداز نہیں کرنی چاہئیے کہ ہمارے ملک میں اب سے پچاس ساٹھ سال پیشتر جو لوگ مکتبوں، مسجدوں اور پاٹشالوں میں درس اور تدریس کا کام کرتے تھے ان کو صرف دونوں وقت کا کھانا محلہ کے لوگوں سے ملتا تھا۔ اور سال میں محلہ کے لوگ ہی کچھ کپڑے بنوا دیا کرتے تھے۔ انعام و اکرام عیدی، تہواری سے ان کے پاس تھوڑی سی رقم جمع ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے جن میں استاد کے گذارے کی یہ صورت رہی ہو۔ وہاں تنخواہ کا معیار بڑھتے بڑھتے بڑھے گا۔ ابھی تو استاد کی تنخواہوں کی طرف لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور بعض بعض صوبوں میں پرائمری اسکول کے پڑھانے

والوں کو صرف تین روپے ماہوار ملتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی کام کو تنخواہ کی کمی بیشی سے ناپنا کچھ بیجا سا ہے اور ایسی حالت کی شکایت کرنا ہے جو اپنے بس میں نہیں ہے۔ اگر نئی تعلیم کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا خیال ہے اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی کچھ تعلیمی تجربے ہوں اور دوسروں کی تقلید ہی تقلید نہ ہو تو قومی اسپرٹ سے کام کئے جایئے اور اس اسکیم کو کامیابی کی طرف بڑھانے میں نمایاں حیثیت حاصل کیجئے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جن مدارس میں استاد تنخواہوں کا خیال کئے بغیر نئی تعلیم کے کام کو کر رہے ہیں۔ اُن میں اس اسکیم کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ناکامیوں پر قابو پانے کے لئے نئی نئی ترکیبیں سوچی گئی ہیں اور اس طرح نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ان کے کام میں زندگی پائی جاتی ہے پیدلی نہیں ان مدرسوں کے استادوں نے اس اسکیم کو اچھی طرح چلانے کے کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ گو ایسے مدرسے ملک میں ابھی کم ہی ہیں لیکن ایسے مدرسوں ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نئی اسکیم کی ہر خوبی اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اور ہر بات کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کا صحیح ثبوت پیش کر سکیں گے جس خیال کو میں نے پیش کیا ہے۔ اس خیال کے استاد ملک میں بہت تھوڑے ملیں گے اور ان کی خاطر خواہ ہمت افزائی بھی نہیں ہو رہی ہو گی جو تنخواہ کا بدل ہو سکتی تھی لیکن نئی اسکیم کو کامیابی سے چلانے کے لئے ایسے ہی استادوں کی ضرورت ہے جو تمام حادثات کو برداشت کر سکیں اور کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دیں نئی اسکیم کے استادوں کے لئے یہ ایک نبیادی خوبی ہے۔

اس کے علاوہ استادوں میں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ تعلیمی کام سے پڑھانے والے کی طبیعت کو قدرتی لگاؤ ہو۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں بھی تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہوں اور ان کے حل کے متعلق سوچتے ہوں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ملکہ بعض استادوں میں بالکل قدرتی ہوتا ہے اور ٹریننگ سے اس میں خاص جلا ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کو تعلیمی کام کاج سے قدرتی لگاؤ نہیں ہوتا ٹریننگ سے ایک حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جن لوگوں کی طبیعتوں کو تعلیمی کام کاج سے بالکل مناسبت نہیں ہے ان کا اس اسکیم کے چلانے کی ذمہ داری لینا محض اس خیال سے کہ اس بیکاری کے زمانہ میں کوئی اور کام نہیں ملتا تو تعلیمی کام کرنے لگیں۔ مفید نہ ہو گا۔ ٹریننگ لیکر بھی کوئی خاص

بات پیدا نہیں ہوگی خواہ ایسے استاد ایثار و قربانی کے مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے ایثار اور قربانی سے اس اسکیم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے ایسے استادوں کو اپنے کام میں کوئی لطف نہیں آئے گا بلکہ بیدلی ہی بیدلی نظر آئے گی بالکل بے نتیجہ کام ہو رہا ہوگا۔

تیسری اہم بات استادوں کے لئے یہ ہے کہ وہ نئی اسکیم کے نصاب سے پوری طرح واقف ہوں خواہ وہ نصاب پہلی جماعت کا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف نصاب سے واقف ہوں بلکہ نصاب کے پڑھانے اور پیش کرنے کے دوران میں جن ضروری مسائل کے پیدا ہونے کا امکان ہو ان سے بھی واقف ہوں پڑھاتے پڑھاتے کہیں سیر کا پروگرام آجاتا ہے یا مشاہدہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اور بہت سے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں جو نصاب میں نہیں دیے جاتے ہیں لیکن استاد کی معلومات اس قدر وسیع ہو کہ وہ طلبا کے سوالات سے گھبرا نہ جائے، لاچار اور مجبور نہ ہوجائے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کرے۔ انھیں صحیح طریقہ پر مشاہدہ اور سیر کرائے اور پوری طرح فائدہ اٹھانے دے۔ استاد نہ صرف واقف ہوں بلکہ اسے پڑھانے کے گر بھی اچھی طرح جانتے ہوں۔ بعض ایسے استاد دیکھنے میں آئے ہیں جو نصاب کے متعلق بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں لیکن وہ طلبا کو بتلانے اور سمجھانے سے واقف نہیں ہوتے۔ کبھی ڈسپلن خراب ہوتا ہے کبھی اس قدر وسیع معلومات دیتے ہیں کہ طلبا سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کبھی معلومات اس قدر خشک طریقہ سے پیش کی جاتی ہے کہ طلبا بددل ہوجاتے ہیں اور استاد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں کبھی وہ اپنے وسیع معلومات سے ایسے اپنے نوٹ ترتیب دے کر طلبا کو لکھاتے ہیں کہ طلبا لکھتے لکھتے اور انھیں دوبارہ نقل کرتے کرتے اکتا جاتے ہیں اور امتحان کے موقع پر انھیں ایک مصیبت سمجھ کر یاد کرتے ہیں لیکن پھر بھی یاد نہیں ہوتے۔ یہ سب طریقۂ تعلیم کے نہ جاننے کے نتائج ہیں۔ ایسے استاد بھی ہیں، جو نصاب سے تو تھوڑی واقفیت رکھتے ہیں مگر پڑھانے کے گر سے ایسے واقف ہوتے ہیں کہ طلبا میں سمجھ پیدا کر دیتے ہیں انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتے ہیں طلبا سے مشورہ کرکے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں کہ طلبا تمام پڑھائی میں جان محسوس کرتے ہیں۔ وہ مضمون زیر بحث کے متعلق مواد فراہم کرنے کا شوق پیدا کر دیتے وہ اپنے طریقہ سے پڑھائی کو بامقصد بنا دیتے ہیں۔

بہر حال نفس مضمون سے واقفیت کے ساتھ ساتھ طریقہ تعلیم سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہئے کیونکہ تعلیمی میدان میں یہ بات زیادہ ضروری ہے۔ اس سے نصاب کی دشواریاں بھی حل کی جاسکتی ہیں اور طلبا کو صحیح رہنمائی بھی دی جاسکتی ہے نئی تعلیم میں تعلیم کے گروں کا جاننا اور استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہو جتنا پرانے طریقوں میں اس کا نہ جاننا اور نہ استعمال کرنا، پرانے طریقہ تعلیم میں امتحان، مار دھاڑ، سرپرستوں کے خوف و تنبیہ سے کچھ نہیں تو چالیس فی صدی نتیجے تو نکل ہی آتے ہیں لیکن نئی تعلیم میں اس قسم کی سرزنش اور لگاڈ کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں تو سرپرست اس کی شکایت کریں تو انھیں سمجھانے کی ضرورت ہوگی کہ وہ تعلیمی معاملات میں مار پیٹ کو روا نہ رکھیں اس سے بچے کی ساری اپج ختم ہوجاتی ہے۔ نئی تعلیم میں تو طریقہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں تعلیم کے نئے نئے گروں کو استعمال کرکے اور پرانے تمام طریقوں سے قطع نظر کرکے سو فی صدی نتایج کی توقع کی جائے گی اس لئے یہ کام پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگا۔

تعلیم کے اچھے طریقے اور گر ٹریننگ اسکولوں میں ہی نہیں سیکھے جاتے۔ یہ طریقے طلبا میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرنے ان کے مسائل سمجھنے تعلیم کو ان کی طبیعتوں کے مطابق بنانے، ان کی دقتوں کو رفع کرنے اور طلبا کے ہو رہنے میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے کبھی کسی ٹریننگ اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ لوگ ایسے ہوئے جنھوں نے خود طلبا کے لئے مدارس کھولے۔ ان میں تعلیم دی تجربے حاصل کئے اور ان تجربوں کا ریکارڈ رکھا۔ اس طرح تعلیمی اصول ترتیب دیئے جن سے ہم آج فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں استادوں کی تربیت کا مخالف ہوں لیکن اس کی اہمیت اس تجربہ کے آگے کچھ بھی نہیں ہے جو پڑھانے والے مدرسہ میں اپنی لگاتار محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ استاد کی ٹریننگ تو صرف اس بات کی سند ہے کہ آپ کو تعلیمی تجربے کرنے کے گر ایک حد تک بتلا دیئے گئے ہیں۔ اٹرینڈ مدرسین اگر اپنے کام کا ریکارڈ نہیں رکھتے، اپنے تجربوں کو قلم بند نہیں کرتے اپنے سوچے ہوئے طریقہ تعلیم کو لکھتے نہیں تو وہ نئی تعلیم کے لئے مفید نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کام کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلم ہے۔ ہندوستان میں تعلیمی تحریک کا آغاز ابھی چند سال ہوئے ہوا ہے۔ اس لئے پہلے

پہلے ہمارا تقلیدی دور تھا۔ دوسروں کا ہر تجربہ پسند آتا تھا اور اپنی ہر بات بے اصول معلوم ہوتی تھی۔ لہذا اگر ہمیں دوسرے ممالک کے مدارس کے برابر کوئی اہمیت حاصل کرنی ہے تو اپنا کوئی سرمایہ جمع کرنا چاہیئے خواہ وہ کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بچوں کی طبیعتوں اور ان کی عادتوں سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے اور حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلّم ہے۔ حرفوں کے کرانے کے دوران میں جو جوش اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اُس سے بہتر طریقہ پر فائدہ اٹھانے کے لئے استاد کو بچوں کی طبیعتوں میں کافی دخل ہونا چاہیئے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہو ورنہ وقت پر اس سے فائدہ نہ اٹھانے سے تمام جوش اور دلچسپی کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بات کے سمجھنے اور استعمال کرنے سے نہ صرف تعلیم بہتر طریقہ پر دی جا سکتی ہے بلکہ بچوں کی انفرادی نشو و نما صحیح اور بہتر طریقہ پر ہو سکتی ہے۔ جو استاد بچوں کے کام کا ریکارڈ برابر رکھتے ہیں۔ بچوں کے رجحانات کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور اپنے طریقوں کو اُن کی طبیعتوں کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ بچوں کی طبیعتوں سے واقف ہو جاتے ہیں ٹریننگ اسکولوں میں اس بات پر کافی زور دینا چاہیئے۔ وہاں اس کو مرکزی جگہ ملنی چاہیئے۔ اس کے لئے کتابیں اور عملی طور پر مشاہدہ کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے بیشتر استادوں میں اس فن کی کمی ہے۔ جانتے ہیں لیکن استعمال نہیں کر سکتے۔ طریقۂ تعلیم کے موثر طریقہ پر استعمال ہونے کی صورت جب ہی ہو سکتی ہے جب استاد بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ استاد اپنے طریقہ سے اسباق کو بہتر طریقہ پر ترتیب دیں۔ مواد جمع کریں (Teaching Aids.) بنائیں لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بچے اسباق کے سیکھنے کی طرف مائل نہ ہوں اور اس طرح استاد کی تمام کوششیں بیکار جائیں لہذا استاد کو بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہیئے۔

میں نے چند نہایت ضروری باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اُن خوبیوں کو بیان کیا ہے جو نئی تعلیم کے پڑھانے والوں میں ہونی چاہئیں میں نے عمداً اُن خامیوں کو نہیں بیان کیا ہے جو اس قسم کی تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے استادوں میں ہوتی ہیں۔ آخری خوبی حرفہ ہے۔ جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے

ہیں وہ کئی حرفے جانتے ہوں۔ حرفوں کو اس طرح جانتے ہوں کہ بچوں کو اچھی طرح سکھلا سکتے ہوں۔ اکثر استاد
کئی حرفے جانتے ہیں لیکن ایک جماعت کے تیس پینتیس لڑکوں کو سکھلانے میں انھیں بڑی دقت ہوتی ہے
اور اس اسکیم میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ کہ اتنے بچوں کو بیک وقت کوئی دستکاری کس طرح سکھائی جائے
اس کے متعلق تجربہ کے بعد ہی کوئی صورت تجویز کی جاسکتی ہے لیکن جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے ہیں انھیں اس
پر غور کرنا چاہئے کہ بچوں کو حرفہ کس طرح سکھلانا چاہئے اس لئے کہ بڑے طلبا کو کوئی دستکاری سکھانے کے
مقابلہ میں بچوں کو سکھلانا بہت دشوار کام ہے اور اس صورت میں جبکہ اس سے تعلیمی فائدہ بھی حاصل کرنا ہو
اگر تعداد کا مسئلہ نہ بھی ہو پھر بھی بچوں کو سکھلانے کا مسئلہ اپنی جگہ پر خود بھی بہت اہم ہے۔ دستکاری جاننے اور
بچوں کو سکھلانے کے ساتھ ساتھ اُستاد حرفوں سے جہاں تک ممکن ہو تمام مضامین کے پڑھانے میں مدد بھی
لے سکتا ہو۔ حرفوں کے کرانے میں جتنا تعلیمی کام ہو سکتا ہو اسے کرا سکتا ہو۔ حرفوں کے ذریعہ تعلیم بامعنی اور
بامقصد بنا سکتا ہو طلبا کو جتنی خوشی، جتنا حوصلہ اور جتنا جوش حرفہ کرنے میں ہوتا ہے وہی خوشی وہی حوصلہ اور
وہی جوش تعلیم کے حصول میں بھی پیدا کر سکتا ہو۔ حرفہ علیحدہ اور تعلیم علیحدہ کی صورت نہ پیدا ہونے دے بلکہ حرفوں
کو تعلیم کا ذریعہ بنا سکتا ہو۔ وہ محض تصورات کی دنیا میں نہ ہو کہ تمام تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہو رہی ہے حالانکہ
دراصل ایسا نہ ہو۔

سید احمد علی

# جامِ صہبائی

جب ظلمت غم سے روشنی ملتی ہے (۱) جب دردِ الم سے بے خودی ملتی ہے
اک یہ بھی مقام عشق ہے اے ہمدم! جب موت سے صبح زندگی ملتی ہے

یہ گردش صبح و شام ہے میرے لئے (۲) یہ محفل خوش نظام ہے میرے لئے
گلہائے بہار! مہر و ماہ و انجم! اے دوست یہ اہتمام ہے میرے لئے

دشت دو جہاں ہے میرے بڑھنے کیلئے (۳) ہے عرش کا بام میرے چڑھنے کیلئے
فطرت کا صحیفۂ مقدس اے دوست! ہر وقت کھلا ہے میرے پڑھنے کیلئے

حق کوش ہوں حق کی راہ پر جاتا ہوں (۴) دشوار گزار ہے، مگر جاتا ہوں
ہر گام پہ روکتا ہے باطل مجھ کو ٹھکرا کے اسے اثرؔ گزر جاتا ہوں

ہر گام پہ سنگ رہ پاتا ہوں اسے (۵) ٹھکرا کے مگر پرے ہٹاتا ہوں اسے
کر دیتا ہوں پاش پاش باطل کی چٹان یا ہو کے بلند پھاند جاتا ہوں اسے

اغیار سے بے نیاز کر دے یارب! (۶) کاسہ مرا تو آپ ہی بھر دے یارب!
بارِ غم دو جہاں اٹھا لوں ہنس کر وہ عزم وہ ہمتِ جگر دے یارب!

ہے تیزیٔ راہرو کو منزل کی تلاش (۷) بے تابی موج کو ہے ساحل کی تلاش!
ہر نقش کو کیوں مٹا رہی ہے؟ شاید فطرت کو ابھی ہے نقش کامل کی تلاش

ہستی میں یم وجود لہراتا ہے! (۸) تنکے کو گماں ہے اس سے ٹکراتا ہے!
فطرت کا تو کھیل ہے، مگر انساں کو فکر و غم ہست و بود کھا جاتا ہے!

اثرؔ صہبائی

# پیامِ زندگی

اُٹھ کہ پھر تاریکیٔ شب سے سحر پیدا کریں
موت کے سینہ سے ہستی کے شرر پیدا کریں

تلخیوں میں لذت شہد و شکر پیدا کریں
زہر میں پھر آبِ حیواں کا اثر پیدا کریں

پھر خس و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں
خاک بے مایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں

دل تو ہے یک قطرۂ خوں گرم، دل کی اصل کیا
رنگ خارا میں در آئے وہ نظر پیدا کریں

جس کی ضو سے جگمگا اٹھے شبِ تار حیات
توڑ کر مدہم ستارے وہ قمر پیدا کریں

جو نہ ہو منزل پہ قائم جو نہ ہو سمتوں سے قید
کارواں میں وہ نئی روحِ سفر پیدا کریں

نرم اور سنگین راہوں سے گذرنے کے لئے
آنکھ شبنم کی تو ہیرے کا جگر پیدا کریں

کوہ ٹکرا دیں جو حائل ہوں کشود کار میں
اس طلسمی گنبد بے در میں در پیدا کریں

لوچ میں موج نسیم اور کاٹ میں تیغ اصیل
مکتب نو سے وہ طفل با خبر پیدا کریں

دے سکے انسان کو ہر قید و غلامی سے نجات
ذہن کی نیکی ایسی اک نوع بشر پیدا کریں

زندگانی کی مسلسل چلچلاتی دھوپ ہیں
نزہت و رنگینیٔ موجِ گہر پیدا کریں

دم میں یہ سارا طلسم عہد حاضر ٹوٹ جائے
پنجۂ فولاد و ضرب کارگر پیدا کریں

سست بنیادوں کو ڈھا کر اس جہانِ خام کو
اک جہانِ دیگر و پائندہ تر پیدا کریں

سروش عسکری طباطبائی بی۔ اے لکھنوی

# خوابِ ہستی

وہ زمانے اور تھے جب تیرا غم سہتا تھا میں
جب ترے ہونٹوں کی رنگینی سے کچھ کہتا تھا میں
جب ترے بالوں سے گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا میں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یک بیک بجلی سی چمکی اور نشیمن لٹ گیا
تو نے برسوں جس کو سینچا تھا وہ گلشن لٹ گیا
تو نے موتی جس میں ٹانکے تھے وہ دامن لٹ گیا
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

تجھ کو جس دل سے محبت تھی وہ اب دل ہی نہیں
رقص جس کا تجھ کو بھاتا تھا وہ بسمل ہی نہیں
رنگ محفل تجھ سے کیا کہیے وہ محفل ہی نہیں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

اب نہ وہ شوقِ تصور، اب نہ وہ ذوقِ فغاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہدِ رفتہ کے نشاں
دھندلی دھندلی سی نظر آتی رہیں کچھ پرچھائیاں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یہ جوانی، یہ پریشانی، یہ پیہم اضطراب
بارہا انجمن میں دوڑا ہوں سوئے جامِ شراب
بارہا گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

رنگِ صہبا اور ہے صہبا کی مستی اور ہے
ذکرِ پستی اور ہے، احساسِ پستی اور ہے
خوابِ ہستی اور ہے تعبیرِ ہستی اور ہے
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

معین احسن جذبی

# غزل

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے

حسن ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اک واقعہ سا یاد دلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

دے کر خود اپنے ہاتھ سے اک درد لادوا
میری خودی کو ہوش میں لا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں میرے اوج کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغ حسن کی دکھلا کے وسعتیں
میری حدود شوق بڑھا کر چلے گئے

شکر کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا مجھ کو کیوں نہ بنا کر چلے گئے

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کیواسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

آئے تھے چشم شوق کی حسرت نکالنے
سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

اب کاروبار عشق سے فرصت مجھے کہاں
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

میری حیات عشق کو دے کر جنون شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

جگر مرادآبادی

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**سازو آہنگ** :- از مولنا سیماب اکبرآبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ قصر الادب آگرہ۔ سائز ۲۲×۱۷/۸ صفحات ۲۰۴
قیمت مجلد ۲؎ روپے۔ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مولنا سیماب کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کل نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں (۱) قومیت سیاست وطنیت (۲) مذہب اخلاق، معاشرت (۳) شعر و حکم (۴) معتقدات (۵) بچوں کے لئے۔

اب تک ہم مولنا سیماب کو محض غزلگو شاعر کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں اور وہ بھی پرانے اسکول کے یعنی جہاں الفاظ ہمیشہ معانی پر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ سیماب صاحب کے یہاں ان کی غزلیات میں یہ چیز بہت ملتی ہے۔ ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر پرانے اسکول کا کوئی شاعر نظم گو ہو جائے تو اس کا کیا رنگ ہوگا۔ جہاں تک قادر الکلامی، الفاظ کی نشست، قوافی کی درستگی، صناعی کا تعلق ہے مولنا سیماب اپنی مشق سخن کے باعث کافی اونچے درجوں پر پہنچ چکے ہیں۔ نظمیں انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھکر کہنا شروع کیں۔ اس میں انھوں نے پیامات بھی دیئے ہیں اپنے احساسات کی تیزی بھی دکھائی ہے۔ ہر قسم کی اور ہر رنگ کی نظمیں لکھی ہیں لیکن ابھی معانی پر سے وہ الفاظ کی چادر نہیں اٹھی ہے اقبال کی نقل ہے لیکن قابلیت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ پھر بھی ہم مولنا سیماب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا۔ نظمیں ان کی غزلوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ آئندہ بھی اگر آپ نظمیں لکھتے رہے تو امید ہے سوز و گداز بھی پیدا ہو جائے گا کچھ کام کی باتیں بھی کہہ سکیں گے اور ان کا وہ غزلوں والا تصنع اور خالی لفظی سجاوٹ بھلے کو دور ہو جائے گی۔ پیش نظر نظموں میں بعض بعض بہت اچھی ہیں امید ہے شائقین اس مجموعہ سے لطف اٹھائیں گے۔

**حیات و غزلیات غالب** (بزبان انگریزی) از عبداللہ انور بیگ ایم۔ اے" ایل ایل بی مطبوعہ اردو اکاڈمی لاہور، سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۸۰، قیمت ۸؎، کاغذ و طباعت بہت عمدہ (مع سہ تصاویر جو غالب

کے اشعار سے متعلق ہیں)

اردو اکاڈمی لاہور نے غالب کی زندگی اور کلام کو انگریزی داں طبقے میں اس کتاب کے ذریعہ روشناس کرانے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ ہمارے شاعری کے بہترین غزلگو شاعر سے غیر زبان والے بھی لطف لے سکیں۔ شروع میں جان کلایو روسے کا دیباچہ ہے۔ موصوف غالب کے کلام سے متاثر یا واقف نہیں معلوم ہوتے اکاڈمی مذکور کے خلوص نیت سے تو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا لیکن افسوس ہے کہ انور بیگ صاحب اس کار عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جہاں تک حیات غالب کے حصے کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ غالب نامہ کی بدولت انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور غالب کی زندگی اور ان کا زمانہ خاصی اچھی طرح پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کلام کے انتخاب اور ترجمے میں البتہ خامیاں ہیں۔ اول تو انتخاب میں صرف ان اشعار کو لینا چاہئے تھا جن میں مطالب کی خوبی ہے اور جن میں الفاظ کی صناعی ہے یا لفظی در و بست کی خوبی ہے یا وہ اشعار جو انھوں نے فارسی نما اردو میں لکھے ہیں انھیں ہاتھ نہ لگانا چاہئے تھا اور اگر ایسا کیا بھی تھا تو بالکل لفظی ترجمہ نہ ہوتا جس سے نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غالب کی طرف سے سوءظنی پیدا ہونے لگتی ہے۔ انتخاب میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ہم ترجمہ جن لوگوں کے لئے کر رہے ہیں ان کا مذاق شعری کیا ہے اور کس رنگ میں وہ چیزیں دیکھنے کے عادی ہیں۔ پھر غالب کے تخیل کو انھیں کے رنگ میں پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ وہ غالب سے لطف اندوز ہو سکیں مثال کے طور پر اس قسم کے اشعار نہ ہونا چاہئے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پانو ۔۔۔ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب ۔۔۔ تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

دوسری خرابی لفظی ترجمہ کی ہے۔ اول تو اس سے لطف آنا تو درکنار غالب کے معانی کا اندازہ ہی نہیں ہوتا شعر محض ایک چیستان معلوم ہوتا ہے اور بجائے حظ کے دردسر حاصل ہوتا ہے۔ ترجمہ اگر ایسا ہوتا کہ اچھی انگریزی کے ساتھ معانی کا لطف بھی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والے پر کھل سکتا تو غالب کی صناعی اور معنوی خوبیاں انگریزی داں طبقہ پر خوبی روشن ہو سکتی تھیں اور غالب کی قدر و قیمت بھی بڑھ سکتی تھی۔ بالکل لفظی ترجمہ کر دینے سے نہ تو غالب کے معانی کی خوبی ظاہر ہو سکی ہے نہ اس کی فن کاری۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے معانی جو کچھ

انگریزی ترجمہ سے ظاہر ہوئے وہ محض صفر ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

سبزہ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

تیسری بات یہ کہ صرف یہی نہیں کہ ترجمہ اور انگریزی اچھی اور شاعرانہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ ترجمہ صحیح نہیں ہو سکا ہے۔ کہیں الفاظ کا اور کہیں پورے مصرعہ یا شعر کا۔ مثلاً درج ذیل مصرعے اور اشعار کا ترجمہ مبہم اور غلط ہے۔

صـ ۸۵ — کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

صـ ۸۶ — سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری

صـ ۸۸ — دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار

صـ ۱۳۱ — تیری فرصت کے مقابل اے عمر

صـ ۱۳۴ — گرم تماشا ...............

صـ ۱۳۵ — وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — وغیرہ

غرضکہ اغلاط بہت کافی ہیں اور بالکل لفظی ترجمہ نے غالب کی اسپرٹ پر پانی پھیر دیا ہے۔ امید ہے اردو اکاڈمی آئندہ اڈیشن میں اس ظاہری خوبی کے ساتھ صحت اور ترجمہ کی خوبی کی طرف بھی بہت احتیاط برتیگی تاکہ غیروں کے ہاتھ میں ہماری جو چیز جائے وہ بہتر سے بہتر صورت میں ہو۔

**متاع حرم**:۔ از زیب عثمانیہ۔ ملنے کا پتہ کریمی دواخانہ۔ بازار شیخوپورہ لودیانہ (پنجاب) سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۴۳، قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی کی نظمیں عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ کی نظمیں اپنی سادہ بیانی اور پاکیزگی خیال کے باعث خاص اثر رکھتی ہیں۔ پوری کتاب باعتبار موضوع تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (۱) چمن گل (۲) نیستان نالہ (۳) خمخانہ مے۔ پہلے حصے میں چھوٹی چھوٹی ادبی نظمیں ہیں مثلاً پروانہ، سرو، لالہ، غنچہ وغیرہ دوسرے حصے میں اصلاحی نظمیں ہیں جو قوم کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ تیسرے حصے میں

عام تغزل کے رنگ کا کلام ہے۔ محترمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا شعر کوئی نہ کوئی نکتہ اپنے اندر ضرور لئے ہوئے ہوتا ہے کوئی نہ کوئی پیغام وہ ضرور دینا چاہتی ہیں۔ اقبال کا اثر اور تقلید ہر جگہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کلام تفریح یا دلچسپی کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے ہمیشہ اصلاح پیش نظر رکھتی ہیں۔ ان کا آرٹ ہمیشہ مقصد کے زیر تحت رہتا ہے اسی لئے زیادہ تر ان کا اسلوب ناصحانہ رہتا ہے۔ یہ چیز ایک شاعر کے لئے ناقص اور ایک مصلح کے لئے قابل تعریف ہے۔ اقبال کے آخری دور کے کلام کا اثر زیب صاحبہ نے زیادہ لیا ہے بہ نسبت ان کے ابتدائی کلام کے۔ اسی لئے شعریت ان کے یہاں کم ہے نصیحت زیادہ ہے۔ پھر بھی پختگی اور روانی کلام کو بلندی پر رکھتی ہے۔ جو قابل ستائش چیز ہے

**کملا**:۔ مترجمہ راجہ مہدی علی خاں۔ ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۲۳۱، قیمت مجلد عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول "بارواری" کا اردو ترجمہ ہے۔ 'بارواری' کی تیاری میں بارہ مختلف مصنفوں نے حصہ لیا تھا۔ ترجمہ آزاد صاف اور شگفتہ ہے۔ ناول کا پلاٹ ذرا پیچیدہ ہے اور کوئی ندرت نہیں لیکن جب زیادہ لکھنے والے ہوں تو عموماً ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ پھر بھی بنگالی ہندو سماج کے بعض بعض اچھے مرقعے ملتے ہیں۔

**ضیغم ایران رضا شاہ پہلوی**:۔ مرتبہ انعام اللہ خاں ناصر۔ ملنے کا پتہ کامل بکڈپو لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۰۳، قیمت مجلد عہ، کاغذ کتابت اور طباعت معمولی۔

افسوس ہے کہ رضا شاہی دور ایران میں ختم ہوگیا اور حکومت کی بےبسی اور بےچارگی تمام دنیا نے دیکھ لی۔ کہاں تک یہ بےچارگی بدانتظامی کا نتیجہ تھی یہ ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ مسلم ہے کہ رضا شاہ نے موجودہ ہوا کا رخ نہ پہچانا جس کی بدولت ملک کو غیروں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہونا پڑا حالانکہ موجودہ واقعات اس کتاب میں نہیں آسکے ہیں پھر بھی ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانے سے لے کر ۱۹۳۹ء تک کے حالات مختصراً دیدیئے گئے ہیں۔ ترتیب خاصی ہے عام معلومات کے لئے اچھی کتاب ہے

**دوسری جنگ عظیم**:۔ مرتبہ محمد مرزا دہلوی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

صفحات ۴۰۴، قیمت مجلد عہ، کاغذ کتابت اچھی، طباعت معمولی۔

محمد مرزا صاحب نے اس کتاب میں صرف موجودہ جنگ عظیم کے حالات ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ پہلی جنگ عظیم کے اسباب اور اس کے بعد کے اثرات کی بدولت یورپ کی سیاست کی جو حالت ہوگئی اور جن کے باعث موجودہ جنگ وقوع میں آئی۔ ان سب کا محاکمہ بڑی لیاقت سے کیا ہے جنگ اور اس کا پس منظر سمجھنے سے حالیہ حقیقتیں تمام روشن ہوجاتی ہیں۔ زبان وبیان کی پختگی اس کے علاوہ ہے

**خطوط غالب:۔** مرتبہ مہیش پرشاد صاحب۔ ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔ سائز ۲۶×۲۰/۱۶ صفحات ۴۸۰ قیمت للعہ مجلد صر، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

اب تک غالب کے خطوط محض دو جلدوں یعنی عود ہندی اور اردوئے معلٰے کے نام سے چھپے تھے لیکن ان میں بہت سے اغلاط تھے نیز ان میں تاریخیں موجود نہیں تھیں منشی مہیش پرشاد صاحب نے تمام وہ خطوط نیز نواب رامپور کے خطوط اس کے علاوہ جو مستند رسالوں میں نکل چکے ہیں اور جو کچھ اب تک شائع نہیں ہوسکے ان سب کو بڑی سعی اور کاوش سے تلاش کر کے مرتب کیا ہے۔ ہندوستانی اکاڈمی انھیں دو جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اس پر نظر ثانی عبدالستار صدیقی صاحب نے کی ہے اور انھوں نے بہت سے مفید حواشی اس پر اضافہ کئے ہیں۔ غالب کے خطوط اور لفافے کی عکسی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ مکاتیب غالب عرشی کے بعد غالب کے خطوط پر یہ دوسری مستند کتاب شائع ہوئی ہے جس پر مصنف اور ناشرین دونوں لائق مبارکباد ہیں۔

**آزادی ہند:۔** از مہاتما گاندھی ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو۔ ۴ کورٹ اسٹریٹ لاہور سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۱۴۲ قیمت ۶ر کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ کتاب دراصل انڈین ہوم رول کا ترجمہ ہے یعنی وہ مضامین ہیں جو گاندھی جی نے افریقہ میں لکھے تھے اور جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک میں مصروف تھے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں ہوچکا ہے حالانکہ اسے لکھے ہوئے کافی عرصہ ہوچکا ہے۔ پھر بھی سیاسیات ہند کے مطالعہ کرنے والوں کو اس میں انکے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں گی اور بہت اچھی چیزیں ملیں گی

**دکھی دنیا:۔** از راجگوپال صاحب اچاریہ۔ ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو، نمبر ۴ کورٹ اسٹریٹ لاہور۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۶ر کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

گاندھی سیوا آشرم کی یہ دوسری اشاعت ہے راجگوپال صاحب اچاریہ صرف سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تصنیف سے بھی شوق ہے۔ دکھی دنیا دراصل سات چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے جو کانگریس کے تعمیری پروگرام کی اہمیت اور ان کا اثر دکھانے اور پھیلانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ حالانکہ مصنف کا اسلوب تو ان میں نہیں آسکا پھر بھی اثر اور درد سے یہ ہماری زندگی کی کہانیاں خالی نہیں۔

**کیا خوب آدمی تھا:۔** ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲ر کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے "یاد رفتگاں" کے سلسلے میں متعدد تقریریں مختلف لوگوں سے کرائی تھیں۔ اسی سلسلہ کی گیارہ تقریروں کو حالی پبلشنگ ہاؤس نے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ جن مرحومین پر تقریریں کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا راشد الخیری، حالی، نذیر احمد، چکبست، داغ، پریم چند، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری، اقبال، سر راس مسعود۔ مولانا محمد علی۔ جن لوگوں نے تقریریں کیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ ملا واحدی۔ خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ مولوی عبدالرحمن۔ پنڈت کیفی۔ بیخود دہلوی جے نندر کمار حکیم ذکی احمد محمد غالب دہلوی۔ ممتاز حسین۔ خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبدالماجد۔

یہ تمام تقریریں باوجودیکہ مختصر ہیں لیکن مرحومین کی زندگی اور سیرت پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہیں۔ ناشرین کتاب گھر لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے یہ مفید و دلچسپ چیز طبع کر دی۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں ان ہی حضرات سے ان ہی مرحومین پر ذرا تفصیل سے یادگاریں لکھوانے کا التزام کیا جا سکے تو وہ اور بھی دلچسپ ہوگا کیونکہ ریڈیو پر وقت کا اختصار ہی کھول کر کہنے نہیں دیتا۔ دنیا فانی ہے کون کس وقت چل بسے کچھ اعتبار نہیں جبتک یہ بزرگ حیات ہیں ان کی یادداشت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

**یاد رفتگاں:۔** از خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ ملنے کا پتہ مٹیا محل دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۰ قیمت درج

نہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

خواجہ عبدالمجید صاحب دلی کے پرانے مشہور اور مستند صاحب قلم ہیں۔ آپ کی زبان خصوصاً ٹکسالی زبان ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں انشا پردازی اور دہلی کے محاورہ اور سلاست سے ایک عجیب رنگ دیدیتے ہیں آپ کی عمر چونکہ مختلف زمانوں سے گذر چکی ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے ہیں اس لئے آپ نے اپنی یادداشت سے یہ مختلف لوگوں کے حالات کا مجموعہ لکھا ہے یہ نہ صرف اپنی جگہ پر بہت دلچسپ اور مفید ہے بلکہ گذرے ہوئے لوگوں اور زمانہ کو ہم سے قریب کر دیتا ہے خواجہ صاحب کا اندازِ بیان طرفہ لذت دیتا ہے۔

فہرست نہیں دی گئی ہے لیکن عنوانات حسب ذیل ہیں۔ میر محبوب علی پاشا شاہ دکن۔ سر سالار جنگ اول۔ سر سالار جنگ ثانی۔ سر سید۔ شبلی۔ داغ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ حالی۔ نثر۔ عزیز۔ حکیم محمود خاں حکیم واصل خاں محسن الملک۔ وقار الملک وغیرہ۔

**شرح درد:۔** خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی۔ ملنے کا پتہ مٹیا محل دہلی سائز $\frac{22 \times 29}{16}$ صفحات ۲۱۳ قیمت عہ کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

کلیات درد کی صحیح طباعت کی اشد ضرورت تھی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ درد کے مشکل اشعار کی شرح بھی لکھدی ہے کیونکہ درد کا کلام زیادہ تر تصوف سے بھرا ہوا ہے اور اب تصوف کے سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ کم ہیں امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف طالب علموں کے لئے مفید ہوگی بلکہ اردو ادب سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے ایک تحفہ ہوگی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب کی زبان نے بھی شرح کو بہت شگفتہ بنا دیا ہے قابل مطالعہ چیز ہے۔

**ممالک اسلامیہ کی سیاست:۔** از عبدالسلام خورشید صاحب بی۔ اے۔ ناشر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، سائز ——— صفحات ۲۹۳ قیمت عمر کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

عبدالسلام صاحب نے ممالک اسلامیہ کی سیاست پر یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے لیکن موجودہ حالات اس میں نہیں آسکے ہیں اس کے علاوہ واقعات کا بعض احصا کر دیا گیا ہے۔ ان سے کوئی

نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے نہ کسی قسم کا محاکمہ ہو سکتا ہے۔ ویسے عام معلومات کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔

**دنیائے آرزو**:- از میرزا ادیب بی۔اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۲۸ قیمت عہ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ تین افسانوں کا مجموعہ تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں سے متعلق ہے جس میں ان کے درد بھری زندگی کے حالات ڈائری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ میرزا صاحب کے قلم میں زور ہے اس لئے ان کے یہ افسانے بغیر اثر کئے نہیں چھوڑتے۔ سرمایہ داری کی لعنتوں کے خلاف آج کل اردو کے جتنے ادیب قلمی بغاوت کر رہے ہیں ان میں میرزا صاحب کا بھی نام لیا جائے گا۔ باوجود میرزا کی ادیبانہ شگفتگی کے حقائق کی تلخی پوری طرح نمایاں رہتی ہے اور بعض بعض جگہ نفسیاتی مطالعے اچھے نظر آتے ہیں۔

**سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری**:- از علی عباس حسینی ملنے کا پتہ بھارگوا بکڈپو۔ امین آباد لکھنؤ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۸۸ قیمت عمر (دوسرا اڈیشن) کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

یہ حسینی صاحب کا ایک تخئیلی اور رومانی ناول ہے جو ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ نکلا تھا۔ "گذارش" میں خود حسینی صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اس میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ۱۹۱۹ء میں میرے سن کے اقتضا سے ہونا چاہئیں یعنی اس کا ہیرو پرانے قسم کا ہیرو ہے جو ہر جگہ اپنی جان دیدینے اور دوسروں کو بچانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ خود خوبیوں کا پتلا ہے۔ شجاعت اس کی کمزوری ہے۔ ایک حسینہ یا قاف کی پری کے عشق میں فرہاد کی طرح ناممکن سے ناممکن کام کے لئے تیار رہتا ہے آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔

زبان، جملوں کی ساخت اور طرز بیان حسینی صاحب کا محتاج تعارف نہیں۔

---

# رسید کتب

**غریبوں کی گائے** (تجارتی بکری خانہ) مرتبہ محمود مرزا صاحب قیمت ۴ر صفحات ۳۲ ادارہ تجدید علم حیدرآباد دکن

**ہندو مسلم اتحاد**:- از ستیہ بھگت۔ ستیہ آشرم وردھا، صفحات ۳۲ قیمت ۲ر

**دیش کی لیلا** (وطن کے متعلق اچھے گیت) از میاں عبدالمجید بھٹی۔ ہونہار بکڈپو ریلوے روڈ لاہور صفحات ۴۸ قیمت ۱۲ر

# ربط کا طریقۂ تعلیم

**نفسیاتی بنیاد** ہر تعلیمی نظام کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں۔ اول نصاب۔ دوم طریقہ۔ نصاب کا تعلق ماضی کی روایات، حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے تقاضوں سے ہوتا ہے اور طریقۂ تعلیم کا انحصار نصاب کی نوعیت کے ساتھ نفسیاتی تحقیق و انکشاف پر۔ چنانچہ جب بھی زمانہ کے ہاتھوں زندگی کا خاکہ بدلا تو بیدار قوموں نے نصاب میں بھی ترمیم و تنسیخ لازمی سمجھی اور اسی طرح جیسے جیسے انسانی ذہن کے متعلق ہماری معلومات حقیقت سے قریب پہنچتی گئیں ہمارا طریقۂ تعلیم بھی بدلتا گیا۔ نصاب چونکہ ایک قوم کی تاریخ سے وابستہ ہوتا ہے اس لیے اس میں حدود کو بعض اوقات کافی تنگ رکھنا پڑتا ہے لیکن طریقۂ تعلیم کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور انسانی فطرت ہر جگہ ایک واقع ہوئی ہے۔ اس لیے تعلیمی طریقے بنیادی طور پر زمان و مکان کی قید سے بے نیاز عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا کہ انسان کے جسم اور ذہن میں وہی رشتہ تصور کیا جاتا تھا جو انسان کے لباس اور جسم میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ لباس جسم کی حالت پر دلالت کر سکتا ہے اور نہ جسمانی حالت لباس کا تعین کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تپ دق کے ایک مریض کو ریشم کے کپڑے میسر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی صحت رکھنے والے جسم کو ڈھانکنے کے لیے چیتھڑے بھی نہ مل سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جسم اور ذہن دونوں کی تربیت کے لیے الگ الگ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اور ان تدابیر کی نوعیت خواہ وہ جسم کے لیے ہوں یا ذہن کے لیے ورزشی نوعیت ہوتی تھی۔ ذہنی تعلیم کے لیے جو نصاب تھا، وہ زندگی کی کسی غرض کو پورا نہیں کرتا تھا۔ اس کا مقصد ذہنی تربیت تھا۔ شعر و ادب کی تعلیم کا مدعا قوت متخیلہ و حافظہ کو اجاگر کرنا تھا اور ریاضی کا مقصد قوت استدلال کی نشوونما۔ گویا طالب علم ان مضامین کو اسی طرح اختیار کرتا تھا جس طرح آپ اپنے جبڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے ربڑ چبانا اختیار کر لیں۔

جسمانی تعلیم کا مقصد و مدعا وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے۔ ہم بھی ہمارے وقت سے پہلے اسے

ذہنی نشوونما میں مدد دینے کے خیال سے کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ چینیوں کے یہاں تو ساری تعلیم ذہنی تربیت کے لیے تھی اور وہ بھی یہ ادا لیے ہوئے کہ بچے بغیر سمجھے بوجھے عبارتیں ازبر کر لیتے تھے اور پھر کتاب بند کرکے استاد کے سامنے تیزی کے ساتھ دہرا دینا ہی اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے تھے گویا قوت حافظہ ان کے یہاں ذہانت و فراست کا پیمانہ تھی۔ یونانیوں کے یہاں البتہ نہ صرف ذہنی اور جسمانی تعلیم پر کسی قدر مساوی زور دیا جاتا تھا بلکہ ذہن اور جسم کے درمیان جو خلیج تھی اسے بھی بعض وقت پُر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ رقص کی ساری اہمیت یہ تھی کہ اس میں ظاہری حرکات کو اندرونی احساسات اور کیفیات کا ترجمان بنانے کا امکان تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر انھیں یونانیوں نے جسمانی تربیت کو ایک خالص جمالیاتی رُخ دیدیا۔ یونانی نوجوان جسمانی تربیت سے "اخلاقی خوبیاں" پیدا کرنے کے بجائے یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کے جسم ظاہری حسن و تناسب میں بس سانچے میں ڈھلی ہوئی چیزیں بن جائیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں تعلیم کی غرض و غایت "روحانی تربیت تھی اور گو اس کے ساتھ سینٹ بینیڈکٹ کے احکام کے مطابق سات گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام کا التزام تھا لیکن اس ہاتھ کے کام سے جسمانی نشوونما کے بجائے ذہن کو برائیوں سے محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ نشاۃ ثانیہ میں جسمانی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ پوپ ثانی کا فرمان تھا "تمھاری تعلیم کا یہ لازمی جزو ہوگا کہ تم کمان اور نیزے کا استعمال سیکھو، گھوڑے کی سواری، کودنا اور تیرنا جانو یہ چیزیں نہایت باعزت ہیں اور معلم کے دائرہ عمل سے باہر نہیں۔ چھوٹے بچوں کو کھیل بھی سکھائے جائیں اور یہ ان کے روزمرہ کے کام کا جزو ہونا چاہییں"۔ ہمارے زمانے سے قریب ترجان لاک یہ عقیدہ لے کر پیدا ہوئے تھے کہ "ایک صحیح ذہن ایک سالم جسم کے اندر ہی دنیا میں سب سے بہتر زندگی بسر کرنے کا مختصر مگر جامع اصول ہے"۔ لاک کا یہ عقیدہ یقیناً مستحسن تھا اگر وہ جسم اور ذہن کو ایک دوسرے سے اتنا بے تعلق نہ سمجھتے جتنا انھوں نے خود سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا۔ ان کے پاس دونوں چیزوں کے لیے الگ الگ نسخے تھے۔ لاک کا خیال تھا کہ جسمانی طاقت سختیاں برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن کی تربیت کا انحصار قوت استدلال پر ہے اور قوت استدلال کی تربیت کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ریاضی۔ خود لاک کے الفاظ ہیں "۔۔ میں نے ریاضی کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس سے ذہن میں قوت استدلال پیدا ہوتی ہے نہ اس لیے ہے کہ ہر ایک کو بڑا ریاضی داں بنانا

ہے۔ اس طرح اپنی قوت استدلال کو بڑھا کر جو اس مضمون سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ (طلبہ) دوسرے علوم میں بھی جب جب اس کا موقع آئے اُسے منتقل کر سکتے ہیں۔" لاک کو آج ہم سے رخصت ہوئے دو سو تینتیس سال گزر چکے۔ اس وقت سے اب تک زمانہ نہ جانے کتنی کروٹیں لے چکا۔ علم کی نہ جانے کتنی نئی شاہراہیں ہم پر کھل چکیں لیکن یہ لاک کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کے معتقدین نہ صرف آج تک زندہ ہیں بلکہ بعض جگہ بااثر حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک ٹریننگ اسکول میں "انچارج طریقۂ تعلیم اب بھی یہی پڑھاتا ہے کہ حساب کا مقصد قوت مدرکہ و متخیلہ و استدلالیہ کی نشوونما ہے۔" یہ ضرور ہے کہ یہ ٹریننگ اسکول ایک ریاست میں واقع ہوا ہے اور یہاں کا "انچارج طریقۂ تعلیم" آج سے پچیس تیس سال پہلے کا نارمل پاس ہے۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ابھی ابھی جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدما کے نزدیک جسم اور ذہن الگ الگ چیزیں تھیں چنانچہ تعلیم میں ایسے طریقوں کا فقدان نظر آتا ہے جو بیک وقت جسم اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے ضامن ثابت ہو سکیں۔ اس کے علاوہ ذہن کو مختلف قوتوں کا مجموعہ مانا گیا تھا جس کی رو سے نصاب کے مضامین کی تقسیم و تخصیص پیدا ہوئی اور سب سے زیادہ خطرناک وہم جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ایک ورق سادہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ تعلیم ہر اعتبار اور ہر پہلو ایک خارجی اور مصنوعی عمل تھا، اور ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ انسان کی ذہنی تربیت اور اس کی معقول پسندی کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کسی شخص کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملتا: "شریف النفس انسان پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے" کیونکہ ہر وہ شخص جو ریاضی کی مشق کے بعد قوت استدلال بڑھا لیتا معقول پسند اور شریف النفس بن جایا کرتا اور اس لیے نہ کبھی میں آپ کو ستاتا نہ آپ کو شکوہ ہوتا، نہ فرشتے میرا اعمالنامہ سیاہ کرتے، نہ حشر ہوتا، نہ آپ دادخواہی کرتے نہ مجھ کو ندامت ہوتی!

انسانی ذہن سے متعلق اس نفسیات کے مقابلے میں جدید نفسیاتی تحقیق بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارا موجودہ ماہر نفسیات بتاتا ہے کہ انسانی ذہن بنی بنائی قوتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سالم قوت ہے جو جسم کے ہر رگ و ریشے سے ظاہر ہو کر کام کرتی ہے۔ ہمارے جسم کی بالائی منزل اس قوت کا مرکز ضرور ہے لیکن اس کی ابتدا و انتہا نہیں ہے۔ اس لیے جسم اور ذہن کا رشتہ اس قدر قریبی سمجھا گیا ہے کہ ایک

کی صحت دوسرے کی صحت اور ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی مانی جاتی ہے۔ وہ چیز جو ہمارے سر میں قریب تین پاؤنڈ کا وزن رکھ کر قایم ہے اور جو دماغ کہلاتی ہے وہ چیز ذہن کی مشین ہے اور ذہن اسی مشین کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ بجلی کو آپ دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس کی جلوہ گری ہر جگہ بے حجاب ہے۔ اسی طرح ذہن دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اس کا عمل ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ بجلی کے نظام کے لئے مشین ضروری ہے۔ خراب مشین سے بجلی کی پیداوار اور اس کے نظام میں رکاوٹ اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی کمزوری ذہن کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وراثتی اثرات سے ماورا دماغ کی بہتر نشو و نما کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں سب سے پہلی چیز جو دماغ کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے وہ تو وہی ہے جو تمام جسم کے لیے ضروری ہے۔ یعنی اچھی غذا۔ جس طرح لو کے مارے ہوئے درخت سے اچھے پھل حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس جسم میں اچھے ذہن کی تلاش بھی فضول ہے جس پر غذا کی کمی کے صدمے گزر چکے ہوں یا گزرتے رہتے ہوں ایسے ذہن کی تربیت کے لیے خواہ کتنے ہی اچھے مواقع فراہم کیوں نہ کیے جائیں لیکن وہ کسی صحیح معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ دو اور چیزیں جو ذہنی نشو و نما کے لیے ضروری ہیں وہ بھی سامنے کی باتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹینس کھیلنے والوں کا دایاں ہاتھ ان کے بائیں ہاتھ سے کچھ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اچھا اس معنی میں کہ اس میں طاقت تو زیادہ ہوتی ہی ہے لیکن بناوٹ کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نشو و نما کے لیے استعمال لازمی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح دماغ بھی اپنی نشو و نما کے لیے استعمال کا محتاج ہے۔ دماغ کے مختلف مرکز مختلف حواس اور جسم کے مختلف حصوں کی فعالی کا نظام قایم رکھتے ہیں۔
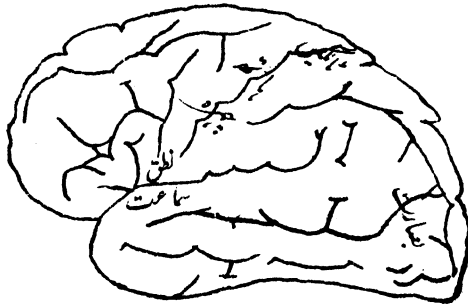
اس لیے مکمل طور پر نشو و نما پایا ہوا دماغ وہ ہی ہو سکتا ہے جس پر حواس نے بے روک ٹوک کام کیا ہو اور جس نے جسمانی اعضا سے بغیر تکلف کام لیا ہو۔ اور ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں نے زمین کے پامال ذروں سے لے کر آسمان پر چمکنے والے ستاروں تک ہر اس چیز کا جائزہ لیا ہو جو نگاہ کو دعوت رنگ و نور دے سکتی ہے۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کے کان فطرت کے سایے میں مدھم سے مدھم ترنم پیدا کرنے والے آبشاروں سے لے کر سمندر پر ہیبت ناک انداز میں کروٹیں لینے والی موجوں کے سامعہ پاش شور سے آشنا ہوں۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی حس شامہ زیادہ سے زیادہ مختلف القسم خوشبوؤں اور بدبوؤں سے دوچار ہوتی رہی ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کی زبان نے بے شمار چیزوں کا ذائقہ لیا ہو اور دماغ کے یہ مختلف مرکز ہی مل کر اچھا ذہن پیدا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شکل میں دماغ کے مختلف مرکزوں کا تعلق دیکھا جا سکتا ہے۔
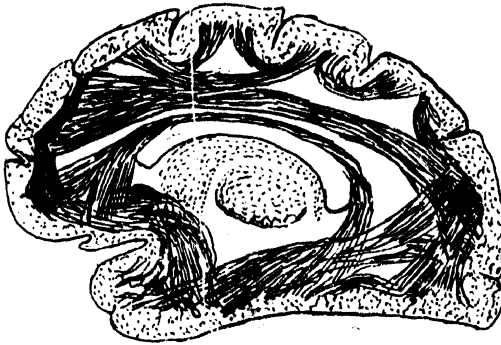
مادی دنیا اور انسانی دماغ کے درمیان حواس ایک کڑی کا کام کرتے ہیں۔ جس قدر مادی دنیا کے اثرات حواس کے ذریعہ دماغ پر پڑتے رہیں گے اسی قدر دماغ کی نشو و نما کے امکانات زیادہ ہوں گے دماغ کی مکمل نشو و نما میں اسی قدر اہمیت آزاد جسمانی فعالی کی بھی ہے۔

انسانی دماغ کا وہ حصہ جو تمام شعور کا مرکز ہے کورٹیکس (Cortex) کہلاتا ہے۔ یہ دماغ کا سب سے

اوپری حصہ ہے اور رنگ میں راکھ کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ ½ انچ سے ¼ انچ تک دبیز ہوتی ہے۔ ایک مکمل اور اچھے دماغ میں یہ تہہ پوری لمبائی چوڑائی میں یکساں دبیز ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم کسی ایسے شخص کے دماغ کا معائنہ کریں جو زندگی میں کسی ایک حس یا جسمانی فعالی کے کسی ایک مرکز کو استعمال نہ کر سکا ہو تو ہمیں اس کی کورٹیکس کا وہ حصہ جس کا تعلق اس حس یا جسمانی فعالی سے تھا باقی کورٹیکس کے مقابلہ میں کم دبیز ملے گا یہ دماغ نامکمل اور ناقص دماغ ہے اور اس کے ذریعے کام کرنے والا ذہن بھی ناقص ذہن ہے۔ پروفیسر ڈونلڈسن نے لورا برجمین ایک خاتون کے دماغ کا معائنہ کیا تھا۔ لورا عام بچوں کی طرح پیدا ہوئی تھی اور قریب تین سال کی عمر تک اس نے عام بچوں کی طرح زندگی بسر کی۔ اس کے بعد وہ ایک خطرناک بیماری کے باعث سماعت سے بالکل محروم ہو گئی اور اس کی بائیں آنکھ بھی جاتی رہی۔ بیماری کا اثر دائیں آنکھ پر بھی پڑا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اس کی یہ آنکھ بھی بے نور ہو گئی۔ لورا نے اس حالت میں زندگی کے ساٹھ سال گزارے۔ اس کی وفات کے بعد ڈونلڈسن نے اس کے دماغ کا معائنہ کیا تو اول تو اسے لورا کی پوری کورٹیکس عام دماغوں کی کورٹیکس کے مقابلے میں بہت پتلی ملی اور اس میں بائیں آنکھ سے متعلق کورٹیکس کا حصہ اس حصے سے اور بھی زیادہ پتلا ملا جس کا تعلق دائیں آنکھ سے تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادی دنیا اور حواس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بچے کو ان حرکات وسکنات کی آزادی ہو جو وہ حواس کے سلسلے میں بطور جوابی عمل کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کی زندگی میں قسم قسم کے رنگین کھلونوں کی، سیر و تفریح کی، میلوں تماشوں کی اور کھیل کود کی اہمیت صحت دماغی کی پہلی لیکن سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ دماغ کے مختلف حصے ریڈیو سٹ کے والیوز (valves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کے ریڈیو سٹ کے سب ویلوز ٹھیک ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام کر سکتے ہیں تو آپ کا ریڈیو سٹ آپ کی بے شک بہت عمدہ خدمت کرے گا۔ لیکن اگر اس میں ایک ویلو بھی خراب ہے تو وہ پورے ریڈیو سٹ کی عمدگی پر داغ لگا دیتا ہے۔ فطرت ہمیشہ انسان پر اعتماد کرنے سے زیادہ اپنے انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک حواس اور جسمانی فعالی کے ذریعہ دماغ کی نشوونما کا تعلق ہے۔ فطرت نے خود بچے میں چنچل پن کھیل کود اور چیزوں کو بنانے بگاڑنے کا رجحان اور جبلت پیدا کی ہے۔ بچہ خود بخود اپنی نشوونما کے لیے

غیر شعوری اور جبلی طور پر کوشش کرتا رہتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بعض ماں باپ یا استاد بچوں کو ان کے اس بنیادی کام میں مدد دینے کے بجائے الٹی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ دماغ بہت باریک باریک ریشوں سے بنا ہوا ہے۔ یہ ریشے نشو و نما کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیچے کی شکل میں نشو و نما پائے ہوئے اور نشو و نما نہ پائے ہوئے ریشوں میں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا ہوگا کہ انسان کی صحیح نشو و نما میں کیا عناصر بنیادی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ عناصر ایک مرتبہ پھر مجملاً عرض کر دوں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- اچھی غذا

۲- حواس کے استعمال کا موقع اور

۳- جسمانی فعالی کی آزادی۔

تعلیم کی آخری غرض و غایت چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح اور مکمل قسم کا انسان پیدا کرنا ہی ہو سکتی ہے اس لیے بہترین نظام تعلیم بھی وہی ہے جو جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کا ذریعہ بن سکے اور حقیقتاً ہماری تعلیم کا نیا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے نصب العین پر خیال و عمل کی قوتیں صرف ہونے لگی ہیں۔ جہاں پہنچ کر ہمیں یہ بات حاصل ہو جاتی ہے۔ وہیں ہماری منزل ہے۔ یہاں نصاب کے مضامین ایک دوسرے سے الگ الگ شمار ہونے کے بجائے ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں اور نتیجۃً ان مضامین کو پڑھانے کا کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں

جسمانی فعالی حواس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہے۔ جو طریقہ تعلیم ہمیں یہ چیز مہیا کر دے۔ وہی ربط کا طریقہ تعلیم ہے۔ آج ۱۹۴۱ء میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سہولتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہے کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کسی صبح اٹھے ہوں اور یہ بات الہام کے ذریعہ ہم میں سے کسی پر وحی کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین آثر ایم۔ اے

# ہماری آبادی

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۳۸،۸۹،۹۷،۹۵۵ نفوس تھی اور خیال ہے کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرایع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک مہیا کر سکے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

کیا اضافہ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے یا بلائے بے درماں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہے؟ — ان سب سوالات کے مختلف الخیال لوگوں کی جانب سے مختلف جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے اور ہمارا افلاس، قرض، خرابیِ صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر ہے۔ اس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی، محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی۔ بالخصوص حکومت اس خیال کی طرفدار ہے اور اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دلیل بناتی ہے۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈر ہیں اور ان کے دوسرے ہمنوا ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بُری حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو "اپنی کہانی" میں

جسمانی فعالی حواس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہے۔ جو طریقہ تعلیم ہمیں یہ چیز مہیا کر دے۔ وہی ربط کا طریقہ تعلیم ہو۔ آج سنہ ۱۹۴۱ء میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سہولتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہو کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہو کہ ہم کسی صبح اُٹھے ہوں اور یہ بات الہام کے ذریعہ ہم میں سے کسی پر وحی کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین آثر ایم۔ اے

# ہماری آبادی

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے۔ گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۳۸۸۹۹۸۰۰۰ نفوس تھی اور خیال ہے کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرائع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک مہیا کر سکے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

کیا اضافہ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہے؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے یا بلائے بے درماں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہے؟ — ان سب سوالات کے مختلف الخیال لوگوں کی جانب سے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے اور ہمارا افلاس، قرض، خرابیٔ صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر ہے۔ اس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی۔ محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی۔ بالخصوص حکومت اس خیال کی طرفدار ہے اور اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دلیل بناتی ہے۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈر اور ان کے دوسرے ہمنوا ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بُری حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کہانی میں

لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں ابھی خوراک کی کمی نہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہوگیا ہے لیکن خوراک کی رسد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے اور آبادی کے اضافہ سے بڑھ کر اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ دس سال کے سوا یہ اضافہ اکثر مغربی ممالک کی کے اضافہ سے کہیں کم ہے۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو گروہوں میں کون سچا ہے؟ دراصل غلطی دونوں کی ہے۔ موخر الذکر گروہ کا یہ خیال کہ ہندوستان کی آبادی زائد از ضرورت نہیں۔ دلائل اور اعداد و شمار سے ابھی غلط ثابت کیا جائیگا ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری زیادہ آبادی نے معاشی پستی پیدا نہیں کی بلکہ یہ پستی نتیجہ ہے حکومت برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش کا۔ حکومت کی روش کی تفصیل اس مقام پر غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیوں، حکومت برطانیہ کے مضرت رساں طرز عمل اور حکومت ہند کی لاپرواہی اور سرد مہری کی طویل داستان بیان کرنی پڑے گی۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح اضافۂ آبادی سے معاشی پستی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خوش حالی سے مفلسی کی جانب معاشی حالت کا زوال بھی خود بخود زائد از ضرورت آبادی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ معاشی حالت کے گرنے اور وسائل معاش کے مفقود ہونے سے آپ ہی آپ آبادی کا ایک کثیر حصہ بیکار ہوگیا۔

لیکن اتنا کہہ دینے سے آبادی کے مسئلے کا صحیح اور قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستانی آبادی کے رجحانات کی تحقیق کرنی ہوگی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان رجحانات میں زائد از ضرورت آبادی کی کون سی علامات پائی جاتی ہیں۔ کثرت آبادی سے مراد آبادی کا متوازن حد سے بڑھ جانا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے زرعی ملک میں فی مربع میل زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک سو پچانوے آدمی فی مربع میل بستے ہیں کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آبادی گنجائش سے کم ہے۔ ایسا ہو سکتا اگر ہندوستان کی زراعت کی حالت اچھی ہوتی۔ مسٹر ایٹ کا خیال ہے کہ ایک شخص کے گزارے کیلئے کم از کم ۲½ ایکڑ زمین ہونی چاہیئے۔ یو۔ پی کے متعلق ڈاکٹر اسٹلے نے اندازہ لگایا ہے کہ اعلیٰ

معیارِ رہایش برقرار رکھنے کے لیے ہر زرعی گھرانے کے پاس تیس ایکڑ رقبہ ضرور ہونا چاہیئے ان اعداد کا جب ہم ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے کسان کے پاس ضروریات سے بہت کم رقبہ ہے۔ بنگال، بہار واڑیسہ، یو۔پی اور مدراس میں فی کس رقبہ کاشت ایک ایکڑ سے بھی کم ہے سی پی اور بمبئی اور پنجاب میں یہ رقبہ ایک اور دو ایکڑ کے بین بین ہے ان اعداد و شمار سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں زمین پر آبادی کا ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے۔ یو پی کی بنکنگ انکوائری کمیٹی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی بارش کے موسم میں بھی صرف ۵۲ فی صد کسان اپنی تمام ضروریات مہیا کر سکتے ہیں کیا یہ زائد از ضرورت آبادی کی علامت نہیں؟

اضافہ آبادی کا اندازہ شرح پیدایش اور اموات کے مقابلے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی ملک کی شرح پیدایش اور شرح اموات دونوں بڑھی ہوئی ہوں تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف شرح اضافہ سے کثرت آبادی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اگر شرح پیدایش اور شرح اموات میں برابر کی کمی یا زیادتی ہو تو شرحِ اضافہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا ممکن ہے کہ کسی دو ملکوں کی شرحِ اضافہ تو یکساں ہو لیکن شرح پیدایش اور شرح اموات ایک میں زیادہ ہوں تو دوسرے میں کم۔ اس لیے اضافۂ آبادی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے یکساں شرح اضافہ سے ہرگز دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔

ہندوستان کی شرح پیدایش و نیز شرح اموات بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اور عرصہ سے اس میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا ۱۹۰۱-۱۰ء میں ہندوستان کی شرح پیدایش ۳۵،۹ اور شرح اموات ۲۷،۴ تھی اور ۱۹۳۱-۳۵ء میں یہ شرحیں علی الترتیب ۳۴،۳ اور ۲۳،۸ ہو گئیں ہیں پنڈت جواہر لال صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انیسویں صدی میں یورپی ممالک کی شرح اضافہ ہندوستان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور بیسویں صدی تک وہ برابر بڑھتی چلی گئی لیکن بیسویں صدی سے اس میں نمایاں کمی ہونے لگی لیکن ہندوستان کی حالت بالکل برعکس ہے اور بیسویں صدی میں ہماری شرح اضافہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔

دراصل انیسویں صدی میں چند غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا

جاتا ہے ورنہ ہندوستان میں اضافہ آبادی کا رجحان جب بھی پایا جاتا تھا۔ یورپ میں اس زمانے میں سائنس کی ترقیات روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نئے نئے ذرایع معاش پیدا ہو رہے تھے۔ نو آبادیاں بسائی جا رہی تھیں۔ غرض یہ کہ آبادی کے بڑھنے کے بے انتہا مواقع حاصل تھے لیکن بیسویں صدی میں حالات اتنے موافق نہ رہے۔ نو آبادیوں میں گنجایش بہت کم رہ گئی یورپ کے ستائے ہوئے ممالک کو بھی ہوش آنے لگا اور انھوں نے معاشی ترقی کے لئے جان توڑ جدوجہد شروع کر دی۔ یورپ میں خود کفالتی کے چرچے ہونے لگے اور لوگوں میں آبادی گھٹانے کا رجحان پیدا ہو گیا ادھر تو یہ سب کچھ ہوا اُدھر ہندوستان میں انیسویں صدی میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی غلامی بھی پھیلی۔ ملک کی زراعت اور صنعت، سب تباہ ہو گئی۔ قحط پہ قحط پڑے۔ بیماریاں پھیلیں۔ دبائیں آئیں۔ غرض یہ کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ آبادی میں نمایاں اضافہ نہ ہو سکا لیکن جب بیسویں صدی میں بالخصوص گزشتہ دس پندرہ سال میں چین نصیب ہوا تو شرح اضافہ پھر بلند ہو گئی اور آج یورپ کے اکثر ممالک سے بلند ہے۔ خیال ہے کہ ۱۹۳۱ء کے بعد سے ہماری آبادی پچاس لاکھ سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بیسویں صدی کے ختم ہونے تک ہندوستان کی آبادی ستر کروڑ ہو جائے گی۔ کیا یہ حالت خطرناک اور اندیشہ انگیز نہیں ہے؟ اور وہ بھی جب کہ ہمارے پاس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی ذرایع معاش نہیں ہیں اور تخفیف آبادی کے رجحانات عنقا ہیں۔

اخلاقی ضبط ہمارے یہاں نہیں، کم سنی میں شادیاں ہو جاتی ہیں۔ مذہبی رسم و رواج ہیں کہ شادی کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیا یہ سب چیزیں اضافۂ آبادی کے رجحانات کو ظاہر نہیں کرتیں؟ ممکن تھا کہ افلاس اور بیماری آبادی کو محدود کر دیتے لیکن مذہبی رسوم۔ ضبط تولید کی غیر مقبولیت اور پست درجے کے معیار رہایش کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہماری نوّے فی صد آبادی فاقہ کشی کی درد انگیز مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔

ہندوستان کے اضافۂ آبادی کو خوش آمدید کہنے والے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعت اور زراعت، دونوں میں محنت کی قلت کا محسوس ہونا آبادی کی کمی کا ثبوت ہے لیکن واقعہ

اس کے برخلاف ہے۔ بے شک فصل کاٹنے کے زمانے میں محنت کی طلب بڑھ جاتی ہے لیکن اس کے بعد مزدور بیکار رہتا ہے۔ بہت سے دیہاتی شہروں میں جا بسے ہیں اس لیے بھی فصل کے وقت محنت کی قلت ہوتی ہے۔ جو علاقے شہروں سے دور ہیں وہاں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ بنا بریں یہ کہنا غلطی ہے کہ ہر مقام پر اور ہر وقت ہندوستان میں محنت کی قلت رہتی ہے۔ صنعت میں جو محنت کی قلت پڑ جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مزدور کو گاؤں سے شہر میں نقل مکان کرنا دشوار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں صنعت میں جو قلت پیدا ہوتی ہے وہ با مہارت محنت کی ہے۔ اس لئے صنعت میں محنت کی قلت کو دور کرنے کا طریقہ اضافہ آبادی نہیں بلکہ با مہارت مزدوروں کی تربیت ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ ہمارے سامنے خوراک اور آبادی کے تناسب کا ہے۔ ضروری ہے کہ ملک میں آبادی کی ضروریات کے لائق اچھی خوراک موجود ہو۔ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر شاہ اور کھمبتا نے اس بارے میں تحقیقات کی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت سے چالیس فی صدی کم غذا نصیب ہوتی ہے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے ۳۶-۱۹۳۵ء تک کے عرصہ میں آبادی میں اکیس فی صدی اور اجناس خوردنی کے رقبہ زیر کاشت میں صرف ۱۲،۴ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے بیرونی ممالک سے ہندوستان میں اجناس خوردنی کی درآمد بڑھ رہی ہے۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی کا خیال ہے کہ ہندوستان میں صرف اٹھاسی فی صد آبادی کی ضرورت کے لائق غذا پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ غذا کی رسد ضرورت سے کم ہے جو کثرت آبادی کی اہم نشانی ہے اور جب تک اس صورت حال کی اصلاح نہ کی جائے ملک پنپ نہیں سکتا۔

مسئلہ آبادی کا حل | خوراک کی کمی کیونکر دور کی جائے اس مسئلہ کے حل پر وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر پیش کی جاتی رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیونکر آبادی اور ذرائع معاش میں توازن قائم کیا جائے؟ اس کا حل تین طریقوں سے ہو سکتا ہے؟ یا تو ذرائع معاش کو موجودہ آبادی کی ضروریات کے مطابق بڑھا لیا جائے اور ان میں اتنی لچک بھی رکھی جائے کہ وہ اضافہ آبادی کے تناسب سے بڑھتے رہیں۔ یا پھر آبادی کو اتنا گھٹا دیا جائے کہ وہ خود بخود ذرایع معاش سے متناسب ہو جائے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں طریقوں پر

ایک ساتھ عمل کیا جائے۔ ذیل میں ہم ان کی مختصر کیفیت درج کرتے ہیں۔

ذرائع معاش کو وسیع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ملک میں خوراک کی رسد بڑھا دی جائے۔ اس وقت ملک میں خوردنی اور غیر خوردنی اجناس کا تناسب ۸۲ اور ۱۸ فی صدی ہے۔ غیر خوردنی اجناس چونکہ زیادہ منافع کی امید دلاتی ہیں اس لیے عموماً اچھی زمین پر کاشت کی جاتی ہیں۔ اگر غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دی جائے تو خوراک کی رسد میں ۱۸ فی صدی اضافہ کا امکان ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دینے کے بعد کسان لازمی طور پر خوردنی اجناس کی کاشت کرنے لگے؛ دراصل غیر خوردنی اجناس کی کاشت کی ضرورت اسے اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی کاشت کی بدولت وہ زمیندار اور سرکار کے مطالبات ادا کرتا ہے۔ اگر وہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دے تو زمیندار اور حکومت کے مطالبات کہاں سے ادا کرے۔

ایک دوسری تدبیر غذا کی رسد کو بڑھانے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غذا کی برآمد بند کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں خوردنی اجناس کا کوئی بہت زیادہ حصہ برآمد نہیں کیا جاتا اور آج کل تو خوردنی اجناس کی برآمد روز بروز کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ نیز اس تدبیر میں برآمد کو روکنے سے جو بیرونی مخالف اثرات پڑیں گے ان کے برداشت کرنے کے لیے ہمیں تیار ہونا چاہیئے۔ خوردنی اجناس کی برآمد بند کر دینے سے یہ خطرہ ہے کہ کسان ان کی جگہ مزید تجارتی غیر خوردنی اجناس کی کاشت شروع کر دے اور خوردنی اجناس کی رسد میں معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بیرون ملک سے خوردنی اجناس حاصل کریں۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے غذا کی درآمد برابر بڑھ رہی ہے لیکن اس طریقہ میں نہ تو زیادہ توسیع کی گنجایش ہے اور نہ خود کفالتی کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ اطمینان بخش ہی ہو سکتا ہے۔ ہماری قوت خرید کم ہے۔ درآمد شدہ غذا کے بدلے میں اور ملکوں کی طرح ہندوستان کے پاس پیسہ بھی نہیں۔ ہندوستان انگلستان کا قرضدار رہا اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے خام پیداوار اور اجناس خوردنی برآمد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ طریقہ زیادہ وسعت کا حامل نظر نہیں آتا۔ اگر دوسری اصلاحی تدابیر سے ہماری خریدنے کی قوت بڑھ بھی جائے تو بھی اس طریقے

کی سفارش نہیں کی جاسکتی کیونکہ جنگ کے تجربوں نے ہمیں بتا دیا ہو کہ غذا کے لیے دوسروں کا دست نگر ہونا کیا معنی رکھتا ہو۔

شاید سب سے کامیاب تدبیر غذا کی رسد بڑھانے کی "اصلاح زراعت" ہو۔ اس مہتم بالشان کام کے لیے ہمیں زراعت کے تمام مسائل جیسے آب پاشی تقسیم اور انتشار اراضی، طریق زراعت اور آلات زراعت کی اصلاح اور زرعی قرضے وغیرہ کی کل مشکلوں کو حل کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے روپیہ اور ہمت و نیز خلوص اور ہمدردی کی ضرورت ہو لیکن اسے سرانجام دیا جا سکتا ہو اور اس کی تکمیل سے ہماری آبادی کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑی مایوسی اور افسوس ہوتا ہو کہ ہمارے کسانوں کو جدید ترقیات سے روشناس کرانے کی رفتار بہت سست ہو اور جہاں کہیں بھی جدید ترقیات کا پرچار کیا جاتا ہو وہاں انھیں کسان کی دسترس میں لانے کی سعی پوری طرح نہیں کی جاتی۔ تعلیم یافتہ طبقے کو سرکاری دفتروں کی خاک چھاننے کی ایسی بری عادت پڑ گئی ہو کہ باوجود ناکامی کے وہ زراعت یا صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ غضب تو یہ ہو کہ کسان کا لڑکا بھی پڑھ لکھ کر زراعت سے متنفر ہو جاتا ہو۔ زراعت اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری کثیر زرعی آبادی اسی لیے مصیبتیں جھیل رہی ہو۔

آبادی کا پیشوں میں ٹھیک تناسب سے تقسیم نہ ہونا بھی بہت سی مشکلات کا باعث ہو۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۶۷ فی صد آبادی زراعت میں مشغول ہو اور بمشکل ۱۰ یا ۱۱ فی صد صنعت و حرفت میں اور ان میں سے بھی محض ایک فی صد اعلیٰ پیمانے کی جدید صنعتوں میں مشغول ہو۔ زراعت پر آبادی کا غیر ضروری دباؤ ہو اگر اس زائد بار کو ہٹا دیا جائے اور آبادی پیشوں میں صحیح تناسب سے تقسیم ہو سکے تو یقیناً آبادی کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہو۔ ملک میں قدرتی عطیات کی کمی نہیں۔ اگر سرمایہ اور مہارت کی ضروریات پوری طرح مہیا ہو جائیں تو صنعتوں کی ترقی کے لیے وسیع میدان موجود ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ کھٹکا بھی لگا ہوا ہو کہ کہیں ہم کو بھی یورپ اور امریکہ کی طرح

صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مشکلات کا شکار نہ ہونا پڑے۔ باوجود اس کے کہ انگلستان اور امریکہ میں صنعتی ترقی انتہا کو پہنچ گئی ہو وہاں کی کثیر آبادی کا گزارا پیمانہ کبیر کی صنعتوں پر نہیں اور بیکاری کی لعنت وہاں بھی پائی جاتی ہو۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہو کہ جدید سائنسی صنعتی نظام میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ روزگار میں اُس مناسبت سے اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سرمایہ داروں کا نظام چند خوش نصیبوں کی مدد کرتا ہو۔ بڑی بڑی مشینیں اور کلیں سیکڑوں آدمیوں کا کام انجام دیتی ہیں۔ اعلیٰ پیمانے کے انتظام کی بدولت مزدوروں کی اور بھی بچت ہو جاتی ہو۔ یہ بھی ناممکن ہو کہ ہندوستان اپنی تمام مصنوعات کو خود صرف میں لاسکے کیونکہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد جو اندازہ لگایا گیا تھا اس سے پتہ چلتا ہو کہ صرف نوے فی صد آبادی مصنوعات خریدنے کی استعداد رکھتی ہو۔ ملک کی آبادی میں ہر سال ایک فی صدی اضافہ ہوتا رہتا ہو جس کا لحاظ کرتے ہوئے صنعتی پیداوار کی مقدار دوگنی بھی کر دی جائے تو بھی صرف اسی اضافہ شدہ آبادی کے لئے روزگار فراہم ہو سکے گا۔ پھر ہر سال صنعتی پیداوار کو دوگنا کرنا بھی جوئے شیر لانا ہو۔ بالفرض اگر ہندوستان اس میدان میں اتنی ترقی بھی کرلے کہ تمام آبادی جدید صنعتوں میں مصروف ہو جائے تو پیداوار اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کھپت ناممکن ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہو کہ ہم اپنے ملک میں بیرونی مصنوعات کی درآمد بالکل بند کر دیں اور ہندوستان کو محض ایک برآمد کرنے والا ملک بنا دیں۔ واضح رہے کہ آج کل تجارت مبادلہ اشیا کے اصول پر چلتی ہو اگر آپ کے ملک میں بیرونی اشیا کی درآمد نہ ہوگی تو آپ بھی اپنی اشیا برآمد نہ کر سکیں گے۔ پھر آج کل خود اکتفائی کے جو چرچے ہو رہے ہیں اور غیر ملکی اشیا کے ہر ملک میں نئے نئے بدل تلاش ہو رہے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے اس قسم کی توقع کرنا عبث ہو

چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی ترقی کے یہ معنی نہ لیے جائیں کہ ہم بڑے پیمانے کی صنعتوں کو بالکل ہی بند کر دیں گے البتہ ان کو ناگزیر حدود تک محدود کر دینا ہوگا۔ وہ جاری رہیں گی مگر ان کو یہ موقع نہ دیا جائے گا کہ چھوٹی اور متوسط پیمانے کی صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مفاد کو کسی قسم کا گزند پہنچائیں۔ برطانیہ کے عمل دخل سے پہلے ہندوستان اپنی بیشتر ضروریات کے لیے خود مکتفی رہا ہو جس کا سبب چھوٹی اور متوسط

صنعتوں کا رواج تھا۔ آج بھی اگر چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی طرف پوری توجہ دی گئی تو اس پست حالی کا خاتمہ مشکل نہیں۔ ضرورت ہے کہ ان صنعتوں کے لیے منظم اور باقاعدہ بازار فراہم کیے جائیں اور ان کی فروخت منظم طریقے پر ہو۔ جاپان میں موزہ بنیان وغیرہ کے کام نے منظم پیدایش اور فروخت کی بدولت اتنی شاندار کامیابی حاصل کرلی کہ لدھیانے میں غیر منظم پیدایش اور بے قاعدہ فروخت کی وجہ سے اس کے کام کو جاپان کی سی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

کسی ملک کی آبادی کو اثر انداز کرنے والی ایک چیز نقل وطن بھی ہے۔ نقل وطن سے آبادی کم ہوتی ہے انیسویں صدی میں نوآبادیات میں توطن کی بدولت یورپ میں آبادی کے لئے بہت کافی گنجایش نکل آئی تھی ہندوستان والوں کے لیے نقل وطن کے امکانات زیادہ وسیع نہیں۔ کچھ تو ذات پات کے طریقے کی وجہ سے ہندوستانی کو غیر ذات والوں کے ساتھ رہنے سے آرام نہیں ملتا۔ کچھ رسم ورواج اور مذہبی خیالات بھی نقل وطن کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر ہمارے ملک کا عام پیشہ زراعت بھی اس قسم کا ہے کہ اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آج کل صرف ۲۵ لاکھ ہندوستانی بیرونی ممالک میں بستے ہیں۔ اکثر ممالک میں ہندوستانیوں کے داخلہ پر پابندیاں لگائی جارہی ہیں۔ خود حکومت نے ۱۹۳۸ء میں ایک بل پاس کیا جس سے ملایا میں ہندوستانیوں کا نقل مقام تقریباً ناممکن ہوگیا۔ ملک کے باہر نقل مقام روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے لیکن اب بھی کچھ عرصہ تک برما اور سیلون میں ۱۴۰۰۰ آدمیوں کے لیے گنجایش موجود ہے۔ علاوہ ازیں برٹش گیانا میں بھی کافی آبادی کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ وہاں کی موجودہ آبادی ۳۰۴۰۰۰ نفوس ہے۔ اور اس سے کئی گنی زیادہ آبادی سماسکتی ہے۔ ۱۹۲۲ء کے قانون نقل وطن میں یہاں ہندوستانیوں کو بسانے کی اسکیم بھی بنائی جاچکی ہے مگر ابھی تک اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی

ادھر اندرون ملک بھی آبادی کا مختلف علاقہ جات میں توازن قائم کیا جاسکتا ہے۔ آسام اور سی۔ پی میں دوسرے صوبوں کی زائد از ضرورت آبادی کی اچھی خاصی تعداد کھپ سکتی ہے۔

اگر ذرائع معاش کے ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھتی رہے اور آبادی کا یہ اضافہ ذرائع معاش کے اضافے سے زیادہ یا متناسب ہو تب بھی ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ انتہائی ضروری ہے کہ

آبادی سواضافہ کے رجحانات کو کم کر دیا جائے اور موانعات اتناعی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے سماجی رواج اور مذہبی عقاید جلد شادی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ہماری آبادی کا معیار رہایش اس قدر پست ہے کہ بہت جلد اسے حاصل کر لیتا ہے جس کے بعد فطری طور پر اسے شادی کی ترغیب ہوتی ہے۔ دیر سے شادیاں ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہیں۔

بہی خواہان ملک کا پہلا فرض ہے کہ اس خراب حالت کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں۔ رسم و رواج اور مذہبی خوش اعتقادیوں کے اس طلسم کو توڑ دیں۔ ملک کی دولت میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اعلیٰ معیار رہایش حاصل ہو نشر و تبلیغ کی مدد سے اخلاقی ضبط پیدا کیا جائے۔ لوگوں میں صحیح قسم کی تعلیم پھیلائی جائے تاکہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے

وہ زمانہ اب گزر چکا جب ضبط تولید کی حمایت میں پمفلٹ شائع کرنا جرم خیال کیا جاتا تھا۔ تاریخ رچرڈ کارلائل کی ممنون ہے کہ اس نے ضبط تولید پر اظہار خیال کی پابندیاں اٹھوا دیں۔ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ضبط تولید کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ ضبط تولید کی تحریک کا یہ پہلو بھی کچھ کم قابل غور نہیں کہ اس کا رواج امرا میں زیادہ ہے جن کی قوت تولید پہلے ہی گھٹی ہوئی ہے۔ عوام کی معاشی حالت انھیں اجازت نہیں دیتی کہ ضبط تولید کے قیمتی آلات استعمال کریں لیکن سائنس کی ترقی کی بدولت اچھے اور بے ضرر طریقے ضبط تولید کے رائج ہو چکے ہیں اور وہ عوام کی دسترس سے باہر بھی نہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے ضبط تولید کو برا بتایا جاتا ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنیئے۔ نومبر ۱۹۳۱ء کے رسالہ "الحکیم" میں ڈاکٹر اقبال مرحوم رقمطراز ہیں۔

"اگر حفظ نفس مقصود نہ ہو، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضا مند ہوں تو جہاں تک میرا علم راہ نمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں"

اسی رسالہ میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔

"بلاشبہ ضبط نفس اصل آئیڈیل ہے لیکن معلوم ہے کہ وہ عملاً چل نہیں سکتا۔ کم از کم اس وقت

تک کاانسانی تجربہ یہی ہے ایسی حالت میں جو لوگ طبی، منزلی، خاندانی، اجتماعی اور اقتصادی مقتضیات پر زور دیتے ہیں یقیناً ان کے دلائل کی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

کہا جاتا ہے کہ ضبط تولید سے لوگوں کو اپنے اخلاقی جرائم کے چھپانے کا موقع مل جائے گا اور ان میں بداخلاقی پھیلے گی لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سوسائٹی ان تمام مفید کاموں کو ترک کر دے جن کا بعض لوگ غلط طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ضبط تولید بذریعہ ضبط نفس کیا جائے اور اس صورت میں کوئی اخلاقی جرم عائد نہ ہوگا۔

جب علامہ اقبال مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ٹیگور (آنجہانی دخط بنام مارگریٹ سینگر از کتاب "ضبط تولید کے لیے میری جد وجہد") اور مسز سروجنی نائیڈو (تقریر مستورات کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۳۵ء) جیسی مقتدر ہستیاں ضبط تولید کی موافقت میں رائے دے چکی ہوں اور ملک کے حالات کا تقاضا بھی یہی ہو تو ضبط تولید کو ملک میں مقبول کرانے کی سرتوڑ کوشش کرنی چاہیئے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعہ عوام میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہ کیا جائے۔ ہماری تعلیم بھی اس قسم کی ہونی چاہیئے جو ذہنی قوتوں کے ساتھ عمل کی طاقت کو بیدار کر سکے تاکہ پڑھ لکھ کر ہم روزگار سے لگ سکیں نہ کہ ملک کی آبادی میں پڑھے لکھے بیروزگاروں کا اضافہ کریں۔

وقت کی پہلی ضرورت ہے کہ حکومت اور ملک کے بہی خواہ تن من سے آبادی کے نازک مسئلے کو حل کریں۔ جب تک ان تمام تدابیر پر بیک وقت پوری قوت کے ساتھ عمل نہ کیا جائے گا یہ کٹھن مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ آبادی کے مسئلے کے حل میں ہمارے مستقبل کی تمام تابناکیاں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ بھوکی ننگی آبادی کبھی سر برآوردہ نہیں ہو سکتی۔

آیۃ اللہ بیگ عارف

# اسٹیلن کا روس

رسالہ جامعہ کی اشاعت ماہ ستمبر میں مسٹر م۔ م جوہر میرٹھی کا ایک مضمون بعنوان "جرمنی اور سوویٹ جنگ" شائع ہوا ہے۔ یہ لینن اور ٹروسکی کا خیالی مکالمہ ہے جو ٹروسکی کی کتاب (The Revolution Betrayed) کو بنیاد قرار دے کر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں جوہر صاحب نے اسٹیلن اور ٹروسکی کے مشہور اختلاف سے متعلق ٹروسکی کی تائید کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسٹیلن اور اس کی پارٹی نے روس کو تباہ کر دیا ہے اور اشتراکی نظام کو بھلا دیا ہے۔

مضمون نگار نے اس واقعہ کو حقیقت تسلیم کر کے بحث اُٹھائی ہے کہ ٹروسکی لینن کے اشتراکی نظریوں کا صحیح پیرو تھا اور اسٹیلن نے لینن کی اشتراکیت سے غداری کی ہے۔ حالانکہ اس بحث میں بنیادی طور پر اسی مسئلہ پر پہلے بحث کرنا چاہیے تھی لیکن جوہر صاحب نے اس کو ضروری خیال نہیں کیا۔

آپ نے آج کے روس پر یہ اعتراضات کیے ہیں۔

۱۔ روس کی اقتصادی حالت افسوس ناک ہے۔

اس ضمن میں روس کے ذمہ دار افسروں کے اقوال سے استناد کیا گیا ہے۔ اور آخر میں روس کے ساتھ جرمنی، امریکہ اور انگلستان کی معاشی اور صنعتی حالت کے اعداد و شمار دیے ہیں اور دونوں کے توازن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روس کی حالت مذکورہ ممالک کے بالمقابل بہت ابتر ہے۔ جرمنی کی بڑھی ہوئی صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لینن کے یہ خیالی جملے آپ نے لکھے ہیں۔

"سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔"

۲۔ اسٹیلن نے بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کو بھلا دیا جو لینن کا واحد مقصد تھا اور اس راہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ موجودہ جرمنی روسی جنگ کے شروع ہونے پر سوویٹ احرار نے حسب ذیل نعرے لگائے:۔

"مادر وطن کو بچاؤ۔ سوویٹ کی ایک انچ زمین کے لیے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔"

کہنا یہ ہے کہ روسی رہناؤں نے بین الاقوامیت کے بجائے قومی تصور کو اپنا لیا ہے۔

۳۔ روس نے بین الاقوامی انقلاب کا خیال چھوڑ کر اس عظیم پرولتاری امداد سے خود کو محروم کر لیا ہے جو روس کی تائید میں بہت مفید ثابت ہوتی۔

۴۔ چونکہ روسی سماج میں ذاتیں بن گئی ہیں اس لئے فوج میں بھی ذاتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس ذات سازی کا نتیجہ یہ ہے کہ روسی سپاہ بالکل ناکارہ ہے اور صرف ۱۲ دن میں جرمن فوج اتنی بڑھی کہ ماسکو کو خطرہ پیدا ہو گیا ــــــ سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔

جوہر صاحب کے یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں یہ وہی آوازیں ہیں جو امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دار پریس سے رہ رہ کر بلند ہوتی رہتی ہیں۔ اور ذہین و چالاک بورژوا اہل قلم مختلف اسالیب میں انھیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں سرسری طور پر میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ مضمون نگار نے کس طرح واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور یہ کہ اصل حقیقت بیان کردہ واقعات سے کتنی مختلف ہے۔

لینن اور ٹروٹسکی | مسٹر جوہر کے مضمون کا یہ بنیادی نظریہ ہی سرتاپا غلط ہے کہ ٹروٹسکی کی رائے لینن کے فلسفے کی تائید میں تھی۔ لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے ۱۹۰۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا جب لندن کانفرنس میں بالشویک اور منشویک الگ الگ ہوئے تھے۔ لینن بالشویک پارٹی کا لیڈر تھا مگر ٹروٹسکی اس اختلاف میں لینن کی تائید میں نہیں تھا وہ بالکل غیر جانبدار رہا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے انقلابوں میں بھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے رہا۔ لیکن اس تمام مدت میں اسٹیلن برابر لینن کی پارٹی کا روح رواں رہا اور ان دونوں انقلابوں میں لینن کا نقطہ نظر ہی صحیح ثابت ہوا۔

یہ کہنا طے شدہ تاریخی حقیقتوں سے انکار کرنا ہے کہ روس کی فوجی، سیاسی اور معاشی حالت مکمل کیے بغیر بین الاقوامی انقلاب لانے کا تصور لینن کا نقطہ نظر تھا اس لیے کہ لینن نے خود کہا تھا۔

"ہمیں روس کو اتنا مضبوط کر دینا چاہیے کہ وہ تنہا سرمایہ دار ملکوں کا مقابلہ کر سکے۔"

جوہر صاحب ٹروٹسکی کی اس تجویز پر کہ

"روس میں ایک بڑا ریڈیو اسٹیشن طیار کیا جانا چاہیے"

اسٹیلن کے اس جواب کا مذاق اڑاتے ہیں کہ۔

بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لیے ایسا ہی جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا"

حالانکہ علمی سیاست کو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اسٹیلن کے اس جواب کی کیا اہمیت ہی۔ اسٹیلن کے سامنے روس کی ۲۰ کروڑ آبادی اور اس کی ابتدائی ضروریات تھیں۔ بڑے ریڈیو اسٹیشن کا قیام کیا قوم کی ابتدائی ضروریات میں ہی؟ اسی پالیسی کا یہ نتیجہ ہی کہ آج روس میں خواہ ریڈیو اسٹیشن ہوں یا نہ ہوں لیکن بھوک فاقہ اور تباہ حالی کا وہاں کوئی ذکر نہیں ہی۔

روس کی معاشی حالت | روس کا مقابلہ جرمنی، امریکہ اور انگلستان سے کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ممالک مدتوں سے ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی صنعتی حالت صدیوں سے ارتقا کی مرہون منت ہی اور روس ماقبل جنگ ۱۹۱۴ء ایک زراعتی ملک تھا لیکن امریکہ، انگلستان اور جرمنی انیسویں صدی ہی میں صنعتی میدان میں کافی ترقی کر چکے تھے۔

یقیناً پراودا، اسوستیا، موٹوٹوف اور رتیوٹوف کا یہ کہنا صحیح ہی کہ

"ہماری صنعت ردی حالت میں ہی"

لیکن ان بیانات کا وہ مفہوم نہیں ہی جو کسی سرمایہ دار ملک کی صنعتی تباہ حالی کے ضمن میں دیا جاتا ہی اس لیے کہ جس وقت پراودا یہ لکھتا ہی کہ

"کپڑے کی صنعت بہت ردی حالت میں ہی"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہی کہ روس کے ۲۰ کروڑ انسانوں کی ضروریات کے پیش نظر وہاں کی صنعتی حالت ناقابل اطمینان ہی لیکن جب لندن ٹائمز یا نیویارک ٹائمز یہ اعلان کرتے ہیں کہ

"ہماری صنعتی حالت بہت ناگفتہ بہ ہی"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہو کہ امریکہ اور انگلستان کے کارخانے جو محض تجارتی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اپنے مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس لیے جوہر صاحب کا روس کے ذمہ داروں کے اقوال کا اس طرح نقل کرنا کہ پڑھنے والا وہ مفہوم سمجھے جو عام طور پر سرمایہ دار ممالک کی بابتہ سمجھنے کا وہ عادی رہا ہو بالکل گمراہ کن ہو۔ روس کی صنعتی حالت اس کی ضروریات کے مطابق ناکافی ہو لیکن زاری روس کے مقابل کئی گنا ترقی یافتہ ہو۔

جوہر صاحب کا یہ کہنا کتنا غلط ہو کہ فرانس میں تقریباً سوا تین لاکھ موٹریں ہیں اور روس میں صرف تقریباً سوا لاکھ لہذا روس کی حالت میں اشتراکیت نے کوئی انقلاب نہیں کیا۔ حالانکہ وہ یہ اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ یہ سوا لاکھ موٹریں اس روس کے پاس ہیں جہاں ۱۹۱۷ء سے پہلے چند گنتی کی موٹریں تھیں اور اس سوا تین لاکھ موٹریں رکھنے والے فرانس کے پاس ۱۹۱۷ء سے پہلے بھی ہزار موٹریں موجود تھیں۔ اشتراکیت کوئی منتر نہیں ہو کہ اُسے پھونکتے ہی صنعتی مجسمہ زمین سے اُٹھ کھڑا ہو گا معاشی حیثیت سے وہ عبارت ہو اس سماجی طریقہ سے جو عوام کی قوت پیداوار کی صحیح مقصد میں رہنمائی کرتا ہو۔ اور ساتھ ہی خود قوت پیداوار میں بھی شدت پیدا کر دیتا ہو چنانچہ روس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے پنجسالہ پروگرام کے اعداد و شمار اس واقعہ کی پوری تائید کرتے ہیں۔ روس کے ان پروگراموں کو اتنی کامیابی ہوئی کہ سرمایہ داروں کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کے صدر اعظم مسٹر روزویلٹ نے بھی ایک پنجسالہ اسکیم کا اعلان کر دیا۔

روس اور جرمنی | جوہر صاحب نے اشتراکی روس اور نازی جرمنی کا توازن کرتے ہوئے لینن کا خیالی قول لکھا ہو کہ

"سنتا ہوں ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا"

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ دعویٰ کن اسباب کی بنا پر کیا ہو کیا اس لیئے کہ اس کے نزدیک جرمنی کی جارحانہ طاقت روس سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ موصوف روس اور جرمنی کے اندرونی حالات سے قطعی نابلد ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۹ء تک روس میں کیا ترقیات

ہوئیں اور جرمنی میں اس سلسلہ میں کیا نئے اصلاحی اور اختراعی قدم اٹھائے گئے اور ان دونوں میں کیا نسبت ہو۔

جہاں تک جرمنی کی اس ۲۱ سالہ ترقی کا تعلق ہو میں مضمون نگار کو یہ یاد دلاؤں گا کہ جرمنی میں نئی بھاری صنعتوں کا احیا امریکی اور یورپی سرمایہ داروں کی امداد کا مرہون منت ہو اگر واشنگٹن اور لندن کے بنک برلن کی مدد نہ کرتے تو کسی طرح بھی ہٹلر کا جرمنی آج وہ طاقت حاصل نہ کر سکتا جو وہ حاصل کر چکا ہو۔ تاہم جرمنی کی طاقت کسی طرح سوویٹ روس کی ترقیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آج کل جرمنی اور ہٹلر کی بڑی طاقت اس کی فوجی کامیابیاں بتائی جاتی ہیں لیکن اگر اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو جرمنی کی فوجی قوت روس کی طاقت کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی جیسا کہ گذشتہ ڈھائی ماہ کی روسی جرمن جنگ سے ظاہر ہو کہ اس مدت میں جرمنی ـــــ جس کے ساتھ فن لینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، اطالیہ جیسے نیم آزاد یورپی ممالک اور آسٹریا، پولینڈ، چیکوسلوواکیہ، ناروے، یونان اور دوسرے مقبوضہ یورپی ممالک کی فوجی طاقت ہو ـــــ روس کو کوئی خاص اور قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکا۔ یاد رہے کہ اگر اس جنگ میں جاپان شامل ہو جاتا ہو تو بھی روس کا یہ محوری بال بیکا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ روس کی سائبیریا کی فوج بالکل خود مختار رہی۔

روس کی اہم فوجی قوت کا اقرار خود جرمن ماہرین نے بھی کیا ہو چنانچہ جرمنی کے مشہور فوجی جرنیل ہمان نے ۱۶ر فروری ۱۹۳۶ء کے مشہور جرمن اخبار دوئیچی دہر میں مختلف ممالک کی مسلح فوج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"روس کی فوجی طاقت آج تمام دنیا کے لیے چیلنج ہو۔ وہ ہر طرح جدید ترین اسلحہ سے آراستہ ہو۔ اس کی تربیت نئے اور ترقی یافتہ اصول کے ماتحت کی گئی ہو"

ابھی اس جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اطالیہ کے مشہور اخبار پوپولو ڈی اٹیلیہ کے فوجی تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ

"روس کے ساتھ جنگ میں محوریوں کو لانبی مدت کے لیے اپنی فتح کے خیالات کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ روسیوں نے جدید ذرائع سے اپنی فوجوں کو آراستہ کر کے سوویٹ یونین کو

ناقابل تسخیر بنالیا ہے۔ موریوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری مضبوط اور زبردست طاقت کو احتیاط کے ساتھ ٹکراتے رہیں۔"

ان حالات میں جوہر صاحب کا یہ لکھنا کہ

"سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔"

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کے علاوہ اور کیا ہے۔

بین الاقوامی پرولتاریہ کی مدد جوہر صاحب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب کے تصور کو چھوڑ کر اسٹیلن نے اس عظیم پرولتاری مدد کو کھو دیا ہے جو ایسے نازک وقت میں اسے بہت امداد دیتی۔

معلوم نہیں موصوف نے کن اسباب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے جبکہ معلوم ہے کہ روس پر جرمن حملہ کے ساتھ ہی تمام یورپی ممالک کے پرولتاری اور انقلابی گروہوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے جرمن سامراج کے خلاف عملی جدوجہد شروع کر دی۔ فرانس ناروے، اطالیہ اور یوگوسلیویہ اور بلغاریہ کے نئے حالات اس واقعہ کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اگر بین الاقوامیت کی طرف کمیونسٹ انٹرنیشنل مزید توجہ دے سکتی تو یورپ کی بےچینی زیادہ شدید ہوتی لیکن اس خیال کے پیش نظر اس وقت جبکہ دو منظم اور تربیت یافتہ فوجیں سائنس کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر گتھی ہوئی ہیں یہ کہنا کہ روس کی طاقت محض پرولتاریہ ہیں محض ایک طرح کی رومانیت ہے۔ پرولتاریہ ضرور روس کی طاقت ہیں لیکن یہ طاقت مخصوص اور متعین حالات میں ایک طاقت ہے اس وقت اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے جب تقریباً دو ہزار میل کے میدان جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجیں ان گنت سامان جنگ کے ساتھ ٹکرا رہی ہوں اگر روس سرمایہ دار جرمنی سے مقابلہ کرنے کے معاملہ میں فقط بدیسی پرولتاریہ کے انقلابی اقدامات پر اطمینان کر کے چپ بیٹھ جاتا تو جرمن افواج ولاڈی واسٹک بھی پہنچ جاتیں اور پرولتاریوں تک اطلاع بھی نہ پہنچتی۔

جوہر صاحب کو روس پر اعتراضات کرنے میں نسبتاً سنجیدگی اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے اعتراضات کی نوعیت سرمایہ نوازوں کی مجادلانہ ذہنیت کی چغلی کھاتی ہے۔

محمد تقی اودھوی

# علامہ اقبال کا فلسفہ

گزشتہ مہینے کے جامعہ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے "علامہ اقبال کا فلسفہ" مدیر صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس پر کچھ اظہار خیال کیا جائے۔ اس لیے میں نے مضمون بغور دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عنوان تو بہت وسیع ہے مگر بحث اتنی وسیع نہیں۔ اصل بحث کے اعتبار سے صحیح عنوان "اقبال کا فلسفۂ عقل و دل" ہو سکتا تھا۔

مدیر صاحب نے اپنے نوٹ میں فاضل مصنف کے اصل خیال کی وضاحت کر دی ہے۔ مگر مضمون کے پڑھنے سے مجھے علم نہ ہو سکا کہ کن اصولی طریقوں سے عقل و دل کے فلسفہ پر فکر کی گئی اور جو نتائج نکالے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ ہم اس انتشار اور پیچیدگی کو دور کر دیں جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے یا مشکل موضوع پر سوچتے وقت خود فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادب عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں۔ جو صاف سوچتا نہیں وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کیے گئے ہیں اور ان لفظی گورکھ دھندوں سے دور ہو کر جو اختر اور یوسف کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفہ عقل و دل کیا ہے؟ جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مصنف شاعر کے کلام کی جزاحی اور نثری تحریر سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب کی تنقید سے یہ خام طریقہ دور نہ ہو سکا

اقبال کے مفکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک ایک تمندر میں

کو دیڑتے ہیں جس میں کودنے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انھیں سوائے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ۔ نفسیات، ادبی تنقید کے اعلیٰ اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجزیے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ تجزیہ سے زیادہ ربط (Synthesis) کی ضرورت ہے۔

اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور رہ کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے دوسرے... ............اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہے۔ قرآن مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو "آیات بینات" کی حدوں سے نکال کر فقہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا اسی طرح اندیشہ ہے کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں نہ گم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشیں کر لینا چاہیے۔

۱۔ شاعر اقبال فلسفی نہیں ہے۔ "فلسفی" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو ابتدا سے مسائل پر ایک خاص نقطۂ خیال، انہماک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات ردّ و قدح کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہوتا ہے۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفہ سے متصادم نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان، "پاسبان عقل" کا محکوم

منطق اور معقولیت کا شکار رہتا ہے اور اس کے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان شعور، منطق ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو "حکیمانہ شاعری" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی مستقل "نظام فکر" یا معقول اور منطقی محاذ قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو اُبھار سکیں۔

۲- جس طرح شعر کی دنیا "فلسفہ" نہیں ہوتی اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام العمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کانگریس یا مسلم لیگ کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راست اور بالا رادہ لائحہ عمل بنا سکیں شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشفی بخشنا یا قایل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو دلفریب بنانے کے لیے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے ممکن ہے اس طریقے سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳- اقبال خوش قسمتی سے کہیے یا بد قسمتی سے نثر نویس بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے اور تقریریں کیں ہم اُن سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قایم رکھتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور اُن میں کیا وسعت اور اثر پیدا کرتی ہے۔ وہ خود شاعر نہیں جانتا اس لیے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقاید کو معلوم کرنے کے لیے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعے سمجھنے کے لیے دنیائے شعر کی "جادو گری" کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ۲۵ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پہلی نظم "کوہ ہمالہ" کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور لفظی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ "شاعر اقبال" میں "انسان اقبال" کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے پر غور کرتا ہوں تو ان کے الفاظ،

تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے نفس شعور ادراک اور احساس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے۔ اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طے کرتا ہوا شعر کے قالب میں اپنی نمود حاصل کرتا ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

بنیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل     غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا میرا بنیادی اصول رہا ہے کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکس خیال ہوتے ہیں، خیال نہیں ہوتے) غور کرنے کے بجائے "گداز دل" کو محسوس کروں اور رہ بہ ضمیر حاصل کروں۔ اس طرح میں شاعر کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پر ناز کرتا ہوں۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقۂ فکر و استدلال ہے اس سے مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد قوتیں موجود تھیں ایک عقل کے راستے سے غور و فکر، دوسرے دل کے راستے سے مشاہدۂ باطن۔ اقبال کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تو اس نے کہا ؎

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ     سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ان دو قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درس حکیمان فرنگ" یعنی فلسفہ دوسری طرف "صحبت صاحب نظراں" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے لیکن یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کس طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی تصادم کا مآل کیا ہوا؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے ایک بانگ درا، دوسرے پیام مشرق، تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے درمیانی خلا کو پُر کرنے والی ہیں۔ یا وہ کڑیاں ہیں جو خیال کے ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

بانگ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے جو ذوق جستجو کا شکار ہے لیکن اسکے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیام مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکر اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پرواز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں، برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔

پیام مشرق کی منزل پر اقبال ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے اور بعض کا نہیں لیکن اس کش مکش میں وہ جن مستقل نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لیے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل، قلب اور باطن کی قوت سے دور ہو گیا مشرق ہنوز اس روحانیت کا محافظ اور علمبردار ہے۔ لیکن یہ آگ سینہ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بھڑکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفۂ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام یہی ہے۔ پیام مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی۔ "درس حکیمان فرنگ" پر "صاحب نظراں" کی خاموش تعلیمات ہر طرح حاوی آتی رہیں چنانچہ جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے اور ایک "منکر درویش" کی طرح نعرۂ اللہ ہو لگانے لگے۔

کلام اقبال میں "عقل و دل" کی یہ کشمکش بڑی دلچسپ ہے۔ جب "ذوق جستجو" بڑھ گیا اور شاعر دور تشکیک سے گزر کر دور یقین میں آگیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل نظریہ

جو قائم کر لیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

حقیقت ایک کل ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے اور جو چیز قوت روح کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس دلچسپ مسئلے پر انشا اللہ بشرط فرصت میں کچھ اور لکھوں گا

ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ اقبال کا ارتقائے ذہنی کس ماحول میں ہوا؛ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔ (۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ محور علم، اور کچھ افتاد زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو متضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دونوں کو ملانے کی بھی کوشش کی۔ چونکہ ان کا خیال تھا جس طرح کہ ابھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کش مکش میں انھوں نے دو اہم سوالات کیے۔

۱۔ انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؟

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ۔۔۔ کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

۲۔ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے۔ مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا فلسفہ عشق یا "من کی دنیا" قدیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔

عشق کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے تین راستے متعین کیے۔ (۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل۔

عمل ایک جامع لفظ ہے جو دنیا دی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد سوئی ہوئی اور کاہل قوم کو جگانا، ترقی پر آمادہ کرنا اور ایسے کام کی قوت دکھانا ہے خواہ وہ

سیاست ہو یا ریاضت، اس پیغام کو انھوں نے طرح طرح سے اکسایا دو ایک مثالیں خود جوہر صاحب کے
دیے ہوئے اشعار سے معلوم کیجیے۔

(۱) لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

(۲) زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی — آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

**یقین:** شعری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کچھ تو یورپ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر ان حقایقِ حیات پر اپنا یقین کھو بیٹھی ہے جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جتنا جس بات پر یقین ہوگا اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہوگا۔ عمل میں جوش پیدا کرنے کے لیے حقایق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرأت اور حکمت کے ساتھ کی گئی۔ ایسے دور میں جبکہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ اور علوم کے نظریات کے باہمی تصادم کی وجہ سے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے ذوقِ یقین کو اکسانا کمال تھا۔

**خودی:** یقین اور عمل کے ساتھ ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انھوں نے اپنا فلسفہ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے خاص انداز سے پیش کیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا، اقبال اس بے خودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کاہل بنا دیا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی اپنے مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ نہیں بلکہ مثبت طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیئے۔ خودی ہو یا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن حالات زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ "منزل کبریا" کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے جس طرح مصنف نے سمجھا۔ اس مقام پر خودی اور عشق، عقل و دل، یا تن کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ وہ خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "یزداں بہ کمند آور" کا جذبہ پیدا کرے۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے اور اس مقام کا

حصول اور یہاں تک رسائی کے لئے پہلے حوصلے کی ضرورت ہے۔ حوصلہ خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو پانے دیکھنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جمع کرلے اور بلند مقام پر آکر خدا کو دیکھے یہ عمل اس کی شایان شان ہے اس طرح خودی نہ صرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے تزکیۂ نفس، ریاضت، ذکر و شغل، مراقبہ سب جائز لیکن اقبال کے فلسفہ کے مطابق یہ خود انکاری (Self Denial) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خود شعوری (Self Consciousness) خود شناسی (Self Assertion) کی روح اور ارادے کے ساتھ۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا ارادہ عام انسانوں کے فائدے کی چیز بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہوگا اگر یہ آئندہ چل کر بے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے شایان شان ہوگی۔ اس خودی کے دو روپ یہ ہیں۔

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے     خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

یہ سخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض" کی نہایت ذی شعور، حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی جاسکتی ہے

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انھیں     پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انھیں۔

جوہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عمدگی سے واضح ہوتا ہے۔ طریق خانقاہی گو فرسودہ ہو چکا ہے لیکن عشق کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں پختہ تر ہونا چاہیئے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے اور فکر کا تعلق عقل سے ہے جیسے اقبال کسی اور جگہ کہتے ہیں۔

گفت مرگ عقل، گفتم ترک فکر     گفت مرگ قلب گفتم ترک ذکر

ان مختصر توضیحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے جہاں خدا ہاتھ آتا ہے اس تک پہنچنے کے تین راستے، ایک خودی (۲) عمل (۳) یقین۔ انھیں پر زور دینے کے لئے اس نے طرح طرح کی تشبیہیں، استعارے حکمت اور دوربینی کے نکات اور مثالیں پیدا کیں۔ افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر برجستہ نہیں ہیں اور نہ ان کا مفہوم صحیح پیش کیا گیا ہے مثلاً انھوں نے ایک شعر پیش کیا ہے۔

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ بہ پیچ　　　معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبال نے عمل، یقین اور عشق کے متفقہ پیغام پر زور دیا جس کے مظہر حضرت موسیٰؑ ہیں اور ان کا تعلق فرعون اور طور سے ہے۔ پیغمبر اقبال کے نزدیک خودی عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا

اسی طرح اقبال نے عمل اور خودی کی قوت کو اکسانے کے لیے فلسفہ شاہین کی دلچسپ تشبیہ پیدا کی۔ عقل کو غلام، عشق کو امام، علم کو پوست، عشق کو مغز، جنوں کو جو عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے علم سے زیادہ تیز رو بتایا بہرحال جس موقعے پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حسن کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا۔ مثلاً

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　　نقش گر ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اس شعر میں عقل اور عشق کی ناتمامی اور بے راہ روی پر افسوس کیا ہے۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مصنف کے پیش کردہ اس شعر میں، جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند　　　آدم بہ میرد از بے یقینی

اس شعر میں یقین کی قوت دکھائی گئی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس　　　بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہزار طریقوں سے اقبال نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کالعدم ہو جاتا اگر ان عناصر میں توافق باہمی کے بجائے تصادم باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا۔ لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ان کے مدارج اور فوقیت کا ہر منزل پر خیال رکھا ہے۔ اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے ہے ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ فاضل مصنف اس مقام پر غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ

۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی۔ ایک تو "العلم حجاب الاکبر" دوسرے اس کے خیالات میں اس کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر پرچھائیاں آگئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گزشتہ بڑی شخصیت میں خواہ وہ غزالی ہوں یا برگساں تلاش کیئے جا سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا ہے یہ نظریہ برگسان کا ہے اس لیے ناموزوں ہے کہ اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح نظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا انھیں مخاطب کیا جائے۔

۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقایق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے کہ حقایق نئے نہیں ہوتے شاعر جن حقایق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے نیوٹن آئن اسٹائن یا آئن دنیائے سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اقبال کی "من کی دنیا" کوئی نئی چیز نہیں، خود کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ اس لیے اس مفروضہ یا تصور ماقبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھا نئی چیزیں پیش کرتا تھا۔ انتہائی آورجنل شاعر تھا، معلم تھا۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ مخواہ غیر ضروری صفات کا افسانہ کرکے اس کے کلام کو مشکل تر بنا دینا ہے۔

جہاں تک اس کے بیانات شاعرانہ کا تعلق ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہ اُلٹا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لیے انھیں نثر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اگر اُس نے اپنی تقریروں میں شعوری ارادے سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے بیان کیے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات من و عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح نثر میں ہیں شاعری کی ایمائیت (Suggestiveness) اثر اور وجدان کو روکنا جس کے ذریعہ اصل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور نئی تاثیر پیدا کر لیتا ہے۔ خود شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالوں میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں؟

محمد عبدالقیوم خاں باقی

# عاشقی[1]

انسانی زندگی میں سیکڑوں گوناگوں واقعات پیدا ہوتے ہیں اور پورے ہوتے ہیں۔ عموماً ہمارے منصوبے کے قول و فعل میں بے آہنگی کے عنصر کا کیا ذکر۔ ایسی ہم آہنگی اور مطابقت ہوتی ہے جیسے تصویر کے ساتھ پس منظر یا مطرب کے ساتھ باجے کی آواز۔ واقعات ہماری پیش بندیوں کے مطابق اس طرح پورے ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ماضی و حال کی خوشگوار تاریخ سے اپنے مستقبل کے بھی اُتنے ہی روشن اور خوش آیند ہونے کی امید کیا کرتے ہیں۔ لیکن خواہش کے مطابق کاموں کی تکمیل اور حصول مقصد کے باوجود ہماری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آتا ہے جو ہمیں مبہوت اور ہمارے مستحکم و دیرینہ نظریوں کو متزلزل کر دیتا ہے

عشق اتنا اہم موضوع ہے کہ اس کی حقیقت عاشقوں کی حالت کے مشاہدے یا خود عشق میں مبتلا ہو جانے کی آرزو سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کے لیے نہ تو وجدان و کشف کافی ہیں اور نہ معقولات و منقولات بلکہ عشق سے روشناس کرانے والی چیز ہمارے لیے محض ذاتی تجربہ ہے۔ مشہور ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر معقولات اپنے دوستوں کے حلقہ میں موضوع عشق پر بحث کر رہا تھا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ کوئی قطعی رائے اُس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ خود اس کی کُنہ سے واقف نہ ہو۔ فرانسیسی کو بہت برا معلوم ہوا وہ جلسہ سے باہر نکلا اور ارادہ کیا کہ بغیر تجربہ کیے ہوئے منہ نہ دکھائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کہ میں پھر اسی موضوع پر گفتگو کروں گا اس لیے کہ اب میں عشق کی لذت و درد کا خوگر ہو چکا ہوں۔ اگرچہ اس قلیل مدت میں وہ کیفیات اور مدارج عشق سے کیا واقف ہو سکا ہوگا تاہم اس واقعہ سے اندازہ ہو جائے گا کہ عشق کو کتابوں اور اقوال سے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لیئے صرف ذاتی اقدام اور انفرادی تجربہ کی ضرورت ہے۔

عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہم میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے۔ ہماری آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ہمیں گزشتہ تمام تمنائیں گرد معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عشق سے پہلے ہمارے باغ آرزو کی ہوا معتدل

---

[1] یہ ترجمہ ہے: Stevenson's "On Falling In Love"

تھی، ہمارے جذبات میں اشتعال نہیں تھا لیکن اب ان کی جگہ ایک ایسے زبردست جذبہ نے لے لی ہے جو ان تمام چیزوں کو محو کرکے ہم پر پورا پورا غلبہ حاصل کرلیتا ہے اور اُس وقت ہم درد و رنج کی ان لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں جن سے ہمیشہ نابلد تھے۔ صرف عشق ہی اس معقول پسند دنیا میں ایک نامعقول اقدام ہے جو کسی عقل و فکر کا پابند نہیں۔ اس کے اثرات بھی بالکل مختلف اور غیر متناسب ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب اور کس عشق میں مبتلا ہو جائے گا روز کی بات ہے کہ دو غیر مانوس انسان حسن سیرت و صورت سے عاری ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں بیسیوں دفعہ ایسا ہوا کرتا ہے اور ان کو کوئی خیال بھی نہیں ہوتا کہ دفعتاً ایک دفعہ انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ عشق کے دیوتا کا شکار ہوگئے جس نے دونوں میں محبت کا وہ ربط قائم کردیا ہے کہ معشوق غرضِ تخلیق عالم اور عطر کشیدۂ آفرینش معلوم ہونے لگتا ہے۔ عاشق کے خیالات اس رشتۂ باطنی میں اتنی مضبوطی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ہر فعل کو معشوق کی پرستش اور خوشی کا سبب سمجھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کے اپنے وجود کا مقصد بھی محض محبوب کے ساتھ ہم نشینی اور ہم نوائی ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ پر حیرت ہوتی ہے کہ ان دونوں میں کون ایسی چیز مابہ الامتیاز تھی جو ایک دوسرے سے محبت کا پیش خیمہ ہوئی؟ اُن کے نزدیک اگر مرد اپولو بلویڈر[1] (APOLLO BELVEDERE) کا اِتنا حسین ہوتا اور عورت اُس پر فریفتہ ہو جاتی تو چنداں محل تعجب نہ تھا لیکن دشواری تو یہ ہے کہ یہاں مرد میں وہ حسن سیرت و صورت بھی نہیں کہ وہ عورت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے پھر عشق کا آخر کیا سبب ہوا؟ غالباً اس معمہ کا حل

"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست"

میں مل سکے۔ ورنہ جہاں تک حسن صورت کا تعلق ہے میری دانست میں صرف دو مرد یعنی لیانارڈو ڈا ونسی[2] (LEONARDO DA VINCI) اور گوئٹے[3] (GOETHE) ایسے ضرور گزرے ہیں جو جوانی میں

---

[1] اپولو: یونانیوں کے خیال میں سورج اور موسیقی کا دیوتا مانا گیا ہے۔ اس کی شبیہ بے مثل سنگ مرمر کی بنائی گئی تھی اور جوانی و حسن کی کسوٹی و نشانی سمجھی جاتی تھی۔

[2] پندرھویں صدی کا معروف اطالوی مصور جو غیر معمولی جسمانی حسن اور قوت رکھتا تھا۔

[3] اٹھارھویں صدی کا جرمن فلسفی و شاعر۔ نہایت حسین و شکیل تھا جو اس سے ملتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

عورتوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے تھے۔ ان کے علاوہ مردوں کا بڑا حصہ کسی طرح اپنی جسمانی خوبصورتی سے اس قابل نہیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے عورتوں کے سینہ کو چھلنی کر دے۔ عورت کے لیے اس کے برعکس جاذب نگاہ ہونا بالکل ممکن ہو لیکن بد قسمتی سے میں مرد ہوں اس لیے غیر جنس کے نفسیات پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔

دنیا میں سیکڑوں کام ایسے ہیں جن کے سبب خود ہم ہوتے ہیں ہم چاہے اسے کریں یا نہ کریں تقدیر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہماری تمام روحانی فضیلتیں، مشقت، بلند خیالی، نیک اعمالی اور تمام وہ کام جو ہماری روحانیت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ہمارے ہی بس میں ہیں ہم انھیں چاہے بگاڑیں چاہے بنائیں مقدر کا ان سے کوئی تعلق نہیں لیکن دنیائے عشق میں تو بس مقدر ہی کی حکمرانی ہو۔ عاشق ہونا یا نہ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ عشق اختیاری و اکتسابی نہیں بلکہ اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہو۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شیکسپیر بھی اس میدان میں سپر انداختہ رہا اور جب ملکہ ایلزبتھ نے اس سے فالسٹاف کو عاشق کی حیثیت سے پیش کرنے کی فرمائش کی تو اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت ناکامیابی ہوئی اس لیے کہ عشق کا مظاہرہ سب کے امکان میں نہیں اور فالسٹاف جیسا موٹا مکروہ، بزدل اور لفنگا انسان کبھی بھی اس کا مناسب موضوع نہیں بن سکتا تھا۔ شیکسپیر کی طرح ہنری فیلڈنگ بھی عشق کی چاشنی سے بے خبر تھا۔ سوائے راب رائے نامی ناول کے ایک آدھ باب کے اسکاٹ کے متعلق بھی میری یہی رائے ہو۔ جب یہ تین تاریخی عظیم شخصیتیں یعنی شیکسپیر، فیلڈنگ اور اسکاٹ جن میں سب کے سب تخیل کے اعتبار سے بلند پرواز، صحت کے اعتبار سے تندرست، احساس کے اعتبار سے ذی حس اور طبائع کے اعتبار سے مخیر انسان تھے اور جن سے ہم عشق کی صحیح ترجمانی کے متوقع ہو سکتے تھے اس وادی سے ناکام واپس آئے تو ان زردرو، بے حس اور خود پسند انسانوں سے جن کا زیادہ وقت

---

لہ شیکسپیر کے ڈرامہ ہنری چہارم میں پرنس ہال کا ندیم و جلیس ہے۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد ملکہ ایلزبتھ نے شیکسپیر سے فرمایش کی کہ فالسٹاف جیسے بیوقوف آدمی کو عاشق کی حیثیت سے دکھائے چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ایک دوسرے ڈرامہ میں فالسٹاف کو ایک خادمہ کا عاشق دکھایا گر ناکامیاب رہا

لباس کی سج دہج میں صرف ہوتا ہے اور جن کی تعداد شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہو کبھی عشق جیسے بلند جذبہ کی امید کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ ان کی تو بس یہ مثال ہے کہ جس طرح بھیگا ہوا کپڑا آگ سے یا نابینا مناظر قدرت سے متاثر نہیں ہو سکتا اسی طرح مادۂ جذب و انجذاب کا فقدان ان کے دل کی بستی میں عشق کو کبھی خیمہ زن نہ ہونے دے گا اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو مادہ انجذاب رکھنے کے باوجود محبوب کا عشق حاصل نہیں کر سکتے اور یوں تخلیقِ عشق مشکل ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس ناکامیابی کے بھی اسباب وجوہ ہیں:۔

معشوق سے اظہار عشق ایک نہایت نازک اور اہم بات ہے۔ اکثر اوقات مناسب موقع کا نہ ملنا یا جھیپ کی وجہ سے عشق ظاہر نہ کرنا بھی محبت کو ختم کر دیتا ہے۔ بعض عشق کی ڈینگ مارتے ہیں مگر وہ اس سے باہر قدم نہیں رکھتے لیکن ایک عقلمند انسان مقدمات عشق سے واقفیت کی وجہ سے پہلے ہی سے زمین ہموار کرتا رہتا ہے اور مناسب موقع پر اظہار محبت کر کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ بہت سے ایسے مرد بھی ملیں گے جو صدائے "ارنی" اور جواب "لن ترانی" کے بعد بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور آخر کار عشق حاصل ہی کر لیتے ہیں لیکن اس ضد میں ایک قباحت ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ عورت فطرتاً عشق کا دم بھرنے سے اور چکنی چپڑی باتوں سے خوش ہوتی ہے تاہم معاشقہ کی تکرار سے پریشان ہو جاتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ عاشق اپنے فعل سے محبوب کی نظر میں سبک ہو جائے۔ اگر بفرض محال ایسا نہ ہو تو بھی زبردستی کے عشق کے بعد شادی حتماً زیادہ خوشگوار اور دیرپا نہیں ہو سکتی۔ عشق جبر سے کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔ عشق تو دراصل وہ ہے جو خود سے پیدا ہو۔ مدارج کو کامل طے کرتا ہوا دونوں طرف آگ لگا دے اور محبت کی آغوش کھول کر ایک دوسرے کا استقبال کرائے۔ یا دوسرے الفاظ میں عشق کی ابتدائی حالت یوں سمجھو کہ دو عشق کے متوالے کمال احتیاط اور مشتعل جذبات کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں جس طرح کہ دو ناداں بچے ایک انجان اور تاریک کمرے میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کا منھ تکتے اور ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلتے ہوں جب عشق کی یہ کیفیت ہو گی تب ہی نظروں یا پیشانی سے ایک دوسرے کے خیالات اور تکلیفوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح عشق کی آواز بازگشت دونوں دلوں کو باخبر کر کے ایک دوسرے سے اس طرح واقف کر دیتی ہے کہ انھیں اظہار عشق کی ضرورت

بھی نہیں ہوتی۔ وہ آپس میں اس طرح ایک جان ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ روحانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ عاشق کے دل میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ یہی بات محبوب کے دل میں بھی پیدا ہوتی ہوگی

عاشق ہونا جتنا تحیر زا ہے اتنا ہی مفید بھی۔ یہ زمانہ کے انحطاطی اثرات کو زائل کر کے طبیعت کو چست اور دماغ کو قوی رکھتا ہے۔ یہ بد دماغی اور بد مزاجی کو جس کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے دور کر کے انسانی احساسات میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اس کے خفتہ اور نیم خفتہ جذبات کو بیدار کر دیتا ہے عشق سے قبل تک انسان ان تمام لذائذ کا جو اس کی پہنچ سے باہر تھے منکر رہا کرتا، چیزوں کے تاریک پہلو پر نظر رکھتا اور روشن پہلو سے قطع نظر کر کے زندگی کی بیکار و بدمزہ چیزوں سے دل بستگی حاصل کیا کرتا تھا۔ اس طرح گویا اس نے زندگی کے تمام عمدہ جذبات، جوانی کی لذت، ظرافت اور حسن کہ جس کا اس کے پاس ذخیرہ تھا عدم استعمال کی وجہ سے زنگ آلود کر دیا تھا۔ وہ محبت کے باغیوں کا ایک رکن بن گیا تھا۔ خودداری کا غلط مطلب اور خودغرضی کی آزادی کو وجہ ناز سمجھتا تھا۔ وہ اپنے محدود حلقۂ مشاغل سے قدم باہر نکالنا گناہ اور شادی کو ڈراؤنا خواب جانتا تھا لیکن ان تمام قنوطیت اور کہنہ پرستیوں کے باوجود عاشق ہونے کے بعد اس میں سینٹ پال[1] کی طرح ایک اچانک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے قلب کی حرکت جو ابھی تک تدریجی تھی ایک بارگی تلاطم و جزر و مد کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے ازلی ولاہوتی نور میں غرق دکھائی دیتی ہے۔ اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج تک نہ کچھ دیکھا تھا نہ سنا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی اسے خواب معلوم ہونے لگتی ہے عشق کے تیز احساسات اسے مضطرب اور بے کیف رکھتے ہیں کبھی تنہائیوں میں خوب ہنستا ہے اور کبھی راتوں کو ٹکٹکی باندھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہے قلم میں کہاں وہ قوت کہ اس دماغی کیفیت کی تصویر کشی کر سکے۔ اسے ہم محض فلاسفہ اور شعرا کے چند زبردست شاہکاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ''ڈیلیڈ''[2] نامی نظم میں ٹینی سن کی

---

[1] ابتدا میں یہ مجوسی تھا اور عیسائیوں کا جانی دشمن لیکن دفعتاً اس کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور وہ مذہب عیسائیت کا زبردست حامی اور مؤید ہو گیا۔

[2] جرمن شاعر فریڈرک ہیبی سن ۱۸۶۳ء تا ۱۸۱۳ء کی نظم جو موضوع عشق پر بے نظیر نظم ہے۔

ماڈر (                    ) میں ہینے[1] کی غزلوں میں شیکسپیر کے انٹنی اینڈ کلوپٹرا
اور رومیو اینڈ جولیٹ (                    ) وغیرہ میں اس کیفیت کی حیرت خیز ترجمانی کی گئی ہے
اسی طرح لا مزیبل میں پلاریس[2] کی حالت بھی اس کیفیت کی پوری پوری
آئینہ دار ہے۔ جارج سینڈ (                    ) اور جارج میریڈتھ (
کے کرداروں میں یہ دماغی کشمکش خوب خوب موجود ہے۔ ہم کہاں تک نام گنائیں ادب میں عشق کے ماروں کی
داستان بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہے۔ ہم ادبیات کے دروازہ ہی سے شہر بیولا[3] میں داخل ہو سکتے
ہیں جو بہشت سے متصل اور شہر عشق، کے بالمقابل ہے۔ یہاں بیٹھ کر عاشق خوش بختی اور نہ پوری ہونے والی
امیدوں کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عاشق ہونے کے بعد انسان اپنے وجود اور اپنے فعل کو دنیا کے لیے کیوں
مفید اور مغتنم سمجھنے لگتا ہے؛ غالباً یہ فطرت ہے کہ انسان اپنے معمولی سے معمولی کام کو بھی عالمگیر اور دنیا پر چھایا ہوا
سمجھے بس اسی طرح عاشق بھی یہی خیال کرتا ہے کہ اس کے عشق کے تاثرات اور سرگرمیاں دوسروں کو بھی ضرور
متاثر کر دیں گے۔ عاشق و معشوق کی نگاہوں میں اپنا وجود اس قدر دلکش اور روح افزا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ
دنیا کے لیے ممکنات میں سے بہترین چیز ہے۔ وہ اس جذبہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ آسمان کا نیلگوں ہونا
آفتاب کا روشن ہونا اور موسم کا خوشگوار ہونا بھی اپنے ہی وجود کا منت کش سمجھنے لگتے ہیں اور اس مبالغہ آمیز
معیار عشق کی وجہ سے وہ روز بروز خود نما و خود پسند ہوتے جاتے ہیں انانیت کا معیار عاشق کی نظر میں
میں اس قدر رقیع ہو جاتا ہے کہ وہ ہر عورت کو جان آف آرک (                    ) خیال کرتے ہیں۔ مگر خود بھر
چارلس گرینڈلین[4] (                    ) کی طرح لاف و گزاف اور خود نمائی سے آگے نہیں بڑھتے

---

[1] یہ بھی انیسویں صدی کا جرمن شاعر ہے۔ بہت سی غزلیں لکھیں جو کہ اپنی رشتہ دار بہن امیلی ہائنے
کے عشق کی وجہ سے نہایت کامیاب ہیں۔

[2] وکٹر ہیگو (                    ) کے ناول بدنصیب میں ایک کردار جو عشق میں مبہوت ہے

[3] بنئین (                    ) اپنی کتاب پلگرمس پروگرس (                    ) میں بیولا (                    ) کو ایک
مقام بتاتا ہے جو کہ تمام فرحت و لذت کا نمونہ ہے۔

[4] رچرڈسن (                    ) کے ناول کا ہیرو ہے۔ بولنے میں بڑے بڑے جملے استعمال کرتا ہے اور لاف و گزاف کا عادی ہے جس
کی وجہ سے نہایت مضحک ہو گیا ہے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ آیا عشاق کی اس قسم کی لفاظی سے عورتیں بھی خوش ہوتی ہیں! لیکن اب جارج ایلیٹ (G. ELIOT) کے ناول ڈینیل ڈیرونڈا (DANIEL DERONDA) کے پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ بے شک وہ خوشامد سے خوش ہوتی ہیں اس لیے کہ اس ناول کی ہیروئن اپنے عاشق کی ڈینگوں اور چکنی چپڑی باتوں سے انتہائی خوش ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی جھنجلا بھی جاتی ہے۔

گو کہ عشق کا یہ بلند معیار کہ عاشق و معشوق کا عشق دنیا کی خوش بختی کا سبب ہے اپنے میں کوئی افادی پہلو نہیں رکھتا تاہم اس میں ایک خوبی ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس خیال سے عاشق مخیر اور کشادہ دل ہو جاتا ہے اور جس وقت وہ دوسروں کو بھی محبت میں مبتلا دیکھتا ہے تو ان پر ترحم اور خوشی کی نظر ڈالتا ہے۔ ترحم اس وجہ سے کہ وہ اپنے عشق کی تکلیفوں کو یاد کر لیتا ہے اور خوشی اس وجہ سے کہ لوگ عشق میں اس کی تقلید کرتے ہیں جس طرح کسی کمیڈی میں ہیرو ہیروئن اپنے علاوہ کسی معمولی کردار کے عشق پر بھی ترس و شفقت کرتے ہیں اسی طرح اصل زندگی میں بھی باوجودیکہ عاشق اپنے عشق کے مقابلہ میں دوسروں کے عشق کو ہیچ سمجھتے ہیں پھر بھی خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کی محبت بھی پھلے پھولے اور بار آور ہو۔ بہرحال عاشقوں سے ہمدردی فطری چیز ہے یہ روکی نہیں جا سکتی۔ جس طرح کوئی انتہائی کاروباری انسان بھی مناظر قدرت کی دلکشی کی وجہ سے چند منٹ ضائع کر کے اُسے ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح انتہائی بے حس اور ٹھوس انسان بھی جذبۂ ہمدردی سے پُر ہو جاتا ہے جبکہ وہ دو دردمند دلوں کی داستان پڑھتا ہے یا ان کو شہر کی کسی گلی میں دیکھ لیتا ہے اگر کوئی مدت العمر ناکتخدا لڑکی کسی ناول میں ہیرو ہیروئن کے معاشقہ سے دلچسپی نہیں لیتی تو وہ اس کی خبیث طبیعت کی وجہ سے ہے اس لیے کہ جو شخص عشاق پر کم از کم ہمدردانہ نظر نہ ڈالے وہ بہت ہی پست اور خلاف فطرت ہو گا۔

عاشق و معشوق کا عشق چاہے دوسروں کے لیے مفید ہو یا نہ ہو لیکن اس سے خود عاشقوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بھلائی کرنا اور اسے لوگوں تک پہنچانا ان کا مطمح نظر ہو جاتا ہے۔ عاشق کی ذاتی خود نمائی اور خود پسندی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اسے محض معشوق کی خوشی اور نظر التفات میں سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ معشوق کی خوشی سے عاشق کے دل میں فخر، انکسار، ترحم اور محبت کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہر فعل میں لباس میں گفتار میں

کردار میں محض معشوق کی خوشی کا خیال رکھتا ہے۔ وہ دنیا کے لیئے جاذب نظر نہیں بننا چاہتا بلکہ صرف معشوق کے
لیئے تاکہ اس کی بارگاہ میں ہدیہ نیاز پیش کرتا ہے۔ عاشق اپنی تمام کمزوریوں سے بھی معشوق کو آگاہ کردیتا ہے
اور قبول و عفو کا متمنی رہتا ہے۔ اب اس کی محض یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنے کسی ذاتی محاسن کی وجہ سے نہ
چاہا جائے بلکہ اصلی حالت میں اس سے محبت کی جائے۔ اپنی حالت کو معشوق کے سامنے صحیح پیش کرنا
دنیا میں سب سے مشکل کام ہے اس وجہ سے کہ انسان محض الفاظ کے ذریعہ سے اپنے خدوخال کو صحیح دکھا
سکتا ہے اور اس میں اس بات کی ہر وقت گنجائش ہے کہ وہ اپنے معنوں کو بخوبی ادا نہ کرسکے یا معشوق، الفاظ کے
مناسب نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑجائے۔ پس اس سبب سے اپنے کردار کے صحیح پیش کرنے میں
انسان کو عموماً ناکامیابی ہوتی ہے۔ عاشق اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ آیا وہ اپنے کو دنیا کے سامنے صحیح دکھا سکا
یا نہیں، اس کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو معشوق کے سامنے اصلی رنگ میں دکھا سکے۔ اس کی بس یہ
خواہش رہتی ہے کہ معشوق اسے اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی طرف سے کسی غلط فہمی یا ناواقفیت میں مبتلا نہ رہے
جب اس کوشش اور محبت کے باوجود اسے کسی وقت یہ علم ہوجاتا ہے کہ معشوق نے اسے پوری پوری طرح
نہیں سمجھا ہے یا مزاج شناس نہیں ہوا ہے تو عاشق میں جذبہ بغاوت و نفرت پیدا ہوجاتا ہے۔

عاشق گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنا اپنے لیے کوفت و مصیبت سمجھتا ہے۔ اسے اس بات سے اذیت ہوتی
ہے کہ زمانہ ماضی بغیر اس معشوق کی ہمراہی کے کیوں صرف ہوا اور اس نے اتنے عرصہ تک دوسری عورتوں
سے کیوں عشق بازی کی۔ کیوں نہ اپنے اسی محبوب کے ساتھ رہا؟ یہ خیال اس کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگاتا
ہے۔ اپنے ان خیالات پر تو اسے رنج ہوتا ہی ہے لیکن جو چیز اس کے دل میں ناسور پیدا کردیتی ہے اور اس کے
زخم کو مندمل نہیں ہونے دیتی وہ یہ ہے کہ خود معشوق نے ماضی میں کیوں اس کے علاوہ دوسرے مردوں سے
تعلق رکھا اور کیوں خدائے رحیم اتنے عرصہ تک عورت کے دوسرے مردوں کے عشق پر راضی رہا؟ یہ مرد
کی خودغرضی ہے ورنہ جس فعل کو خود اس نے روا رکھا تھا اسے عورت کے لیے کیوں معیوب سمجھتا ہے؟

مرد اپنے عشق کی مطلق العنانی کو جائز رکھتا ہے لیکن عورت کے اس رویہ کو غیر فطری اور عملی زندگی کے
خلاف سمجھتا ہے۔ مرد کا یہ جذبہ قابل ستائش نہیں اس لیے کہ دونوں کو برابر کا حق ہے اگر مرد کو عورت کے پچھلے واقعات

عشق کی وجہ سے اس سے حسد پیدا ہو گیا تو وہ عشق پاک و بے آلایش کب رہے گا؛ وہ تو نفسانی خواہشوں کا گویا شکار رہا اور گویا ہوس رانی ہی اس کا اصل مقصد تھا۔ غالباً حسد انسان کے خمیر میں نہیں رہا ہے اور اس کے لیے محض یہ ثبوت کافی ہے کہ جب قدیم ترین انسانی نسلیں عشق کی تھوڑی پونجی کے ساتھ دنیا میں آئیں تو ان میں یہ مادہ تھا ہی نہیں یہ تو تہذیب و تمدن کی برکت ہے کہ حسد پیدا ہوا ہم میں جتنی تہذیب ہو گی اتنا ہی بلند ہمارا عشق ہوگا اور اتنا ہی زیادہ حسد ثبوت کے لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دوسرے ممالک والے جو ہم سے کم متمدن ہیں عشق کا پست معیار رکھتے ہیں اور ان میں کتنا کم حسد ہوتا ہے۔ اس جگہ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم عشق کی کوئی تاریخی ریسرچ کریں اور یہ بتائیں کہ آیا وہ قدیم قوموں مثلاً یونانیوں وغیرہ میں بھی تھا یا نہیں اس وجہ سے کہ یہ تفتیش ہمیں مغالطہ میں ڈال دے گی۔ ہمیں بس یہ ماننا پڑے گا کہ عشق تخیل و تہذیب تمدن کی برکت ہے اور حسد عشق و دوستی، وطنیت اور مناظر قدرت سے دلچسپی لینے کے سلسلہ میں پیدا ہوا اگر ہم عشق کو اس وجہ سے ذلیل نہیں سمجھتے کہ یہ ہماری موجودہ تہذیب کا کرشمہ ہو جو دہ تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے تو ہمیں حسد و رقابت کو بھی بری نظر سے دیکھنے کا مجاز نہیں اس لیے کہ یہ تو محض اسی عشق کا ہی جزو لاینفک ہے چاہے اسے کوئی مانے یا نہ مانے واقعہ یہی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ معشوق کی گزشتہ زندگی اور معاشقہ کی داستان پر جس جذبۂ نفرت کو ہم حسد سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الاصل حسد نہیں کہا جا سکتا اگر کوئی مرد شادی کے بعد اپنی بیوی کے پاس ان خطوط کا مجموعہ پائے جو اس نے شادی سے قبل دوسرے عاشقوں کو لکھے تھے تو کیا مرد اپنی بیوی سے حسد کرنے لگے گا؛ نہیں: مرد کو محض دکھ ہوگا اور شدید دکھ۔ اسے تکلیف ہو گی کہ جورو نے شادی سے قبل کیوں دوسروں سے محبت کی۔ وہ اس بات پر افسوس کرے گا کہ زن و شو ایک ہی احساسات و جذبات کے ساتھ کیوں نہ توام پیدا ہوئے تاکہ دونوں میں کوئی راز نہ رہتا۔ وقت بھی نہ ضایع ہوتا۔ کہیں اور ایک دوسرے کا تعلق بھی پیدا نہ ہوتا ان کا عشق آپس میں کامل اور بے غل و غش رہتا اور ابتدا ہی سے ساتھ رہنے کی وجہ سے تضیع اوقات نہ ہو سکتا اور وہ اس غم و غصہ سے بھی نجات پا جاتے کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ہی کیوں نہ بیاہ دیے گئے اور کیوں شادی سے قبل تک کا وقت ضائع ہوا۔ بس ان خیالات کے علاوہ

اسے بیوی سے نہ کوئی حسد ہوگا اور نہ وہ اس کی طرف کوئی ناجائز شک کرے گا۔

عشق انسان کو اس کے غیر فانی ہونے کا یقین کرا دیتا ہے۔ عاشق یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ عشق کی وسعت کے لیے زندگی کوتاہ ہے۔ اس کے لئے زندگیوں کا ایک مجموعہ کفایت کر سکتا ہے۔ زندگیوں کا ایک تسلسل ہونا چاہیے تاکہ عشق ایک بڑی مدت تک نشو و نما حاصل کرے اور پھر پھولے اور بار آور ہو۔ ان خیالات کے علاوہ عاشق کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی کیوں نہ عشق میں بسر کی۔ اسے لطف اندوز ہونے کے لئے کیوں اس قدر قلیل مدت ملی؟ مگر افسوس کہ عاشق اسی قصر تخیل میں رہتے ہیں اور کوس رحیل بج جاتا ہے اس لئے کہ زندگی عاشقوں کے خیال کی پابند تو ہے نہیں وہ اپنا دورہ پورا کرتی رہتی ہے اور ایک سکنڈ کے لیے بھی اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ ان کی دلچسپی ختم ہو جائے تب موت آئے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق ہونے کے بعد ہی موت آجاتی ہے۔ بعض کیوپڈ کا نشانہ بننے سے قبل ہی دنیا کو وداع کر دیتے ہیں اور جب عشاق موت کی گہری نیند سو جاتے ہیں، تب کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ جب تیس برس کے عشق کا ڈرامہ دنیا کے اسٹیج سے ناپید ہو جاتا ہے تو یہ پاک جذبہ جس کو وہ اتنا بزرگ، اتنا عظیم سمجھتے تھے کیا نشانیاں چھوڑتا ہے؟ کچھ نہیں، سوائے دو ایک گیتوں کے جو کہ انھوں نے لکھے ہوں دو ایک عمدہ کاموں کے جو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہوں اور دو ایک بچوں کے جو ان کی نشانی اور گفتار و کردار میں والدین کی شبیہ ہوں۔ یہ ہے اس غیر فانی جذبہ کی مختصر کہانی۔

مترجمہ اقبال انصاری ایم اے

# سُراغ رسانی کے قصّے

سراغ رسانی کے قصے فی الحقیقت عصر حاضر کی پیداوار ہیں لیکن زمانہ قدیم میں بھی ان کے غیر ترقی یافتہ گر دلچسپ نمونے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ انسان میں سراغ رسانی کا شوق ابتداہی سے موجود ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ نہایت مشہور ہو کہ دو عورتیں ان کے پاس فریاد لے کر آئیں۔ ان میں ایک بچے پر جھگڑا ہوا۔ ہر ایک یہ کہتی تھی کہ بچہ میرا ہو اور مجھے ملنا چاہئے۔ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ بچہ کو تلوار سے کاٹ کر آدھا آدھا بانٹ دیا جائے۔ اصل ماں کی ممتا بھلا اس تقسیم کو کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ وہ چیخ اٹھی کہ پیغمبر اعظم! میں بچہ سے درگزری مجھے تو بس اس کی جان پیاری ہو۔ اس طرح حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہو گیا کہ بچہ کی حقیقی مالک کون ہو اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلے نفسیاتی سراغ رساں تھے جن کا حال ہمیں زمانہ قدیم کے حالات میں ملتا ہو۔

دانیال کے زمانہ میں بل دیوتا کا ایک مشہور مندر تھا۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ گوشت یا شراب جو چیزیں ہر رات دیوتا کو نذر کی جاتی تھیں وہ اُن کو کھا لیتا تھا۔ دانیال بڑے صائب الرائے تھے انھوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہو اور اگر تمھیں یقین نہ ہو تو مندر کے صحن میں راکھ بکھیر دو اگلے روز اس کا امتحان ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صبح کو بادشاہ نے لوگوں کو پجاریوں کے پیروں کے نشانات دکھلائے جو راکھ پر بن گئے تھے اور بتلایا کہ یہی لوگ گوشت اور شراب کے مزے اڑا رہے ہیں دیوتا غریب کو اس کی خبر بھی نہیں۔ دانیال کا یہ کارنامہ تجزیہ کی عمدہ مثال ہو جس کو سراغ رسانی کا پہلا اصول سمجھنا چاہئیے۔

ورجل نے ہرقل کے قصہ میں لکھا ہو کہ کاکس نے اس کے چار بیل چرائے اور ان کی دم پکڑ کر اپنے غار میں لے گیا تاکہ کوئی ان کا سراغ نہ پا سکے کہ وہ کہاں چھپے ہیں لیکن ان کے ڈکارنے نے سارا راز فاش کر دیا۔ اب کاکس غریب کی کم بختی آگئی اس لیے ہماری ہمدردی اس کے ساتھ ہو جاتی ہو۔ کلاسیکل قصوں

کا یہ نقص ہو کہ اس میں ہماری ہمدردی مجرم کے ساتھ ہو جاتی ہو۔ موجودہ زمانہ میں اس نقص کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہو۔

علم الاصنام کے قصوں اور قدیم روایات میں بھی کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک مل جاتی ہو۔ ایک آقا کا قصہ مشہور ہو کہ اس کے چور کا پتہ لگانے کے لیئے اپنے تمام نوکروں سے کہا کہ وہ ایک جادو کی بلی کو ہاتھ لگائیں جو چور ہو گا اس کے ہاتھ لگاتے ہی بلی میاؤں کرنے لگے گی۔ آقا نے بلی کے روئیں پر کوئی چیز مل دی تھی جب سب کے ہاتھ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کے ہاتھ بالکل صاف اور بے داغ تھے وہی چور تھا اس لئے کہ اس نے میاؤں کے ڈر سے بلی کو دور ہی سے برائے نام چھو لیا تھا!

ایک شیر کا قصہ مشہور ہو کہ اس نے جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی دعوت کی لومڑی نے دیکھا کہ بہت سے ہرنوں کے بھٹ تک جانے کے تو نشانات ہیں لیکن واپسی کے نہیں ہیں اس لیے اس نے شیر کی دعوت نامنظور کر دی۔ یہ تمام قصے تجزیہ اور نفسیات کی واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن ان قصوں میں اور موجودہ سراغ رسانی کے قصوں میں بڑا فرق ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی گئی ہو لیکن موجودہ حالات، سائنس اور نفسیات کی واقفیت نے اس کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی ہو۔ اور اسی لیے اس کا صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے وسط سے قبل آغاز بھی نہیں ہوا۔ کانن ڈائل (سنہ ۱۹۳۰ء۔ سنہ ۱۸۵۹ء) پہلا شخص ہو جس نے سراغ رسانی کے قصوں کی مقبولیت بڑھائی اور سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے بعد ان کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ روز بازار ان سے بھرتے تھے اور روز خالی ہوتے تھے۔ سراغ رسانی کے قصے نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہوئے۔ یوں تو ہر زمانہ کے نوجوانوں میں شوق تلاش و تجسس رہا ہو لیکن اس زمانہ کے نوجوان اس معاملہ میں اور بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ یہ عہد ہی تحقیق و دریافت کا ہو۔

موجودہ صدی تنقیح و احتساب سے عبارت ہو۔ اس میں ہر طرف ہوش و گوش کی فراوانی اور عقل و فراست کی ارزانی نظر آتی ہو۔ وکٹوریہ کے عہد میں جو غیر استدلالی ایمان و یقین پیدا ہو گیا تھا اس کے خلاف بغاوت کی گئی اور ایسی شدید کہ تمام پرانے اصنام خیالی کو مسمار کر دیا گیا۔ اب ہر چیز کو جانچا، پرکھا اور

تولا جاتا ہے اور کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کیا جاتا جو انسانی ذہن و دماغ کو گوارا نہیں ہوتی۔ یہ شک اور شبہ کا دور ہے۔ اب فرض کر لینے اور کسی بات کو طے شدہ سمجھ لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ہر مسئلہ کو چاہے وہ آرٹ کا ہو یا ادبیات کا، اخلاقیات سے متعلق ہو یا مذہبیات سے اسے غیر معتقدانہ اور تشکیکانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور بڑی جانچ پڑتال، شدید غور و فکر اور مکرر سہ کرر تجربوں کے بعد ہی کوئی فیصلہ دینے کی جرأت کی جاتی ہے۔

بیسویں صدی والوں نے عقل کی پاسبانی اور رہنمائی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور معتقدات کی تمام بنیادیں ہل گئیں لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہر شخص میں تلاش و دریافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور اس جذبۂ بے اختیار کی تسکین کے لیے نئے نئے سامان پیدا ہو گئے۔ چیستاں اور معمے حل کرنے کا جیسا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ادب اور خصوصاً قصے اور افسانے زمانے کے اس رنگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ سراغ رسانی کے افسانوں میں بیسویں صدی کے تمام میلانات آکر مجتمع ہو گئے ہیں اور وہ ہمارے جذبۂ تحقیق و تجسس کی آسودگی میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد قیام امن و سکون کی جو کوششیں کی گئیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید "رومانی" ادب کو بہت نقصان پہنچے گا اور اب سوائے تجربہ خانوں کے انسان کو کہیں بھی کارنمایاں دکھانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس کے ثبوت میں ایچ جی۔ ویلس کے سائنٹفک ناول پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں دارالتجربے ہی "رومان زار" کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں لیکن انسان ہمیشہ جوش آفریں محرکات کی جستجو میں رہا ہے۔ اس کمی کو سراغ رسانی کے افسانوں نے پورا کیا۔ اس لیے کہ ان میں اسرار و رموز، جانبازی اور حوصلہ مندی، خوف و ہراس، جوش و اشتعال سب ہی کچھ موجود تھا۔ اور ان سب باتوں کی منطقی تشریح بھی موجود تھی جس سے سائنٹفک دماغ کو فرحت حاصل ہو سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں مادی اور صنعتی عہد کے خلاف زبردست رومانی ردعمل ہوا۔ اس زمانے میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں فوق الفطرۃ عناصر شامل تھے اور اس دنیا کی تلخیوں سے گریز کر کے تخیل کے دامن میں پناہ لی گئی تھی۔ ہنگامہ خیز قصے دراصل انھیں فوق الفطرۃ

افسانوں کی دوسری کڑی یا اُن کا منطقی نتیجہ ہیں لیکن اس قسم کے قصوں کی ادبی ترقی اور آراستگی کا آغاز ایڈگر ایلن پو (۱۸۰۹ء تا ۱۸۴۹ء) سے قبل ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بوسٹن (امریکہ) میں پیدا ہوا اور آئرش نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ ایکٹر تھے اور شاید اسی اثر کی وجہ سے وہ ڈرامائی یا ہنگامہ خیز قصے کامیابی کے ساتھ لکھ سکا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت اور ذہنیت کا حامل تھا۔ اس میں شاعر کی موضوعیت، ریاضی داں کی درست پسندی، فن کار کا تخیل اور سائنس داں کا ادراک، اس عمدگی کے ساتھ سمو گیا تھا کہ وہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکا۔ پو کے قصے جو "طلسمی اور خیالی کہانیوں" کے نام سے مشہور ہیں، جدید جاسوسی افسانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے لیکن ان کا ایک بڑا نقص نصیحت آمیزی ہے بعض اوقات صفحے کے صفحے ماہر جزمیات کا لکچر معلوم ہوتے ہیں اور ان کو اصل قصے سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ کانن ڈائل نے پو کے درسی اور خشک منطقی ڈھنگ کو بدلا اور سراغ رسانی قصوں کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ انداز بیان کی شگفتگی اور روزمرہ کے ماحول کی دلکشی نے کانن ڈائل کی مقبولیت بڑھا دی اور اس کے "ہومز افسانے" گھر گھر پڑھے جانے لگے۔ اس سے قبل عہد وکٹوریہ کے دو مشہور ناول نویسوں مسز ہنری وڈ اور ولکی کالنس نے ایسے قصے لکھ کر جو جذبات اور ذہن و دماغ کو متاثر کرتے تھے کانن ڈائل کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔

سراغ رسانی کے افسانوں کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ اس میں پڑھنے والے کی ہمدردی سراغ رساں کی طرف ہو جانا چاہیے ورنہ اسے ایسے قصوں میں کوئی لطف نہیں آئے گا جن میں مجرم کو برابر زک اور شکست ہوتی ہے۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس قسم کے قصے اپنی نوعیت کے لحاظ سے عقلیت کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند گتھیوں کو پیش کیا جاتا ہے اور گرہ کشائی کے لیے محض ناخن ہی نہیں بلکہ فہم و فراست بھی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے سراغ رسانی کے قصے تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں مقبول ہو سکتے ہیں۔ اگر قصہ ذہن و عقل کو متاثر نہیں کرتا بلکہ صرف جوش و خروش پیدا کرتا ہے تو وہ (THRILLER) ہیجان انگیز چیز ہے اور اس کی مانگ صرف معمولی پڑھے لکھے لوگوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ انگلستان میں انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کا شوق نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا اور ہر شخص کو

تعلیم سے بہرہ ور کیئے جانے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں تعلیمی قوانین پاس ہوئے اور پیل نے قوانین تعزیری کی اصلاح کی۔ پولیس کا باقاعدہ انتظام بھی اسی عہد میں ہوا جس کے ذریعہ انکشافِ جرم میں پہلے سے زیادہ ضابطہ اور باقاعدہ برتا جانے لگا۔ یہ تمام باتیں سراغ رسانی کے افسانوں کی مقبولیت بڑھانے میں معاون ہوئیں اور ان محرکات نے پو کی بنیادوں پر فلک بوس قصر تعمیر کر دیا۔

کانن ڈائل کے شرلک ہومز کے قصے بہت مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بکے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک شخص آرتھر مارلین کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو بھی کانن ڈائل کا مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ڈائل نے لوگوں کو ایسا مسحور کر دیا تھا کہ ایک مدت تک کسی اور کو وہ قبولِ خاطر حاصل ہی نہیں ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں جا کر جی کے چیسٹرٹن (۱۸۷۴-۱۹۳۶) شرفِ قبولیت اور خراجِ تحسین حاصل کر سکا۔ اس کے سراغ رسانی کے افسانوں نے تمام ادبی طبقوں میں دھوم مچا دی۔ ۱۹۲۲ء میں یہ رومن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہو گیا اور اس تعلق نے اس کا مقصد پچھلے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف کر دیا۔ اس نے اپنے افسانے قانون کی محبت میں یا تفریحِ طبع کے لیے نہیں لکھے بلکہ بہ حیثیت ایک مذہبی آدمی کے وہ یہ چاہتا تھا کہ مجرم کو اقبالِ گناہ کا موقع ملنا چاہیے۔ اور یہی اس کے نزدیک جرمیات کے مسائل کا سب سے بڑا حل تھا۔ چیسٹرٹن کے "فادر براؤن افسانے" لطیف اصلاح پسندی سے قطعِ نظر، اس اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دنیا کو بتلایا کہ اس قسم کے قصے ادبیات میں بھی بڑا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کی تباہ کاری اور خوں ریزی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انسان باوصف دعویٰ شائستگی اب بھی اتنا ہی بڑا درندہ ہے جتنا پہلے تھا۔ وحشت و بربریت کا عہد پھر تازہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ کی باگ پیچھے کی طرف موڑ دی گئی ہے۔ اس وقت ہر طرف خطرہ، شور اور ہنگامہ ہی نظر آتا تھا۔ اس لیے ادبیات کے ذریعہ اس جذبۂ جانبازی و خطر پسندی کی تسکین غیر ضروری تھی۔ اس لیے اسی زمانہ میں جاسوسی افسانے لکھے گئے جو غیر محاربین کے لیے بہت کچھ دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔

جنگ کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں رومانی جذبات بہت ابھر آئے اور امن قایم ہو جانے کے بعد ان کی تسکین کا مسئلہ درپیش ہوا اب اہل فکر دلوں کو ٹٹولنے اور اسباب کی چھان بین میں مصروف تھے۔ اسی وجہ سے نفسیاتی ناول کا عروج ہوا۔ لیکن یہ چیز عام پسند نہیں تھی۔ فوج کے خستہ اور درماندہ سپاہی، بے روزگاروں کے جتھے اور ہنگامہ پسند عوام "برگشتہ فکر" اور "مراقبوں" کی فلسفیانہ تحریریں پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے اُن کی تسکین کا سامان صرف ہیجان انگیز افسانے اور سراغ رسانی کے قصے ہی بہم پہنچا سکتے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سراغ رسانی کے افسانوں میں کافی تبدیلی اور وسعت پیدا ہوگئی اب افسانہ میں محض اسرار اور بھید ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ اب سچ مچ کا ایک معما پیش کیا جاتا تھا جس کے حل کرنے میں پڑھنے والے کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں آسٹن فریمین نے ایسے دلچسپ قصے لکھے جن کے ایک حصہ میں مجرم کے کاموں کی تفصیل ہوتی تھی اور دوسرے میں بڑی خوبی اور دلآویزی سے رفتہ رفتہ جرم کا انکشاف کیا جاتا تھا۔ کہ چیستاں کا لطف آخر وقت تک قایم رہے۔

بعض لوگوں نے اپنے سراغ رسانوں کی قابلیت دکھلانے کے لیے بڑا مبالغہ کیا ہے۔ اور عجیب عجیب مجرموں کی داستانیں لکھی ہیں۔ اس قسم کا مبالغہ ہیجان انگیز افسانوں میں تو کچھ نبھ جاتا ہے لیکن سراغ رسانی کے قصہ میں مجرم اور سراغ رساں دونوں کو اسی عالم آب و گل کا انسان ہونا چاہیے۔ کامیاب قصہ وہ ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ نہ کہے کہ سراغ رساں کتنا ہوشیار ہے بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو کہ میں کتنا بے خبر تھا کہ میں نے ان پتوں اور علامتوں پر غور نہ کیا!

اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سراغ رسانی کے قصوں میں نہایت معمولی قسم کے جرایم کی داستان ہونا چاہیے۔ اس کے انکشاف میں کچھ لطف نہیں ہے۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی جیسے نرگسی آنکھوں میں سرمہ ہر صنف ادب میں ضروری ہے۔ اس لیے کامیاب افسانہ نگار کو یہ چاہیے کہ وہ عام اور عجیب کے درمیان کا راستہ اختیار کرے اور اس کے اشخاص افسانہ ایسے ذہین لوگ ہوں جو اسی دنیا کے آدمی معلوم ہوں لیکن جو کسی کام میں مہارت خصوصی سے زیادہ اپنی فہم و فراست پر بھروسہ رکھتے ہوں افسانہ نگار کو پڑھنے والے کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ضروری اتا پتا بتلادے تاکہ قاری کی دماغی تسکین بھی ہو سکے۔

سراغ رسانی کے قصوں پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ معترض کے نزدیک جرم کی داستان بیان کرنا ہی جرم کی ترغیب دینا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ آسکر وائلڈ نے اپنے مضمون "دروغ بافی کے زوال" میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا، لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کتاب اچھی لکھی گئی ہے یا بری"۔ والٹر پیٹر کے نزدیک بھی کسی صنف ادب کو جانچنے کا معیار صرف حسن و دلکشی ہے۔ اس کے علاوہ ان قصوں کا منتہیٰ ہی مجرم کا سراغ لگانا ہے۔ ایک اچھے اور کامیاب افسانہ میں ہماری ہمدردی کبھی بھی مجرم کی جانب نہیں ہو سکتی ممکن ہے اس کی سزا کے وقت ہمارے اوپر ہمدردی کا جذبہ طاری ہو جائے اس لیئے اخلاقی اور فنی بہتری اسی میں ہے کہ افسانہ کو انکشاف راز یا حراست مجرم کے بعد ختم کر دیا جائے۔ اس کے آگے قصہ کو بڑھانا یا افسانہ نگار کا جج کے فرائض انجام دینا خوش مذاقی اور فن دونوں کا خون کرنا ہے۔

سراغ رسانی کے اعلیٰ اور کامیاب قصے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں اس لیے ان کا شمار آرٹ کے زمرہ میں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آرٹ غیر متغیر جذبات و کیفیات پر اثر ڈالتا ہے۔ اسی لیے حقیقی آرٹ ہمیشہ مستقل اور پائیدار ہوتا ہے۔ شیکسپیر حقیقی آرٹسٹ تھا اور اسی لیے آج تک زندہ ہے۔ اس کے علاوہ سراغ رسانی کے قصے زیادہ تر زندگی کے ایک رخ کو نمایاں کرتے ہیں اور ان میں اصلی زندگی کے تمام خط و خال نظر نہیں آتے۔ اسی لیے ان کا مقصد ہنگامہ خیزی، وقتی اور ذہنی تفریح سے زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ زمانہ میں اسی قسم کے قصے مقبول اور محبوب ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہماری بے لطف اور بندھی ٹکی زندگی میں دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس صنعتی تہذیب اور میکانکی دور میں جبکہ انسان کو بھی کلوں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے یہ قصے ذرا ہنگامۂ لطف اور شور انبساط کا باعث ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی رونق "ایک ہنگامہ" پر موقوف ہے اور انسان ہمیشہ سے سرور و شور، اور جوش و خروش کا متلاشی اور تحقیق و دریافت کا جویا رہا ہے۔ سراغ رسانی کے قصے ہماری اس تشنگی کو رفع کرتے ہیں لیکن جس طرح شدید گرمی میں کہیں سے آکر بہت سا پانی پی لینا نقصان دہ ہے اسی طرح ان قصوں کا مطالعہ بھی اعتدال سے نہ بڑھنا چاہیئے۔ اگر یہ دماغی تفریح محض "تلخئ کام و دہن" رفع کرنے کے لیے حاصل کی جائے تو باعث لطف و مسرت ہوگی۔

اردو میں سراغ رسانی کے قصے بہت کم لکھے گئے ہیں ہمارے یہاں قصہ کا شوق کافی پرانا ہے۔ کٹنیوں اور عیاروں کے قصوں، اقبال جرم کی پرانی کہانیوں اور علم الاساطیر کے افسانوں میں کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اردو میں داستانی مثنویاں شروع ہی سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض اپنے مافوق موضوع کے اعتبار سے ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ مافوقیت، پر اسرار اور سراغ رسانی کے قصوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ انگلستان میں کالرج اور ہوریس والپول کی تحریروں نے جن میں مافوق عناصر زیادہ نمایاں تھے اولین تخم ریزی کی۔ وکٹوریہ کے عہد میں ولکی کالنس وغیرہ نے اس زمین کی آبیاری کی اور پو کے ذریعہ تخم کی نشو و نما کے آثار شروع ہوئے اور اس درخت کی پہلی کونپل کانن ڈائل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اردو کی مثنویوں میں مافوق عناصر کی کمی نہیں ہے۔ بدر منیر اور گلزار نسیم کی بنیاد ہی مافوق الفطرت ماحول پر قایم ہے۔ پرانے قصوں میں بھی مثلاً طلسم ہوشربا، طلسم نوخیز جمشیدی، اور بوستان خیال وغیرہ میں بھی خرق عادت، سحر و طلسم اور عیاری اور مخبری کے متعدد قصے مل جاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو دراصل موجودہ زمانے کے جاسوسی افسانوں سے (جن کے درمیان کئی عبوری منزلیں حائل ہیں) کوئی راست علاقہ نہیں ہے اور یہ شمع خود شاہان ملک کی مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھڑک کر خاموش ہو گئی۔ اب اس کو کوئی دوسری مشعل ہی روشن کر سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے مستقل قیام، پولیس کے باقاعدہ انتظام، اخباروں کی روز افزوں ترقی، انگریزی تعلیم کے فروغ اور مغربی اثر نے نئے خیالات پیدا کیے۔ وہ چراغ پھر نئے تیل سے روشن کیا گیا اور لوگ پو اور کانن ڈائل کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ موخر الذکر کے بہت سے ترجمے ہوئے اسی سلسلہ میں پروفیسر فیروز الدین مراد اور محمد یعقوب کلام (مترجمین حکایات ہومز) پروفیسر نصیر الدین عثمانی (مترجم وادی خوف) اور محمد نصیر احمد (مترجم حلقہ مسموم، اور خاندانی آسیب) قابل ذکر ہیں۔ ڈائل کے علاوہ اور جاسوسی مصنفین کے بھی ترجمے ہوئے۔ کچھ ہنگامہ خیز قصے سلطانہ ڈاکو، قتل بے گناہ، پر اسرار انسان، ٹوپی کا سراغ وغیرہ نہایت سستے چھپے تاکہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں کچھ معمولی انگریزی قصوں کے خاکے ہیں جن کو مقامی لباس میں حذف و اضافہ کے بعد پیش کر دیا گیا ہے۔ بعض طبع زاد ہیں جن کا مقصد ذہنی تفریح سے زیادہ ہنگامہ خیزی

ہے۔ ہمارے یہاں اول تو تعلیم کی کمی اور طبیعتوں کی افسردگی کی وجہ سے جاسوسی لٹریچر بہت کم ہے اور جو ہے وہ بالکل گھٹیا اور ابتدائی صورت میں۔ اس میں نہ منطقی استدلال ہے اور نہ دماغی فرحت کا سامان۔ اس کی ساری عمارت اتفاقات اور حادثات پر قایم ہے۔ غور و فکر اور مشاہدہ اس میں نام کو نہیں فنی خوبیاں بھی اس میں مفقود ہیں۔ ایک نقص جو عام طور پر ان معمولی قصوں میں ملتا ہے وہ یہ کہ مجرم کو جب تک پھانسی نہیں ہو جاتی کتاب ختم ہی نہیں ہوتی۔ بعض قصوں میں بے حد مبالغہ ہے۔ اور اشخاص افسانہ معمولی گوشت پوست کے انسان نہیں معلوم ہوتے۔ اور وہ انسانی کمزوریوں اور خوبیوں سے بالکل معریٰ نظر آتے ہیں۔ ان قصوں کا انداز بیان بھی اصول فن کے اعتبار سے ناقص ہے۔ مختصر یہ کہ ان میں بجز ہیجان انگیزی اور عوام نوازی کے اور کوئی وصف نہیں ہے۔

مولوی ظفر عمر اس بے آب و گیاہ سرزمین مین ایک نخلستان کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ سراغرسانی میں انھیں کافی درخور حاصل ہے کیونکہ اُن کی عمر ہی پولیس کے کام میں صرف ہوئی ہے لیکن ان کے یہاں بعض اوقات مجرم کو فنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جاتی ہے۔ ایک گتھی کو پیش کرنا اور پھر ایک ایک ڈورے کو سائنٹفک قابلیت سے سلجھانا، جو اگاتھا کرسٹی کا وصف ہے۔ مولوی ظفر عمر کے یہاں بھی ہے لیکن معمولی حقیقت یہ ہے کہ ابھی اردو میں ایک شرلک ہومز، ڈاکٹر تھارن ڈائک اور فادر براؤن کی بڑی کمی ہے۔

کیا عجب ہے کہ موجودہ جنگ کے محرکات ہمارے افسانہ نویسوں کے ذوق کو مہمیز کریں اور وہ مولوی ظفر عمر کی بنیادوں پر ایک بلند عمارت تعمیر کرکے اردو کے دامن کو دلچسپ قصوں سے بھردیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

# اندرون مصر

"یورپ میں صرف ایک جگہ ہے انگلستان پر حملہ کر کے اسے بُری طرح نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور وہ مصر ہے"
(ڈاکٹر پال روربیک جرمن ماہر جنگ)

جرمنوں کا ہر سوئز پر نرغہ ہوا اور مصر بھی یورپین اور امریکہ کے اخبارات کی سرخیوں میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے بیشتر امریکی اسے ایک رنگین سرزمین خیال کرتے تھے جہاں سیاحت کرنا راحت فزا ہے۔ ابوالہول اور اہرام مصری، ریتیلی زمین، اونٹ سیاح، بحیرہ روم کے مسافر جہاز اور فرعونوں کے مقبرے اس سے متعلق ہیں اور پھر ایسی سرزمین میں جہاں مطلع ہمیشہ صاف اور دھوپ تیز رہتی ہو۔ ریگستان کا رومان اور مشرقی اجنبیت مل جل کر عجیب فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

لیکن آج کل کا مصر عجیب متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ سیاح اب بھی گھومتے پھرتے ہیں اور آثار قدیمہ کے ماہر جستجو کرتے ہیں مگر اس کی ایک اور حیثیت بلند تر ہے۔ یہ بہت اہم فوجی مرکز ہے اور یہیں سے روئی پھل اور غلہ دستیاب ہوتے ہیں یہ بحیرۂ روم کا دروازہ ہے اور یہاں سے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے راستے کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اگر انگریز مصر سے باہر نکال دیے جائیں تو جرمنوں کی طاقت بحر شالی سے لے کر ہمالیہ تک ناقابل شکست ہو جائے گی نیز دونوں ڈکٹیٹروں کو تیل کا اس قدر کافی ذخیرہ مل جائے گا کہ وہ دس کیا بیس سال تک جنگ جاری رکھ سکیں گے۔

تمام عملی مقاصد کے لیے مصر سے مراد نیل کی وادی لی جاتی ہے اس کا رقبہ ۳۴۵،۰۰۰ مربع میل ہے۔ جس میں ۳۲۷،۰۰۰ مربع میل ریگستان ہے۔ دریائے نیل باقی بارہ سو میل کے باشندوں کے لئے خون زندگی کا کام کرتا ہے۔

نیل میں پشتوں کا بہت وسیع سلسلہ ہے اور انھیں سے اس پر قابو رکھا جاتا ہے۔ ۸۵۰۰،۰۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین مستطیل کھیتوں میں منقسم ہے جن کے اردگرد نہریں ہیں۔ یہ دریا سے سیراب ہوتے ہیں ان جزیروں میں اگست

میں (جو دریا کی طغیانی کا زمانہ ہے) چالیس دن کے لیے تین فیٹ اونچا پانی چھوڑا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانی نکال دیتے ہیں اور زمین پر جو بے حد زرخیز ہے بیج بو دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح گنّے، روئی، غلہ، پھل اور ترکاریوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ بیشتر دو فصلیں اور اکثر تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔

نیل مصری تجارت کی بھی جان ہے اس کے ذریعہ سے ملک کی بیشتر پیداوار ساحل سمندر پر برآمد یا ملکی ضروریات کے لیے پہنچائی جاتی ہے۔ وسیع سپاٹ پیندے والی کشتیوں میں سامان لے جایا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں پانی کے ساتھ بہہ کر نیچے پہنچتی ہیں اور پھر کسان انھیں رسیوں سے باندھ کر اوپر کھینچ لاتے ہیں بہت سی دخانی کشتیاں بھی نیل میں چلتی ہیں مگر آدمیوں اور بادبانوں سے کشتی رانی ارزاں ہے۔

جہاں مشرق و مغرب ملتے ہیں | نیل کا ڈیلٹا مشرق کا آستانہ اور مغرب کی منزل رہا ہے۔ یہاں مشرق اور مغرب قدیم اور جدید گھل مل جاتے ہیں اور نسل زبان، آداب اور روایات کے اس معجون مرکب میں جو دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتا ان کا امتیاز رفتہ رفتہ فراموش ہو جاتا ہے۔

مصر میں دو تمدن نشو و نما پاتے ہیں گھوڑا اور خچر گاڑی، بھاپ سے چلنے والے اور پٹرول انجنوں کے باوجود باقی ہیں۔ لوہے اور کنکریٹ نے کچے گھروں اور لکڑی کے یک منزلہ مکانوں کی جگہ لے لی ہے۔ مگر وہ بالکل معدوم نہیں ہوئے۔ مصریوں کا اعلیٰ طبقہ بانڈ اسٹریٹ لندن کے کپڑوں میں ملبوس گھومتا ہے۔ ادنیٰ لوگ اب بھی سوتی گلابیہ جو بورے کی طرح سلی ہوتی ہے پہنے ہوئے ننگے پیر شہر یا کھیتوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

دارالسلطنت قاہرہ میں ہزار سالہ قدیم جامعہ آزہر ہے جو ساری اسلامی دنیا کا علمی مرکز ہے۔ اسکندریہ میں ......، مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اس کی بنیاد دو ہزار سال ہوئے سکندرِ اعظم نے ڈالی تھی اور اس وقت سے یہ دنیا کا سر سبز شہر ہے قاہرہ اور اسکندریہ میں وسیع اور عالیشان موسم اختیاری (AIR CONDITIONED) دفاتر بنے ہوئے ہیں۔ جن کے درمیان جدید طرز کی سڑکوں پر لنکن، رولس رائس اور کیڈیلاک موٹریں فٹن اور خچر گاڑیوں کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ کناروں کی سڑکوں پر خاکی وردی پوش انگریز فوجی افسر آسٹریلیا کے سپاہی اور یونانی تاجر اور شامی سوداگر بیوپار اور کوڑھی فقیروں سے کندھے رگڑتے ہیں جو گندے چیتھڑوں میں نیم برہنہ گھوما کرتے ہیں۔

سنیچر یا اتوار کی شام کو فیشن پرست ہیلی پولس گھوڑ دوڑ کا میدان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگ سے پہلے ایپسم ڈاونس یا لانگ چیمپ تھے۔ بابیلیکا کا بازار الف لیلہ کا زندہ مرقع ہے۔ موٹے نارنجی پسینے میں شرابور مصری تاجر سفید مگر گندے گالابیہ اور لال شکستہ ترابوزنیے مصر کے قومی لباس میں اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے آگے تختوں پر بیٹھے چلاتے رہتے ہیں یا آس پاس کی گلیوں میں زور شور سے کوئی سودا چکاتے ہیں۔ قاہرہ کے اس حصے میں جہاں مشہور شیپرڈ ہوٹل ہے جس میں امن کے زمانہ میں یورپ کے مہذب اور شائستہ لوگ ٹھہرتے تھے نصف درجن کے قریب دیسی قہوہ خانے ہیں۔ وہاں غریب مصری سنگ مرمر کی میزوں کے کنارے گھنٹوں بیٹھے قہوہ یا زب زب پیتے اور خلا میں دیکھتے رہتے ہیں۔

مصر حاضر کی پیدائش | مصر سے یورپ کو روشناس کرانے کا ذمہ دار نپولین بونا پارٹ تھا۔ ۱۸۰۶ء میں اس نے چھ ہزار سپاہی مصر میں اتار کر میلوک سورماؤں کو شکست دی۔ اس نے اپنی بھاری توپ سے اتفاقیہ ابوالہول کی ناک کا ایک حصہ اڑا دیا۔ اور بعد میں سائنس دانوں کی ایک جماعت کو ملک کی پیداوار اور وسیلوں کا اندازہ لگانے کے لیے چھوڑ گیا۔ جب اس کے بیڑے کو جنگ ٹرافلگار میں شکست ہوئی تو اسے مصر فتح کرنے کے خیال کو چھوڑ دینا پڑا اور پھر مصر عثمانیوں کے زیر نگیں ہو گیا۔ موقع شناس البانوی سردار محمد علی نے جس کی اولاد سے موجودہ شاہ فاروق ہیں مصر کو دوبارہ فتح کر لیا اور ترکی خلیفہ کے نام سے حکومت کرتا رہا۔

لیکن نپولین ساحل سمندر پر اپنے نقوش پا چھوڑ گیا تھا۔ مصری امرا کی زبان فرانسیسی ہو گئی جو اب بھی ہے جب خدیو اسمٰعیل کو اپنی فضول خرچیوں کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑی تو فرانسیسی سرمایہ دار بلائے گئے اور جب فرڈیننڈ ڈی لس پاس نے نہر سوئنر بنانے کی اجازت حاصل کی تو اس کے حصے بھی بیشتر فرانسیسی سرمایہ داروں نے خریدے۔

۱۸۷۵ء تک برطانیہ اس تصویر خانہ میں نہیں آیا۔ اس زمانہ میں ڈسرائیلی نے خدیو اسمٰعیل کے ہمیشہ دیوالیہ رہنے سے فائدہ اٹھایا اور نہر کے ۴۰۰۰۰۰۰ ڈالر کے حصے خرید لیے اور اس کے بعد متواتر قرضہ دیتا رہا بالآخر برطانیہ اور فرانس اس پر مجبور ہوئے کہ وہ مصر کے مالیات پر دوہری قابو رکھیں۔ خدیو کو مجبور

×. Lee Stack سوڈان کا سردار تھا اور یہ حادثہ قاہرہ میں ہوا۔ [illegible] قتل [illegible]
[illegible] ۔ دیکھیے [illegible] کی کتاب [illegible] ۳۷۰

کیا گیا کہ وہ اپنے سے زیادہ سمجھدار بھانجے توفیق کے حق میں مستعفی ہو جائے۔ ٹیکس کے طریقے کی اصلاح ہوئی قومی قرضہ کم کیا گیا۔ برطانوی اور فرانسیسی افسروں کو مصری نظام میں عمدہ جگہیں دی گئیں اور مغربی طور طریقے رائج کیے گئے۔

ان اصلاحوں کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک جانباز مصری افسر عربی پاشا (اُورلی پاشا) نے مسلح بغاوت کی ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا کو شکست ہوئی اور برطانیہ نے مصر پر تسلط جمانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۸۵ء میں سخت پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ فرانس مصر میں پھر سے دلچسپی لے رہا تھا۔ اور کرنل مرشیڈ سوڈان میں فسٹو ڈا پر کمک لے کر وارد ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور انتہا پسند شخصیت مہدی نے جو خود کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے بتاتے تھے بڑی جرأت سے آزادی پھیلانے کی کوشش کی مگر ان کو جنگ عمدرمان میں افسوس ہے کہ شکست ہوئی۔ یہ جنگ ۲۱ لانسرس رجمنٹ کی وجہ سے مشہور ہے۔ جس میں لفٹیننٹ ونسٹن چرچل نے حصہ لیا تھا۔ یہ لارڈ کرومر کا زمانہ عروج تھا۔ جب جنگِ عظیم چھڑ گئی تو برطانیہ نے مصر کے ماتحت حکومت زیر حمایت ہونے کا اعلان کر دیا۔

صلح نامہ میں پریسیڈنٹ ولسن نے قومی خود مختاری کا اصول مدنظر رکھا اس نے مصر میں سخت ہنگامہ بپا کر دیا۔ ایک قومی تحریک پیدا ہوئی جس کا نعرہ "مصر مصریوں کے لیے" تھا۔ اس نے بلوے اور طلباء کے مظاہرے کرائے اور دہشت انگیز تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ آخر میں برطانوی سردار (کمانڈر انچیف) سرلی سٹک کو سعد زغلول پاشا کے رفقاء نے قتل کر دیا۔ تب برطانیہ نے مدافعتی تدبیریں اختیار کیں۔ دبابے اسکندریہ کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور تھوڑی مار دھاڑ بھی ہوئی اور نظام از سر نو قائم ہو گیا۔ زغلول پاشا اور بیس اور نمایاں مصری لیڈر جلاوطن کر دیے گئے۔

تہماں!
×

آخر ۱۹۲۲ء میں برطانیہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ قوم پرستوں کے مطالبات حق بجانب تھے چند مستثنیات کے علاوہ مصر کے آزاد اور خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور شاہ فواد اول اس کے پہلے حکمراں ہوئے۔

اس وقت تک برطانیہ نے تجارتی اور مالی اعتبار سے مصر میں پوری طور سے قدم جما لیے تھے۔

اس نے ........ ڈالر ملک میں قومی قرض نیشنل بینک مصر کمپنیوں کا نوں، روئی کے کارخانوں اور سیاسی ایجنسیوں میں پھیلا رکھے تھے ۱۹۲۲ء کے صلح نامہ میں بہت سے مستثنیات تھے جن کی رو سے انگلستان کا مصر کی مالیات پر قابو باقی رہتا تھا۔ اسی سے اس کا سرمایہ محفوظ تھا اور غیر ملکی ٹیکس اور مصری قانون کی زد سے باہر تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ حق بھی مسلم تھا کہ وہ سرزمین مصر پر تھوڑی سی مسلح فوج بھی رکھے۔

۱۹۳۰ء کے درمیانی مہینوں میں برطانیہ کو ڈکٹیٹروں کے عروج اور خاص طور سے اٹلی کی بحیرۂ روم میں روز افزوں طاقت کو دیکھ کر تشویش پیدا ہوئی اور اس وقت پھر مصر میں یہ تحریک ہوئی کہ غیر ملکیوں کا اقتدار بالکل ہٹا دیا جائے۔ خاص قومی انجمنوں کے ساتھ دو فاشستی خیالات رکھنے والی جماعتیں بھی پیدا ہوئیں۔ نوجوان مصری پارٹی یا سبز قمیص والے جن کی مالی امداد اطالوی حکومت کرتی تھی۔ اور نیلی قمیص والے ہنگامی سپاہی جو جرمن طوفانی سپاہیوں کے نمونے پر تھے جنھیں جنگ عظیم میں خاص اور اہم خدمات کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے لیڈر اولوالعزم مدبر نحاس پاشا تھے۔ ڈکٹیٹروں کے یہ اثرات بہت جلد زائل کر دیئے گئے مگر مصری وطن پرستوں نے برطانیہ کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی دوبارہ تسلیم کی، اور دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد اور امداد کے معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اگلے سال ۱۹۲۲ء کے مستثنیات کو بھی رد کر دیا گیا اور مصر جمعیۃ الاقوام میں بھی داخل کر لیا گیا۔ اس کے معاوضہ میں برطانیہ کو مصر نے اس بات کا حق دیدیا کہ وہ نہر سوئز کے علاقے میں دس ہزار فوج اور چار سو طیارے اور ہوا باز رکھے تاکہ ان سے رود بار کی حفاظت کی جا سکے۔

۱۹۳۶ء کے معاہدے کے مطابق مصر نے اٹلی اور جرمنی سے سیاسی رشتے منقطع کر لیے ہیں۔ جرمن اور اطالیوں کا مال جس کا اندازہ ........ ڈالر کیا جاتا ہے حکومت نے ضبط کر لیا ہے اس سلسلے میں یہ ذکر دلچسپ ہوگا کہ مصر کا سالانہ بجٹ ........۲ ڈالر سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ ۷۰ ہزار جرمن اور اطالوی جو مصر میں رہتے تھے اور جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اپنی اپنی حکومتوں کی امداد کرتے ہیں ان کو نظر بند کر دیا گیا ہے۔ گزشتہ جون سے مصر میں فوجی قانون نافذ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاقہ جنگ ہونے کا اعلان کر دیا گیا ہے اسکندریہ اور قاہرہ کی بیس فیصدی آبادی سلامتی کی جگہوں میں لے جائی

گئی اور فضائی حملوں سے بچنے کی تدابیر کی گئی ہیں لیکن اس امر کے باوجود کہ مصر افریقہ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کی منزل مقصود ہے مصری حکومت نے اپنی غیر مداخلتی پالیسی برقرار رکھی ہے۔

اس حکمت عملی کے وجوہات کچھ تو فوجی اور بیشتر سیاسی ہیں۔ اہم جنگی مسئلہ یہ ہے کہ مصر ایسا مسلح نہیں کہ پرزور ہوائی حملوں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر قدیم مصریوں پر فضائی حملہ ہوا تو ان میں دہشت پھیل جائے گی۔ اور جانوں کا بھی بہت نقصان ہوگا۔ کیونکہ وہ نہ تو ذہنی اور نہ مادی طور پر اس طریقہ جنگ کا مقابلہ کر سکتے ہیں سارے قاہرہ میں جہاں ۱۳،۰۰،۰۰۰ کی آبادی ہے صرف تیس چالیس تہہ خانے ہیں اور وہ بھی محض گڑھے کھود کر ان پر لکڑی کے تختے ڈال دیے گئے ہیں اور اوپر سے ریت بچھا دی گئی ہے۔ اس میں صرف کھڑے رہنے کی جگہ ہے۔ ہوا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں اور فضا اس قدر گندی ہے کہ اب تک تہہ خانوں میں اتنے حادثے ہوئے ہیں جتنے باہر نہیں ہوئے۔

**جماعتیں اور سیاسیات** جنگ ہی کے مسئلہ پر مصری جماعتوں اور سیاست دانوں میں اختلاف ہے۔ عدم مداخلت پسندوں کے لیڈر شاہ فاروق ہیں۔ گو شاہ فاروق محض برائے نام حکمراں ہیں مگر درحقیقت وہ بہت سے اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ شاہ موصوف اپنے باورچی، موٹر ڈرائیوروں اور موٹر سائیکل سواروں محافظوں سے لے کر محل کے خاص انجینیر داکرٹا دیرد کی تک بہت با اثر اطالوی جماعت سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے والد شاہ فاروق نے اٹلی میں تعلیم پائی اور اطالوی فوج میں تربیت حاصل کی۔ ان کے مشیر خاص عرصے سے نرم رو علی ماہر پاشا شاہی جماعت کے لیڈر رہے ہیں۔ حال ہی میں برطانوی سفیر سر مائلس لیمپسن نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اٹلی اور جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور اسی مسئلہ پر انھوں نے گزشتہ جون میں استعفیٰ دے دیا۔

مصر میں بہت سے سیاست داں بھی ہیں جو جرمنوں کے تو خلاف ہیں مگر برطانیہ کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ سابق وزیر اعظم صابری پاشا بھی ان ہی میں سے تھے۔ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں وہ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ موجودہ وزیر اعظم حسین سری پاشا بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مصر کی موجودہ سیاست میں محال مجسم یہ ہے کہ سعدی یا قومی جماعت جرمنوں اور اطالویوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیئے چلا رہی ہے اور یہی جمعیۃ برطانیہ کے سخت خلاف رہی ہے۔ سعدی کہتے ہیں کہ مصر کا آزاد قوم کی حیثیت سے وقار اور اس کا قومی مفاد اس بات کی ضرورت پیش کرتے ہیں کہ جلد از جلد مداخلت کی جائے۔

مصر میں گو عام رائے دہندگی ہے مگر وہاں کے لوگ درحقیقت بالکل گونگے ہیں۔ اور حکومت کے لائحہ عمل بنانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ اہرام مصری بنانے والے غلاموں کی اولاد سے فلاحین ہیں اور یہ آبادی کا بیشتر حصہ یعنی ۱۶۰۰۰۰۰۰ میں۔ ان میں سے نوے فی صدی جاہل ہیں اور صرف دو فی صدی سیاسی احساس رکھتے ہیں۔

فلاحین کی حالت بھی بہت فرسودہ ہے۔ وہ مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ اپنے زمینداروں کا کام دس سنٹ روزانہ پر کرتے ہیں اور فطیری روٹیاں ہیم کھجور اور اکثر گوشت کھا کر زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ آشوب چشم میں مبتلا رہتے ہیں۔

چونکہ وہ جاہل ہیں اس لیے ان کی خبروں کا وسیلہ صرف ریڈیو ہے۔ شام کو وہ گاؤں کے قہوہ خانے میں بیٹھے نارجیل پیتے ہوئے چیختے چلاتے چوسر کی بازی پر بازی کھیلتے رہتے ہیں۔

خبروں کے وقت عقیدت مندانہ خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور تمام حرکات بند ہو جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے جو خبریں اس وقت سنی جاتی ہیں وہ اطالوی نشرگاہ باری سے نشر ہوتی ہیں۔ ایک عربی مقرر وہاں سے برطانیہ کے خلاف پرجوش پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے اور برطانیہ کی زبردست شکستیں سنا کر جذبات کو ادر بھڑکاتا ہے۔ ۳ جنوری ۱۹۳۸ء سے B.B.C. نے عربی میں خبریں اور تقریریں نشر کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور نشرگاہ باری سے برسرپیکار ہے۔ مصر کی نشریات کو مقبول بنانے کے لیئے اس نے ایک مشہور مصری گویئے کو نوکر رکھ لیا ہے جو خبروں کے درمیان رسیلے عشقیہ گانے سناتا ہے۔ یہ تدبیر بہت مجرب ثابت ہوئی ہے۔ مگر برطانیہ اور اٹلی کے متضاد دعوے فلاحین کو سرگرداں کر دیتے ہیں۔ دراں حالیکہ وہ جو کچھ ریڈیو پر سنتے ہیں اسی کو یقین کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ عرب اپنے بھائی کو ایسے نازک مسئلہ

پر کیسے دہوکا دے سکتا ہے۔ اور ہاری اور لندن کے مقرر چاہے عقاید کیسے رکھتے ہوں لیکن سچے مسلمان تو ضرور ہیں۔ [۳۶ء کے معاہدہ کی رو سے مصر کی مدافعت کی ذمہ داری برطانیہ پر ہے اس [illegible]]

بحیثیت مجموعی مصر کے خیالات جرمنی اور اٹلی کے شدت سے خلاف ہیں اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ وہ برطانیہ کے بھی مخالف ہیں۔ مگر مصری اور خاص طور سے وہاں کے سمجھدار لوگ، ممبران پارلیمنٹ اور تعلیم یافتہ طبقہ جو آبادی کا دس فی صدی ہے سمجھتے ہیں کہ صرف برطانیہ کی فتح سے مستقبل امید افزا ہو سکتا ہے اور وہ خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ جرمنوں نے جو ممالک فتح کیے ہیں ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ حکومت کی اس پالیسی کو کہ عربوں میں یہ فیاضانہ جذبہ قایم رکھا جائے کہ وہ برطانیہ کے ساتھ غیر جانبدار رہیں قدر کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی عزت کرتے ہیں لیکن اتنی محبت نہیں کہ وہ ان کے ساتھ لڑ کر جان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

بہر حال مصر کی مداخلت افریقہ میں حکومتوں کے توازن قوت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کرے گی۔ (ترجمہ)

**شفقت اللہ کرمانی بی۔اے (آنرز)**

Books for further reading


Egypt Since Cromer : Lord Lloyd
The problem of Egypt : V. Chirol
The Transit of Egypt : Elgood
Independent Egypt : Emin Yousef
Muhammad Ali : Dodwell
Suez Canal : Wilson
Egypt : Elgood
King Faud : Iqbal Ali Shah

*

# آخر کیوں؟

شہر کے روشن بازاروں میں کھوئے کھوئے چلنے والے گرما کی دوپہر میں جیسے دُھندلے سائے ڈھلنے والے
اونچے اونچے ایوانوں کے مرجھائے کُمھلائے باسی لب سُوکھے آنکھیں اندھیاری چہرے فق چالوں میں اُداسی
بڑی بڑی تنخواہوں والے، سچے اطمینان سے عاری اُن کے جسم امراض کے مخزن گو ملبوس ہیں بھاری بھاری
سیٹھ ہوں یا دفتر کے بابو فرزانے ہوں یا دیوانے سب کی روحیں میلی جیکٹ چیتھڑے جیسے پھٹے پُرانے
شہروں کی البیلی پریاں یا گاؤں کی دوشیزائیں سب کے من میں کھوٹ بھرا ہے اوپر سے چاہے مُسکائیں
لمبے ناموں والے لیڈر، ملک کی ناؤ کھینے والے سب کے سب ہیں زر کے بندے یہ آزادی دینے والے
کالج کی دیوار کے پیچھے ذبح ہوئی غیرت کی دیوی رقصاں ہے تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی
چمٹا ہوا ہے دھرتی سے آکاش سے باتیں کرنے والا راہ کے تنکے چنتا ہے آزادی کا دم بھرنے والا

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ اے بندوں کی سننے والے!
فرش پہ کیوں غمگیں و حزیں ہیں عرش سے تارے چننے والے؟

احمد ندیم قاسمی

# غزل

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زبان تک آ آ کے رہ گئے

پہلے تو عرضِ غم پہ وہ جھنجھلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے سوچ کے شرما کے رہ گئے

وہ کون ہے جو تا سرِ منزل پہنچ سکا
دھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے

بارِ عیادت اُٹھ نہ سکا اُف رے نازکی
تکلیفِ چند گام وہ فرما کے رہ گئے

اب دل سے کیا نکلتے ہیں تیرِ نگاہِ ناز
جو دل میں آ کے رہ گئے بس آ کے رہ گئے

نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار
دیکھا جو یک بیک مجھے گھبرا کے رہ گئے

ہر شکر انتقامِ محبت ہے اے جگر
شکوہ نہیں ہے اُن سے جو تڑپا کے رہ گئے

جگر مرادآبادی

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**نقش اول:**۔ از صالحہ عابد حسین۔ ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحات ۳۴۲، قیمت عگر، سائز 20×30/16 کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی

یہ بیگم عابد حسین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو ایک نئے بھی ہیں۔ ان قصوں میں زیادہ تر ہماری گھریلو زندگی کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں ہیں۔ ہماری تہذیب ہماری معاشرت ہمارے معتقدات ہمارے رسوم و رواج اور ہمارے توہمات غرضکہ ہر چیز اس میں موجود ہے۔ مصنفہ نے عورتوں کی سیرت اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کو بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اصلاحی نقطۂ نظر بھی زیادہ تر پس منظر میں رہی ہے۔ مصنفہ کے قصے ہلکی پھلکی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ در اصل ان کے بیان کی سادگی اور شستہ پن ہے۔

ہماری رائے میں صالحہ صاحبہ اگر ناول نگاری اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ ان کے قصوں سے تشنگی پوری نہیں ہوتی اور ذہن گھریلو زندگی کو تمام تر دیکھنے کا متلاشی رہ جاتا ہے۔ یوں بھی لذیذ حکایت دراز ہونی چاہیے۔ ذرا افسانہ نویسی کے گُروں کے برتنے کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ افسانویت ذرا اور اثر انگیز ہو جائے۔

**گل و گل:**۔ از سید علی عباس صاحب عباس۔ ناشر انجمن ترقی ادب دہلی۔ سائز 20×30/16 صفحات کل ۲۸۰، قیمت عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ عباس صاحب سہارنپوری کے اُردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اردو کلام ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فارسی کلام ۵۰ صفحات پر۔ شروع میں ہدایت محسنی صاحب ایم۔ اے کا ۶۲ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں عباس صاحب کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حضرت عباس سہارنپور کے ایک کہنہ مشق اردو و فارسی کے شاعر ہیں۔ کلام میں پاکیزگی خیال اور

مذاق اور اعلیٰ ادبیت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہ تمام فیض غالب مرحوم کا ہے۔ عباس صاحب غالب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ تمام کلام پر رنگ ان ہی کا چڑھا ہوا ہے حالانکہ تخیل کی وہ نزاکت اور جدت طرازی نہیں پیدا ہو سکی ہے پھر بھی خیالات کی شائستگی اور کلام کی پختگی میں تمام دہلوی رنگ موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

تسخیر کائنات بود التفاتِ دوست　　عالم بکام ماست کہ او شد بکام ما

جن کی دنیا معترف تھی وہ مری خودداریاں　　خوب کام آئیں کہ نذر پائے درباں ہو گئیں

عقل کی خامی کا اے دل گر مداوا کیجیے　　پختہ کارانِ جنوں سے ربط پیدا کیجیے

کیجیے تعمیر ہر ذرہ پہ سو عرش خیال　　دیدۂ دل وقف تعلیم تماشا کیجیے

ترتیب کلام میں ردیف کے بجائے اگر تاریخ کا خیال مدنظر رکھا جاتا تو بہتر تھا۔

**جامِ طہور** :۔ از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی۔ ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ لاہور۔ صفحات ۱۷۱ سائز ۲۲×۳۰/۱۶۔ قیمت درج نہیں۔ کاغذ معمولی کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ مجموعہ اثر صہبائی کی رباعیوں اور قطعات کا ہے۔ شروع ۲۰ صفحوں میں اپنی شاعری کے متعلق مختلف اشارات دیے گئے ہیں جس سے ان کی شاعری کا پس منظر سامنے آجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں خیام، شریک حیات کی موت، گاندھی۔ ٹالسٹائی، اقبال اور ٹیگور سے تاثر پذیر ہوتے رہے۔ بہتر یہ ہوتا اگر رباعیات کی ترتیب بھی ان ہی ادوار کے تحت کی جاتی

اثر صاحب کی شاعری ایک پاک خیال، صوفی منش اور حق پسند انسان کی شاعری ہے۔ اہرمن ویزداں خیر و شر، تزکیۂ نفس، موت و حیات، فنا و بقا، عدم او روجود، جبر و قدر وغیرہ فلسفیانہ مضامین اثر صاحب کے کلام کے خاص جزو ہیں۔ وہ ان مابعد الطبیعیاتی بلندیوں سے بہت کم نیچے اترتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان فلسفیانہ مضامین کو وہ ایسی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شعریت میں سموتے ہیں کہ قاری کا ذہن بغیر کسی قسم کا بار محسوس کیے ایک خاص لذت حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ لطیف، پاک اور منزہ ہوتی ہے چند مختلف حالتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

حوران بہشت کی تمنا بے سود　　ہنگام شباب زہد و تقوی بے سود

لبریز نشاط ہے چمنستان بہار — یا دغمِ دوش و فکرِ فردا بے سود

نیرنگ طلسمِ زندگی کو پایا — آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا

تسکین ہے تو ذکرِ یزداں میں اثر — سر چشمۂ بے خودی اسی کو پایا

گل چوم کے واہ واہ کی ہے میں نے — کانٹا چبھنے پہ آہ کی ہے میں نے

رو دیا ہنس ہنس کے اور ہنسا رو رو کر — یوں چشمِ شب سیاہ کی ہے میں نے

ہنگامۂ روح و جاں ہے حق کی مستی — سیلِ یم بیکراں ہے حق کی مستی

گو تلخ تریں ہے حق کی مے اے ہمدم — خوش باش کہ جاوداں ہے حق کی مستی

اے حاصلِ دہر! تجھ کو حاصل کی تلاش! — اے بر لبِ ساحل! تجھے ساحل کی تلاش!

تو خضر بھی، منزل بھی، رہِ منزل بھی — رہبر کی تلاش کر نہ منزل کی تلاش!

ہنگامۂ فصلِ گل ہے ہنگامۂ رنگ — ہے بربطِ رنگ سے رواں نغمۂ رنگ

مے خانۂ رنگ ہے گلستان جہاں — گل ساغرِ رنگ ہے صبا بادۂ رنگ

رباعی سے اثرؔ صاحب کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ خیام کے ترجمہ کا اسی کے رنگ میں ڈوب کر اگر کسی اُردو شاعر کو حق پہنچتا ہے تو اثرؔ صاحب کو۔

**خدا کی باتیں** :۔ مرتبہ سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب، ناشر دینی بکڈپو بیت السعید کوچہ ناہرخاں دہلی سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۲۹۸ قیمت عہ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

اس کا اصل نام تو الہدیۃ السنیہ ہے لیکن عوام کی رعایت سے 'خدا کی باتیں' رکھا گیا ہے۔ کتاب کے مؤلف یا مترجم یا ناقل حضرت سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب ہیں جن کی شخصیت اس کتاب کے ذریعہ تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ضروری گزارش پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کو حسن اتفاق سے ایک کتاب "حظیرۃ التقدیس" مل گئی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی ہاتھ آگیا۔ کتاب حظیرہ کس کی ہے؟ گزارش کے (الف) پر بتایا ہے کہ ابوالنصر میر علی حسن خاں صاحب کی تالیف ہے۔

سحبان عرب کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جو بات ایک بار بول جاتا دوسری بار ان لفظوں کو نہ دہراتا

حضرت سحبان الہند جو خیر سے "حافظ" بھی ہیں. گزارش ادب! میں علی حسن خاں کو حسن علی خان بول گئے ہیں اور تالیف کو تصنیف فرما رہے ہیں۔ افادہ خاص و عام کی غرض سے آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہ تھی کہ یہ حسن علی یا علی حسن کون بزرگ تھے۔ ورنہ اگر آپ نواب حسام الدولہ صفی الملک ابو النصر میر علی حسن خاں صاحب کو نہ جانتے ہوتے تو بھی کتاب حظیرۃ التقدیس کے ٹائیٹل کو دیکھ کر آپ پہچان سکتے تھے کہ یہ نواب سید صدیق حسن مرحوم کے خلف الصدق تھے۔ اگرچہ اس کتاب کے متعلق آپ معترف ہیں کہ محنت سے مرتب کی گئی اور احادیث صحیحہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے ساری کتاب میں کہیں اپنے اس ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس کے ترجمہ کا۔ اور نہ یہ بتایا کہ آپ نے اور کس قدر اور کون کون صحیح احادیث کا اس کتاب پر اضافہ فرمایا۔

خدا کی باتیں صرف "حظیرۃ التقدیس ہی سے نہیں لی گئیں بلکہ آپ نے لکھا ہے کہ (علامہ مدنی کی کتاب الاتحاف السنیہ اور عبدالرؤف مناوی کی اس کی تلخیص زیر مطالعہ رہی) حیرت ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کا حوالہ کسی حدیث کے ترجمہ کے بعد نہیں دیا گیا کہ معلوم ہو جاتا کہ حظیرہ پر علامہ مدنی کا یہ اضافہ ہے۔ دہوکا ہو سکتا تھا کہ کہیں اس سے یہ مطلب تو نہیں کہ اصل کتب حدیث سے احادیث جمع کی گئیں ہیں لیکن مولانا نے خود تصریح کی ہے کہ اعظم گڑھ جیل میں بحالت قید محض رہتے ہوئے یہ کام ختم کر دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے جمع احادیث کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور تلخیص و ترجمہ حظیرہ سے یہ کتاب مرتب فرما دی کاش ہمیں یہ موقع ملتا کہ ابو الشیخ ابن عدی ابن النجار ابن شاہین محمد ابن نصر ابو علی کی کتابوں کا پتا آپ سے پوچھ سکتے احادیث قدسیہ کی تحقیق کے متعلق ہم آئندہ فرصت میں اظہار خیال کریں گے اس وقت زیر نظر کتاب "خدا کی باتیں" کے متعلق یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (۱) جن متخرجین حدیث (ابو شیخ و دیلمی وغیرہ) کی احادیث لکھی گئیں ان کی تصحیح کیے بغیر ترجمہ مناسب نہ تھا۔ جھوٹی بات عربی زبان میں ہے تو بھی جھوٹی ہے اور ترجمہ ہو کر اردو میں آ گئی تو بھی جھوٹی رہے گی۔ (۲) ان احادیث کے ترجمہ میں احتیاط و تشریح کی ضرورت تھی جنھیں سلف نے متشابہات قرار دیا ہے مثلاً احادیث قدم و ساق، کیا جنت کی کنجی اور دوزخ کے کھٹکے کے مصنف ہوتے ہوئے آپ پسند فرمائیں گے کہ عوام یہ سمجھیں (جن کو سمجھانے کے لیے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے) کہ جس اللہ کی جنت کی ترغیب دی جاتی ہے اور جس کی دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے وہ خود دوزخ میں قدم رنجہ کرے گا۔

اور قیامت میں واقعی اپنی پنڈلی کھولدے گا۔ آپ کی یہ تاویل کہ پاؤں رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ دبا دیا جائیگا کہ سمٹ کر دوزخ چھوٹی ہو جائے اول تو کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ پھر اللہ کے پاؤں کو دوزخ سے نجات کہاں ملی۔ اسی طرح آپ کی یہ تاویل کہ پنڈلی کھولے جانے سے مراد درمیانی درجہ کی تجلی ہے کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ کشف ساق کی تشریح آپ 'مفردات راغب' میں دیکھ سکتے ہیں (۳) غیر مستند کتب حدیث سے روائتیں نہ لینا چاہیے تھیں مثلاً صفحہ ۱۸۱ پر پھر صفحہ ۱۸۵ پر ابو شیخ سے دو قسم کے مرغوں کا حال لکھنا عبث تھا اس حدیث کی سند تو دیکھیئے۔ اسی طرح عقل کے متعلق حدیث کا حال ہے۔ کہ ابن جوزی (دیکھیئے العلل المتناہیہ) اور دوسرے علما کی تصریحات کے مطابق اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۲۰۱ پر جو حدیث ہے اس کی صحت کا پتا نہیں (۴) بعض طویل احادیث کو مختصر کیا ہے لیکن بہتر یہ تھا کہ انھیں نہ لکھا جاتا کیونکہ طویل احادیث کے متعلق علما نے بہت کم کے حافظہ پر بھروسہ کرنے کا موقع پایا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے چھپ جانے سے یہ فائدہ تو ہوا کہ حضرت نواب صفی الملک حسام الدولہ کی کوشش دوبارہ اردو میں آگئی اور ساتھ ہی ساتھ تلخیص الاتحاف کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔ ناقدین کے لیے فکر و نظر کا موقع ہے۔ اللہ اس کتاب کے معاونین کو جزائے خیر دے۔ (ی۔م۔ر)

**بیٹے**: مترجمہ احسان علی شاہ بی۔ اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۲۹۸ قیمت ۲/۱ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ ناول دراصل امریکہ کی مشہور ناولسٹ پرل۔ ایس بک کی مشہور ناول "سنز" کا ترجمہ ہے۔ دراصل موصوفہ نے چین کی زندگی کے متعلق (جس کا انھوں نے اپنے دوران قیام میں بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا) ایک مشہور ناول لکھی تھی جس کا نام گڈ ارتھ یا دھرتی ماتا ہے اس ناول پر موصوفہ کو نوبل پرائز بھی ملا تھا اور جس کا فلم بھی بن کر بہت مشہور ہو چکا ہے 'بیٹے' دراصل دھرتی ماتا کے لڑکوں کی داستان حیات ہے۔ اس ناول میں چین کی مفلس قحط زدہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ایسی پُر الم، بھیانک اور مظلوم ساتھ ہی سچی اور حقایق سے لبریز ہیں کہ بڑا تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کب تک اس روح فرسا غربت اور فلاکت میں پھنسی رہے گی کاش سرمایہ داری کی لعنتیں ختم ہوں تو یہ جنگیں، قحط اور گرسنگی کا خاتمہ ہو۔

احسان صاحب کا ترجمہ بہت سلیس اور با محاورہ اردو میں ہو اور وہ وہاں کی زندگی کے خط و خال قایم رکھنے میں قطعی طور پر کامیاب ہوگئے ہیں۔ امید ہو کہ شائقین اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور مستفید ہوں گے۔

**نغمات نور:۔** از نور صاحب لدھیانوی۔ ناشر حکیم سید ہاشم علی شاہ جیلانی جعفریہ بک ایجنسی رجسٹرڈ نمبر ۲۲۲ قیصر باغ لاہور سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۲۴۴۔ قیمت مجلد ہے غیر مجلد ۱۲/ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔

یہ نور صاحب لدھیانوی کی نظموں کا مجموعہ ہو زیادہ تر نظمیں مذہب اور اسلامیات پر ہیں۔ اقبال سے متاثر ہونے کی کوشش ہر جگہ دکھائی دیتی ہو۔ آخر میں تہنیت نامے، الوداعی نظمیں، تظمینیں سلام اور قطعات اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ اور سب سے آخر میں ۴۰ صفحات میں موصوف کے نثر کے نمونے ادب لطیف کے عنوان سے درج ہیں۔ نظم و نثر دیکھ کر معلوم ہوتا ہو کہ موصوف کی مشق پختہ ہو چکی ہو۔ الفاظ اور بیان پر قابو پیدا ہو چلا ہو۔ نظموں کے موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے رکھے ہیں جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں متاثر ہو سکیں اور اپنی مذہبی باتوں، اپنے مذہبی پیشواؤں کے ذکر سے مستفید ہو سکیں۔ بعض گیت بھی عوام کو بڑے متاثر کرنے والے ہیں۔

**مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش** (جلد سوم) از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۷۶، قیمت غیر مجلد عہ، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا یہ تیسرا مقالہ ہے جو مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کے متعلق لکھا گیا ہو۔ اس میں مقصد محض اس قومیت کے نظریہ سے مسلمانوں کو روکنا ہو جو ان میں مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا ہو گیا ہو نیز یہ بھی بتایا گیا ہو کہ اسلام کے سیاسی و اجتماعی تصورات علمی اور عملی حیثیت سے کیا ہیں اور اس پر بھی زور دیا گیا ہو کہ بجائے قوم کی مشترک وفاداری کے خدا کی مشترک وفاداری سے مسلمان اپنے صحیح نصب العین تک پہنچ سکتا ہو۔ خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں:۔ اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کا نصب العین، مسلمانوں کے لیئے ایک ہی راہ عمل، اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں، اسلامی حکومت کس طرح قایم ہو سکتی ہو، جماعت اسلامی کی تشکیل وغیرہ

# تعلیمی بجٹ

(اس بجٹ کا ایوان فرضی۔ اس کے افراد فرضی اور اس کا نفس مضمون بھی فرضی ہے)

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور کل سے آنریبل منسٹر کو بے حد مصروفیت رہی تھی۔ ان کے پاس کئی ایک محکمے تھے۔ ان کے سرخاب کے پر تو اور تھے، تعلیم تو ان کے کلاہ وزارت میں ایک مرغی کے پر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اور مرغی بھی کڑک مرغی!

کل شام کو انھوں نے فائلوں کے نیچے سے تعلیم کے کاغذات نکالے تو ان پر اچھی خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ انھیں دفتری پر تاؤ تو بہت آیا مگر پھر سوچ کر رک گئے تھے اور جب انھوں نے فائل کھولی ہے تو ایک جھینگر زقند بھر کر زن سے ان کی ناک کے پاس سے گزر گیا تھا۔ اس کمبخت کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ وہ کیسی باوقار ناک کے پاس سے ہو گزرا تھا کیسی باوقار اور کیسی حساس!

ان کے پاس وقت کم تھا بہت کم۔ درختوں کے سایے ان کے ٹینس میدان پر لمبے ہو چلے تھے اور ابھی تک وہ اپنے تعلیمی سکریٹری کو شرف باریابی نہ بخش سکے تھے۔ اتنے میں انھیں نیچے سے چینی کے برتن کھنکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی انھیں یاد آیا کہ انھوں نے آج چند سوشیل قسم کے دوستوں کو چائے پر بلایا ہے۔ انھوں نے فوراً سکرٹری کو اندر بلالیا تھا اس دوران میں بھی ان کی نگاہیں بار بار کھڑکی کے پار جا رہی تھیں ابھی تعلیمی بجٹ کے مباحث پر سرسری سا تبصرہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی نگاہ کھڑکی سے باہر میدان پر گئی اور انھوں نے دیکھا کہ سبز گاہی لان سے پرے کوٹھی کی افق پر ایک قوس قزح کے رنگوں والی ساڑی نمودار ہو چکی تھی۔ اس پر انھوں نے جلد جلد سکرٹری کو رخصت کر دیا تھا۔

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور آنریبل منسٹر اس میدان کے پرانے شہ سوار تھے اس موسم کے بجٹ کی بہت سی ٹٹیاں تو وہ صاف پھلانگ چکے تھے اب تو محض اس کی دم باقی رہ گئی تھی بجٹ کیا تھے اچھے خاصے جنگی قسم کے بیڑے تھے جنھیں چیونگانا اور پار کرنا آنریبل منسٹر کا ہی کام

تھا۔ اور تعلیمی بجٹ، تعلیمی بجٹ تو کاغذ کی وہ ناؤ تھا جسے اگر وہ ایک بار اپنی گھنی مونچھیں لبوں سے اُٹھا کر پھونک ہی دیتے تو آناً فاناً میں پار کیا ہوا کی لہروں پر ہچکولے لینے لگتی۔

مگر اس مرتبہ ان کی خود اعتمادی کچھ ڈانواڈول سی ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ اس بجٹ پر مہتہ جی نے کٹوتی کی ایک تحریک پیش کر دی تھی!

اس کے جواب کی تیاری کے لیے انھوں نے کل شام کو اپنے سکرٹری کو بلایا تھا۔ سکرٹری صاحب نے اس سے پہلے ایک دن اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو اور اس نے اپنے نائب کو اور اُس نے اپنے کلرک کو بلایا تھا۔ مال گاڑی کے انجن کی طرح انھوں نے ایک ریلا جو پیچھے کو دیا تو اس کی دھمک گاڑی بہ گاڑی، اور کہ بہ رو کرآخری ڈبہ تک پہنچی تھی یہ آخری ڈبہ ان کا جونیر کلرک تھا۔ یہ ڈبہ ان جنادری گاڑیوں اور دیوار کے بیچ میں پس کے رہ گیا تھا۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ ان کے درمیان کیوں آیا۔ کیا اسے پتا نہ تھا کہ یہ بھنچائی اور پسائی تو سب سے کمزور کی قسمت میں ہی لکھی ہے۔

ان کا تیار کیا ہوا جواب محض جواب نہ تھا اس کے ہر جملے اور ہر لفظ کے پس منظر میں ایک کارواں تھا جس میں قطار اندر قطار منشی، اسسٹنٹ، سپرنٹنڈنٹ ایک ہی رسی اور ایک ہی نکیل میں پروئے ہوئے تھے۔ اس نکیل کا سرا آنریبل منسٹر کے ہاتھ میں تھا اور اس رسی سے اس پورے بے زبان گروہ کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ اگر اس جواب کا کوئی حرف قابل اعتراض قرار دیا گیا تو اس پورے گروہ کی جان ایک پھوڑے کی طرح ٹیسیں لینے لگے گی۔

غرضکہ یہ تقریر کلرک بہ کلرک ہوتی ہوئی سینہ بہ سینہ نہیں، قلم بہ قلم آخرکار کلرکوں کے میکائیل یعنی ایوان کے کلرک کے پاس پہنچی لیکن جتنی ذمہ داری اسی کمزور اور جھرجھری اینٹ پر ہے جس پر اس قصر استعماریت کا توازن ٹکا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ دفتری حکومت کے طلسم کو ایجاد کرتے وقت کسی منچلے نے ستم ظریفی یہ کی تھی کہ اس کی بنیاد اچھے خاصے نٹ گری کے تاشے پر رکھدی تھی اور حساب اس طلسم کا یہ تھا کہ اگر سب سے اوپر کا نٹ ذمہ داری کے نردبان سے پھسل جائے تو وہ اپنے ماتحت کے عین شانوں اور پشت

پر جا کر ٹکتا تھا۔ اس سے ایک تو چوٹ کم لگتی تھی اور دوسرے اس تحریک سے وہ ماتحت اپنے نچلے
ماتحت پر اسی شان سے نازل ہوتا تھا۔ قس علیٰ ہذا۔ مگر اس مسخرے پن میں کم بختی تو سب سے نچلے ماتحت
کی تھی جس کے نیچے سوائے پتھریلی زمین کے اور کچھ نہ تھا اور یہ بے چارہ اکثر چاروں شانے چت
جاتا تھا اور چونکہ اوپر کے لوگ مادی لحاظ سے بھی بھاری بھر کم ہوتے تھے اس لئے اکثر اوقات
دوبارہ اُٹھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی۔

اب اجلاس شروع ہوا۔ اس کا افتتاح مہتہ جی کی تقریر سے ہوا تھا۔ آج ان کی زندگی کا ایک
سب سے اہم لمحہ تھا اور جب وہ اٹھے ہیں تو انھیں احساس تھا کہ ایک زمانہ کی نگاہیں ان پر اُٹھ رہی
ہیں اور خاص طور سے وہ نگاہیں جو لیڈیز گیلری سے ان پر اُٹھ رہی تھیں یہ تیز تیز نگاہیں ان کے
رخساروں پر چبھتی ہوئی انیاں سی معلوم دے رہی تھیں۔ انھیں نگاہوں کے لیے انھوں نے خون پسینہ
بہا کے یہ تقریر تیار کرائی تھی۔ اور پھر کل پریس میں ان کے الفاظ جلی حروف میں! ان کا نام عوام کی
زبان پر! ان کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی ہوگی! آج دنیا کو پتا لگ جائے گا کہ ان میں کیا
جوہر چھپے ہیں۔

مہتہ جی کی تقریر شروع ہوئی:-

"جناب صدر! میں آپ کی توجہ اس خوفناک بے علمی اور جہالت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں
جو ہمارے عوام پر مسلط ہے اگرچہ ہم آج اس ایوان میں ایک روشن خیال گروہ کے مابین ہیں مگر ماحول کی تاریکی
کے مقابلے میں یہ گروہ ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع سے زیادہ نہیں اور جناب صدر! یہ تاریکی کم نہیں ہو رہی۔
کسی جانب سے ہمیں امید اور آس کا اجالا ابھرتا نظر نہیں آرہا۔ یہ تاریکی کم نہیں بلکہ جیسا اعداد و شمار سے
ثابت ہوتا ہے زیادہ ہو رہی ہے۔ اس کے سایے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اس کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی
ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ یہ تاریکی کہیں مدھم روشنی کے اس دائرے میں بھی جس میں تعلیم یافتہ طبقہ اطمینان سے بیٹھا ہو
ایک دن نہ آ جائے۔ اس محفوظ اور خوبصورت جزیرے پر جس میں اونچے طبقوں نے اپنا ذہنی بہشت بنا لیا
ہے برابر مد کی لہریں چڑھتی جا رہی ہیں ہمیں دیکھنا ہے کہ کسی دن مہلک لہر کا وہ تھپیڑا آئے گا جو ایک مرتبہ

پھر اسے سطح آب کے برابر کر دے گا اور بے علمی کا سمندر پھر ایک دفعہ اپنی اس امانت کو واپس لے گا جو ہم نے صدیوں کی محنت اور خلوص سے اس کے سینے سے چھین لی تھی۔

"جناب صدر! ہماری دیہی آبادی کا یکسر بے علم رہ جانا ایک قومی المیہ ہے اور قوم کے اعضا میں سے ایک اہم عضو کا مفلوج ہو جانا وہ عضو جس سے کہ نظام ملی میں نئے خون کی تولید ہوتی ہے جو قوموں کی قسمت میں نئے ممکنات بیدار کرتا ہے۔ جس سے کہ زندگی کی نئی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ جو غیر ملوث سیدھے سادے قوا، کا منبع ہے وہ قوا جو ایک طوفان کی طرح زور دار اور ایک دریا کی طرح بہاؤ رکھتے ہیں جب روس یا ٹرکی نے ان خوابیدہ قوا کو تعلیم کے ذریعہ بیدار کر دیا تو انھوں نے ملک بھر کو ایک نئے برقی صفت ولولے، ایک نئی زندگی سے بیتاب کر دیا۔

"اگر میں آپ کے سامنے اعداد و شمار پیش کروں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ ہم زندگی کی دوڑ میں کس قدر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ دوڑ جو ہم دوڑ رہے ہیں اس میں سب سے کمزور اور سب سے زیادہ قابل رحم ساتھی ہمارا کسان ہے۔ آج اس بجٹ کے موقع پر میں نے مناسب سمجھا کہ حکومت کی توجہ وقت کے اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرائی جائے۔"

مہتہ جی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے اور ان کی تقریر سے ایوان میں سنسنی سی پھیل گئی تھی، ان کی تقریر روایات کے مطابق نہ تھی، اس تقریر میں جذباتی عنصر نمایاں تھا اور ان کے الفاظ میں وہ توازن اور پر وقار احتیاط نہ تھی جو ایک رکن کے شایان شایان ہے۔ یہاں کے کارگر ہتھیار دو ہی تھے ایک گرمیٔ گفتار اور دوسری نرمیٔ رفتار، گرمیٔ گفتار ہو چکی تو نرمیٔ رفتار کی باری آئی۔

اب آنریبل منسٹر میدان میں آئے۔ ان کی تقریر میں وہ خود اعتمادی اور مربیانہ انداز موجود تھا جو ایک چھ فیٹ کے قد آور ویسٹ اینڈ کے بہترین سلے ہوئے سوٹ سے اُٹھتا ہے اور دل و دماغ دونوں پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دل خوش مزاح کا ترشح بھی ان کی تقریر میں موجود تھا۔ ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، وہ عہدہ اور سماجی لحاظ سے بہت اونچے تھے اس لیے وہ ہر ممبر کے ساتھ بعینہٖ اسی طرح سلوک کر سکتے تھے جیسے چھوٹے بچے خوبصورت پلّوں کے ساتھ کرتے ہیں، پہلے تو چمکارتے ہیں پچکارتے ہیں

اور جب وہ خوشی میں خرخرانے اور دم ہلانے لگتے ہیں تو آہستہ سے ایک چپت سر پہ لگا دیتے ہیں مگر چپت بھی مربیانہ انداز میں ہی لگاتے ہیں کچھ ایسا ہی انداز ان کی آج کی تقریر میں بھی پایا جاتا تھا۔

"مجھے آج فخر ہے کہ میں مہتہ جی کی تقریر کا جواب دے رہا ہوں مہتہ جی ہمارے پرانے کرم فرما ہیں اور ان سے تو ہماری چھیڑ برابر چلتی رہتی ہے اکثر اوقات ان کے سوالات سے جواب دیتے ہوئے مجھے پسینہ چھوٹ چھوٹ گیا ہے (اس جملہ پر مہتہ جی نے اپنے پانوٗ ذرا پھیلا کر جمائے اور ان کی نگاہیں غیر شعوری انداز میں لیڈیز گیلری کی طرف جھکیں) مہتہ جی کی تقریر خود فصاحت کا ایک بہتا ہوا دریا اور معلومات کا ذخیرہ ہے جملہ معترضہ معاف فرمائیے گا انھوں نے کرنل جعفر حسن کے اقتباسات میں سے کچھ پڑھا مجھے اس موقعہ پر جعفر حسن صاحب کو ہدیہ عقیدت پیش کرنا ہے جس دن سے محکمہ تعلیم نے ان کی خدمات شاہی رسالہ سے مستعار لیں اسی دن سے انھوں نے محکمہ کو ایسے شاندار فوجی نظام سے چلایا ہے کہ ہمارا محکمہ خوش انتظامی اور ضبط کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے (اس قصیدہ خوانی میں پندرہ منٹ صرف ہوئے)

"اب میں موضوع بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں حضرات! قابل مقرر نے فرمایا کہ فلاں ملک میں یہ ہوا فلاں میں وہ ہوا اور اس کے بعد یہ ہندوستان میں کیوں نہیں ہوا؛ جناب صدر! میں پوچھتا ہوں کہ میرے ہاں لڑکا ہوا فلاں صاحب کے ہاں بچہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا! ایسی جسارت آنریبل منسٹر ہی کر سکتے تھے، میرے ہاں آج شہزادہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا یہ کوئی منطقیانہ دلیل نہیں ہے۔ جناب صدر! اگر نہیں ہوا تو اس نہ ہونے کی ذمہ داری ہم پر نہیں یہ ذمہ داری لوکل باڈیز پر ہے۔ یہ ذمہ داری ڈسٹرکٹ بورڈ پر ہے یہ ذمہ داری مقامی احباب پر ہے، حضرات! اگر آپ پچھلے بجٹ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ لگ جائے گا کہ ہم لوگ تعلیم پر پہلے سے کتنا زیادہ خرچ کر رہے ہیں ہمارا ابتدائی تعلیم پر ہی خرچ آگے سے تگنا ہو گیا ہے"

ایک ممبر: کیا میں آنریبل منسٹر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ تعداد خواندگان بھی پہلے سے تگنی ہو گئی ہے یا نہیں؟

آنریبل منسٹر (تمکنت آمیز مسکراہٹ سے اوپر کا لب چڑھا کر) جناب صدر! میں تعلیم اور کلچر کے معاملہ میں

مادی اقدار اور ناپ تول کا قائل نہیں ہوں قوموں کی زندگیاں ترازو سے نہیں تولی جاتیں اور نہ ہی ان کی ترقی آنے پائیوں سے محسوب ہوسکتی ہے (اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) مگر جناب صدر! ابھی تو مجھے ان اہم مشکلات کا ذکر کرنا ہے جو تعلیم عوام کے راستے میں حائل ہیں (اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کے چہرے پر ہلکے رنج اور فکر کی بدلی سی چھاگئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس گراں بار بوجھ کے احساس سے دبے جارہے ہیں (اس بوجھ کا اثر ان کی آواز پر بھی معلوم ہوتا تھا) ان میں سب سے بڑی اور سب سے اہم مشکل عورتوں کی کمی ہے (یہاں اُن کی مراد استانیوں سے تھی) کیونکہ اگر عورتوں کی کمی ہوتی تو بچوں کی زیادتی کا سدباب ہوجاتا اور تعلیم عوام کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اتنا شکر ہے کہ آنریبل منسٹر نے یہ نہیں کہدیا کہ ملک کو آج تک پڑھایا ہی استانیوں نے ہے۔ اس معاملہ میں ان سے کوئی چوک تو ہوئی نہیں تھی۔ انھوں نے پہلے سے اپنے اسسٹنٹ کو ایسا تاریخی مواد مہیا کرنے کو کہا تھا جس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتا کہ ایک زمانے میں یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں استاد تھیں لیکن ان دنوں اس غریب کو گھر پر اتنے پردہ لکچر سننے پڑے کہ یہ کام پورا نہ ہوسکا اور پھر جناب صدر! اکثر بچے تعلیم پوری ہونے سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑکر چلے جاتے ہیں اور ہر سو میں سے صرف ۱۸ بچے چوتھی جماعت تک پہنچ پاتے ہیں۔

ایک ممبر "جناب صدر! کیا استادوں کے لیے ایکٹ اسلحہ نہیں ہے۔ اور کیا ڈنڈا قانون کی زد میں نہیں آتا؟"

ایک لبرل ممبر (یہ ممبر آزادی کے اصول کی خاطر ایک دفعہ جیل بھی جاچکے تھے) ہرگز نہیں۔ اگر بچہ کو آزاد اصول پر تعلیم کا حق حاصل ہے تو استاد کو آزاد طریق پر تعلیم دینے کا حق بھی ہے"

اس کے بعد ایک صاحب پچھلے بنچوں سے کھڑے ہوئے کچھ اکڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی ابتدائی زمانے کا انسان انسانی تجربے میں پہلی مرتبہ پچھلے بنچوں پر توازن قایم کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ ایوان کے ان بے زبان گروہ میں سے تھے جو دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں۔

"جناب صدر! میں کچھ ایسا مقرر تو نہیں ہوں تاہم میرے ذہن میں اس وقت ایک خیال آیا ہے جس کا اظہار ملک و قوم کی بہبودی کے لیے ضروری ہے میرے خیال میں جس نے تعلیم نہیں پائی وہ حیوان ہے

محض حیوان"

اتنے میں ایک سیاسیات کے پروفیسر، جو بہت کچھ کھو کر ایوان میں پہنچے تھے ذہنی لحاظ سے نہیں بلکہ مالی لحاظ سے کھو کر، عالمانہ تمکنت سے اوپر کا ہونٹ سکوڑتے ہوئے زیر لب بڑبڑائے۔

اَبے گدھے اگر حیوان نہ ہوتے تو تمھارے جیسوں کو انتخاب کر کے یہاں کیوں بھیجتے"۔ ہابس! ہابس!!! (Hobbes) انسانی ذہنیت کے اس پہلے نباض نے ہی انسان کو سمجھا۔ انسان کو نہیں بلکہ انسان میں جو حیوان ہے اس کو سمجھا اور اصل میں سیاست کی بساط کا اصل مہرہ تو یہی انسانی صورت میں چلتا پھرتا حیوان ہے عوام کی تعلیم! یہ لوگ جو عوام کی تعلیم کا راگ الاپ رہے ہیں انھیں کیا معلوم کہ وہ کس آگ سے کھیل رہے ہیں (خود ہی خود اپنے خیالات سے ایک ققنس کی طرح جوش میں گرماتے ہوئے) تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ تم کس آگ کے ساتھ کھیل رہے ہو، یاد رکھو یہ تو ایک بمب ہے لکھا پڑھا بمب' اَن پڑھ بمب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اَن پڑھ کا سیفٹی والو محض گھونسلا ہوتا ہے اور لکھے پڑھے کا کچھ پتا نہیں کہاں سے کدھر سے پھٹ پڑے (پروفیسر موصوف اکثر اس قسم کی تقریریں کرتے رہتے تھے جس میں وہ خود ہی صدر خود ہی مقرر اور خود سامع ہوتے تھے)

اس کے بعد مہاراج راجینولا نے تقریر کی یہ ممبر ایوان امرا کے درخشندہ ستارے تھے۔ ان کی شہرت کا سبب ان کے مشہور گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے جن کی انھوں نے خاص طور پر تربیت کی تھی۔ اس تربیت میں انھوں نے سائنس کی بہترین اور جدید ترین معلومات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ پچھلے سالوں سے نظریۂ ارتقا نے ایوان کے ممبروں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی اور ایوان میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ انسانی تربیت کی اسکیم تیار کرتے وقت ان تمام تحقیقات کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے جو علم حیوانیات میں ہوتی رہی ہیں۔ اس رجحان کے سب سے بڑے اور سب سے پرجوش معتقد ہمارے راجہ صاحب تھے۔ جہاں بعض ممبروں کا یہ خیال تھا کہ حیوانی ارتقا کے تجربات کے مفید پہلوؤں کا تجزیہ کر کے انھیں انسانی تربیت کے عمل کے لیے استعمال کیا جائے وہاں راجہ صاحب کا شروع میں ایمان یہ تھا کہ انسانی تربیت و تعلیم کو من و عن اسی لائن پر چلایا جائے جس پر کہ ان کے گھوڑوں کی

تربیت کی گئی ہو اور حق تو یہ ہو کہ اگر کسی ہندوستانی کسان کے لیے کھانے پینے رہنے سہنے، دوا دارو کی وہ تمام سہولتیں مہیا کر دی جائیں جو کہ راجہ صاحب کے اصطبل کے ایک پہاڑی ٹٹو کو میسر ہیں تو وہ کسان یقیناً راجہ صاحب سے ذہنی اور علمی لحاظ سے دو چار قدم آگے ہوتا لیکن پچھلے دنوں ان کے خیالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھا لیا تھا۔

راجہ صاحب اس بحث کے لیے اپنے ساتھ ایک ماہر حیوانیات کو بھی لائے تھے۔ جو کہ خاص طور سے اسی موقعہ کے لیے مدعو کئے گئے تھے۔ وہ مہمان گیلری میں موجود تھے۔ اس ماہر فن کا خیال تھا کہ گھوڑے نے اپنی ٹانگوں کی تیزی کش مکش حیات کی جد و جہد میں بڑھالی ہو انھوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس سے ارتقا کی اس رو کو جو گھوڑے کی چاروں ٹانگوں میں چل نکلی تھی ٹانگوں کی بجائے دماغ کی طرف ڈھال دیا جائے ان کا خیال تھا کہ اس زبردست اور اہم انکشاف سے راجہ صاحب کے گھوڑے دنیا بھر کی گھوڑ دوڑ کو اپنی دماغی ترقی کی وجہ سے جیت لیں گے اور دوڑنے میں ٹانگوں کے علاوہ ذہن سے بھی امداد لیں گے اور اس طریق پر ان کی رفتار بے تحاشا بڑھ جائے گی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ سوچ اور فکر کی قوت کے ساتھ ساتھ ان میں کئی ایک اور باتیں بھی پیدا ہوگئیں اول تو ان کا دماغ ان کی ٹانگوں سے پہلے چل نکلا اور سوار کے لیے ان پر توازن رکھنا قریب قریب ناممکن ہوگیا کیونکہ توازن تو جب ہی قایم رہ سکتا تھا کہ سوار کی ران کے نیچے گھوڑا ہو اور گھوڑے کا ذہن بھی ہو پھر بعض اُن گھوڑوں نے جن کے دماغ میں یہ ذکیسین کچھ زیادہ چڑھ گئی تھی ذہنی طریق پر اُڑنا شروع کر دیا۔ اُڑنا تو پہلے بھی کرتے تھے مگر وہ چیز محض شوخیٔ طبع تھی کبھی طبیعت زوروں پر آئی تو پچھلی ٹانگوں کو ہوا میں رقص کا دائرہ کرا دیا۔ یا گردن کو ایک شرمائی ہوئی دلہن کی طرح جو نہوڑایا تو سوار گدے زمین پر۔ اب معصوم بنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کہیئے کیسے مزاج ہیں؟

لیکن اِس مرتبہ کا اُڑنا خالص ذہنی اُڑنا تھا اور اس مرض کے جراثیم جب پہلی دفعہ ماہر حیوانیات کو معلوم ہوئے تو انھیں ایک بار کپکپی سی چڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مرض خطرناک طور پر متعدی تھا اُن تیز رفتار پہاڑی نالوں کی طرح جن میں پانی بڑھنے لگتا ہو تو دیکھتے دیکھتے گزرتے ہوئے مسافر کے

کندھوں سے اوپر ہو جاتا ہے یہ مرض بھی راتوں رات ایک گھوڑے سے دوسرے بلکہ گھوڑوں سے گزر کر کسانوں کو بھی لگ جاتا تھا اور اس کے بعد نہ تو وہ خود محفوظ تھے نہ راجہ صاحب۔

راجہ صاحب کی تقریر میں اِن تلخ تجربوں کا رنگ جھلک رہا تھا اُن کی آج کی تقریر میں سچے عقیدہ کی جھلک اور ان کی زبان میں صداقت کی فصاحت تھی انھوں نے کہا "میرے خیال میں عوام کو پڑھانا ایک ایسا گناہ کبیرہ ہوگا جس کا خمیازہ ہم کیا ہماری آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا ہوگا۔ میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں (چیلنج کرتے ہوئے ان کی آواز ایوان میں گرج رہی تھی اور مارے جذبات کے تھرتھرا رہی تھی) آپ عوام سے وہ رشتہ پیدا کریں جو میں نے کیا ہے تو آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کتنے سچے دل سے تعلیم کے خلاف ہیں میں نے ایک تجربہ میں غلطی کھائی (ان کا اشارہ گھوڑوں کے تجربے سے تھا) میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی ایسا دھوکا کھا جائیں اگر میں اپنے گھوڑوں سے ایک مرتبہ بھی پوچھ لیتا تو وہ ضرور ہنہنا کر کہتے کہ ہم تو بغیر اس ارتقائی عمل کے گھوڑ دوڑیں جیت لیتے ہیں ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو سوال میں اپنے گھوڑوں سے کرنا بھول گیا آپ عوام سے کریں وہ ضرور آپ سے کہیں گے کہ سرکار ہم تو بغیر تعلیم کے ہی سماج کی خدمت کر رہے ہیں ہمیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے"۔

راجہ صاحب کے بعد ایک مدراسی ممبر نے تقریر شروع کی۔ نواب صاحب آج شاید پہلی مرتبہ کسی تقریر کے دوران میں بیدار ہوئے تھے اور بڑے آدمی تو ٹھیرے ہی ایک دفعہ نیند اچاٹ ہوئی تو دوبارہ کہاں سے آتے آن کے آرام میں خلل اسی مدراسی ممبر نے ڈالا تھا یہ ممبر ایڈلٹ ایجوکیشن (تعلیم بالغان) کے لفظ کو اس طریق پر ادا کرتے تھے گویا ہوٹزر گن سے گولے چھوٹ رہے ہوں چونکہ یہ لفظ ان کی تقریر میں بار بار آتا تھا معلوم یہ ہوتا تھا گویا کوئی قادر گولہ انداز تاک کر نشانے لگا رہا ہے ایک نشانہ ایسا کارگر بیٹھا کہ نواب صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں دلت ؛ دلت ؛ دلت ادھار۔ دلت ادھار سے انھیں خاص چڑ تھی ان کے علاقے میں اس تحریک کی وجہ سے پچھلی وصولی کے دنوں میں کافی چپقلش رہی انھوں نے ساتھ کے ایک مسلمان ممبر کو ٹھوکا دے کر چونکا دیا "ارے صاحب کیا ابھی سوالات ہی ہو رہے ہیں؟" بات یہ تھی کہ نواب صاحب کی پہلی نیند سوالوں کے مابین ہی کسی نامعلوم وقت پر شروع ہوتی تھی

اور ان کا خیال تھا کہ ابھی تک سوالات چل رہے ہیں، یا کوئی دولت ادھار کا بل پیش ہو رہا ہے۔"
ان کے ساتھی مسکرائے اور کہنے لگے "حضرت یہ بحث تعلیم بالغان پر ہو رہی ہے"
نواب صاحب: "تعلیم بالغان؛ ارے میاں ہمیں تعلیم بالغان سے کیا مطلب؟ میں خوب جانتا ہوں اس تجویز میں برادران وطن کا ہاتھ ضرور ہے۔"

یہ دو ٹوک اور حتمی فیصلہ بادی النظر میں محض جلد بازی کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا لیکن اگر نواب صاحب کے جذبات اور ان کے تاثرات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ایک پورے طوفان کی لہروں سے گزر کر اس محفوظ چٹان پر پہنچے تھے۔ ان کے غصے نے پہلی بھریری تو اس وقت لی تھی جب ان کی نیند میں خلل اندازی کی گئی اور جب دولت ادھار کی غلطی جتائی گئی تو ان کی کیفیت اس لہر کی سی ہو گئی جو ایک دفعہ دریا کے بند سے ٹکرا کر منھ میں جھاگ بھر لائے اور دوسری دفعہ ٹکر کھانے کو تیار ہو اور اس کے بعد تعلیم بالغان! اب تو پانی سر سے گزر گیا تھا ان کے غصہ کے تلاطم نے سب قید و بند ایک ایک کر کے توڑ ڈالے "تعلیم بالغان! حضرت سچ کہیے مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی کیا ضرورت ہے؟"

حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کو اس کا پورا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی مطلق ضرورت نہیں اور یہ فیصلہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی تھا کیونکہ جب سے انھوں نے زمینداری سنبھالی تھی انھوں نے کوئی اَن پڑھ مسلمان دیکھا ہی نہیں تھا زمینداری سنبھالنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے علاقہ کی سکونت چھوڑ دی اور اس کے ساتھ پورا ماحول بھی چھوڑ دیا تھا اُن کے خیال میں نئے زمینداری نظام کے لیے کچھ اس قسم کے عمل کی ضرورت تھی جس سے سانپ اپنی کینچلی اتار کر پرانے ماحول اور پرانے بل سے رخصت ہو لیتا ہے کینچلی بدلنے کے بعد اب وہ شہر کے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ نواب صاحب جدید نظام زمینداری کے اُبھرتے ہوئے ستارے تھے اس تتلی کی طرح جو ابھی ابھی کویے سے پر پھیلائے نکلی ہو جس کا کویا کسی جھاڑی کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گیا اب اس جھاڑی کی نیم تاریک دنیا کہیں دور پیچھے رہ گئی اور زندگی کی نئی پرواز رنگین پروں پر ایک جگمگاتی ہوئی دنیا میں چل نکلی تھی یہ دنیا سِول لائنز کی دنیا پر تکلف ڈنر اور چائے پارٹیوں کی دنیا تھی اس دنیا کے بسانے والے نہیں اس کے سجانے والے

ان کے گوانی خانساماں، فزینڈ وادران کا اینگلو انڈین شوفر تھے۔ خوبصورت تیتری کا بدصورت خول دیہات میں رہ گیا تھا اور اس خول میں ان کے ابا میاں کے خاندانی شاگرد پیشہ بدھو باورچی شبراتی فراش اور کلوا عصابردار کلبلا رہے تھے۔

میرن پور کی زمینداری ان کے ابا جان کے وقت میں اچھی خاصی پسنجر گاڑی تھی جس میں بدھو شبراتی، ننھو اکلوا اور ان کے ساتھ بڑے نواب بھی سوار تھے کوئی اول درجہ میں تھا تو کوئی تیسرے میں اور تیسرے میں جگہ نہ ملی تو کسی پر کر ملازموں کے ڈبے میں ہی ڈھنس گئے لیکن چھمن میاں کے زمانہ میں زمینداری وہ اسپیشل تھی جس کے ٹایم ٹیبل میں میرن پور جیسی جگہ ٹھیرنے کا کوئی وقت نہ تھا میاں شبراتی کی جوتیاں اور بدھو کا زیل دھرا کا دھرا رہ گیا اور چھمن میاں کی زمینداری نے سیدھا لکھنؤ جا کے دم لیا۔

اور سچ تو یہ ہو کہ ایک روشن خیال زمیندار کے ہاں ازمنۂ وسطیٰ کی ان تنگ و تاریک یادگاروں کی کیا ضرورت تھی ذلیل یادگاروں کو تو انھوں نے اسی دن مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس دن کلکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ آج کل کسی شریف گھرانے میں اَن پڑھ ملازم کا ہونا ایک بدنما داغ ہو۔ وہ دن ہو اور آج کا دن نواب صاحب نے جو قبائے زمینداری کی دھلائی کیا گھسائی شروع کی ہو تو ان بدنما داغوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا بلکہ اب تو اس قبا کے بھی نیچے سے ریشے ڈھیلے ہو گئے تھے۔

بڑے نواب صاحب کے وقت میں ڈیوڑھی میں ہر روز مکتب لگتا تھا اور شاگرد پیشہ کے بچے چھمن میاں کے ہم مکتب تھے۔ اور ان کا خلیفہ ننھو بہشتی کا بڑا بیٹا شمو تھا۔ لیکن اب تو چھمن میاں کے بچے مسوری کے ایک یوروپین اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پرانے ملازمین کے بچے باہر سڑک پر خاک دھول میں لوٹتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہو ان کے اس جدید ماحول میں نہ تعلیم کی ضرورت تھی نہ تعلیم بالغان کی اور اگر نواب صاحب اس لفظ پر اس قدر جزبز ہو رہے تھے تو وہ ایک حد تک حق بجانب تھے۔ وہ پورے تیقن سے کہہ سکتے تھے کہ جہاں تک ان کے تجربے کا تعلق ہو تعلیم بالغان کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کے منھ میں ایک طوفان ابل رہا تھا اور وہ اس طوفان کی تندی کو پورے ایوان پر بکھیر دینا چاہتے تھے۔ یہ لپکتا ہوا شعلہ ان کے لبوں تک آتا تھا اور پھر واپس ہو جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ

یہ تھی کہ اب تک وہ جناب صدر کی "آنکھ" اور نہ ہی اس کا اشارہ پا سکے تھے۔ اگرچہ نہ تو ایوان کوئی بزم ناز تھا اور نہ ہی صدر کی آنکھ چشم یار سے کہیں دور کی بھی مشابہت رکھتی تھی لیکن اس نگاہ کو لاکھ بھانے کی کوشش کریں تھمتی نہ تھی اور ادھر رقیبوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی تو بند نہ ہوتی تھی

اس ایوان میں پہنچ کر نواب صاحب کو بعض عادتیں چھوڑ دینا پڑی تھیں اور بعض نے خود بخود ایسی قلابازی کھائی تھی کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئی تھیں۔ اب تک انھوں نے باہمی گفتگو میں جو بات دل میں آئی خوب سنا کر کہی لیکن اب ہر بات کہکر سنانا پڑ رہی تھی یعنی سنا کسی کو چاہتے ہیں اور کہہ جناب صدر سے رہے ہیں۔ جمہوریت کے انجینیر نے انسانی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ ہر طغیانی جناب صدر کے واسطے سے ہو کر پہنچے۔ اس سے نہ صرف جذبات کا زور مدھم پڑ جاتا تھا بلکہ یہ عمل اس قوت جماؤ کا بھی اندازہ لگا لیتا تھا جس کی برکت سے جناب صدر کرسی صدارت پر چپکے بیٹھے ہیں۔ اس عمل میں جناب صدر کو ان کا وزن اور اہلیت جمود خاص طور پر ممد و معاون ثابت ہوتی تھیں

نواب صاحب لاکھ بن بن کر بیٹھے مگر ان کے لاکھوں بناؤ پر ایک پرانا نگاہ کا، غالب آگیا۔ وہ جناب صدر کا اشارہ نہ پا سکے اور ان کی تقریر اَن سنی رہ گئی۔

اب سیٹھ جگدمبا لال کی باری تھی اور سچ تو یہ ہے کہ آج کسی کی باری کا سوال ہی نہ تھا۔ آج کی بحث عقاید اور اصولوں کے بلند معیار پر ہو رہی تھی اور اب تک جو مقررین بول چکے تھے ان کے منہ کے جھاگ اور ان کے پیشانی کے قطروں سے یقین کی بو آ رہی تھی۔ سیٹھ جی بھی انھی لوگوں میں سے تھے عام طور پر وہ اس قدر ٹھنڈے مزاج آدمی واقع ہوئے تھے کہ معمولی مباحثوں کی ہاہمی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا ان کے توازن کو برقرار رکھنے میں ان کی توند بھی امداد دیتی تھی ایک تو اس توند پر دونوں ہاتھ رکھنے سے ایک ابدی طمانیت چہرے پر پھیل جاتی تھی اُس جادو کے کرتے کی طرح جو اہل سیمیا اپنے ساتھ رکھتے تھے اس توند پر ہاتھ رکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا کامیابی و نصرت کا گولہ ہاتھ میں آگیا پھر جب کبھی کسی مسئلہ پر طبیعت حاضر ہوئی تو اکثر توند حاضر ہونے میں حائل ہو جاتی تھی اور جب تک سیٹھ جی اِدھر ذہن کو بیدار اُدھر توند کو ہشیار کر سکیں اس وقت تک کوئی اور رکن تقریر شروع کر چکا ہوتا تھا ان کے توندیل پیٹ پر سے دستِ پا

تقریریں بیسیوں احتجاج گرجتے برستے گزرے کئی طوفان اُٹھے اور ٹھنڈے ہوئے لیکن سیٹھ جی اپنی اس آخری پناہ گاہ کے پیچھے اکثر چین کی نیند سوتے رہے لیکن آج بائیں جانب سے ایک آواز کان میں پڑی جس میں روپے آنے پائیوں کا ذکر تھا اس پر سیٹھ صاحب ہشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک ممبر کہہ رہے تھے۔

"جناب صدر! آپ ہندوستان کے تعلیمی خرچ کا مقابلہ لندن کاؤنٹی کونسل کے خرچ سے کریں یہاں ۲۷ کروڑ کی آبادی پر حکومت کی طرف سے محض ۱۲ کروڑ روپیہ خرچ کر رہے ہیں جو اٹھنی فی کس سالانہ سے بھی کم پڑتا ہے۔ لندن کی کونسل چالیس پچاس لاکھ کی آبادی کے لیے ۱۷،۱۶ کروڑ روپیہ خرچ کر رہی ہے یعنی ۳۸ روپیہ فی کس سالانہ۔ جناب صدر میں حکومت کی توجہ........"

معزز ممبر ابھی جملہ ختم نہ کرنے پائے تھے کہ معلوم ہوا ایوان میں زلزلہ آگیا۔ سیٹھ جی اپنی توند سمیت یکدم پانو پر کھڑے ہو گئے تھے، مارے جذبات کے ان کی توند تھرتھرا رہی تھی اور زبان منہ میں پھڑپھڑا رہی تھی یہ جذباتی زلزلہ دیکھنے والوں کو اتفاقیہ سا معلوم ہوتا تھا مگر وہ ارکان جنھیں اُن آتشیں طاقتوں کا اندازہ تھا جو اس کی تہہ میں بھبک رہی تھیں ان کے لیے سیٹھ جی کا یوں پھٹ پڑنا کچھ ایسا تعجب انگیز نہ تھا۔ اس ممبر نے نادانستہ طور پر ان کی بہت حساس رگ کو چھیڑا تھا۔ ان کی زندگی کا اصول پہلے دام بعدہٗ کلام رہا تھا اور کاروباری دنیا کے اس اصول کو وہ پوری دنیا کے کاروبار پر مسلط کر دینا چاہتے تھے۔

یہ درست ہے کہ سیٹھ جی نے اپنی دولت بیشتر ٹھیکوں میں اکٹھی کی تھی مگر انھوں نے ہمیشہ پہلے بیج بویا اور پھر فصل کاٹنے کی امید رکھی تھی اور بیج کے بونے اور زمین کے تیار کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ صاحب کو ڈالیاں دیں، بابو کی بیوی کو ساڑی اور جمعدار کے بیٹے کو پچھلی دیوالی پر رنگین جنڈول دیا تھا۔ ان کے خیال میں بحث کا سب سے کمزور پہلو یہی تھا بیج ڈالا نہیں گیا اور فصل کی امید کی جا رہی تھی۔

"جناب صدر ان سے (اس کے ساتھ انھوں نے اپنا ہاتھ تقریر کرنے والے رکن کی جانب ایسے انداز سے بڑھایا جو بالکل غیر پارلیمانی تھا) یہ تو پوچھیئے کہ یہ دیتے کیا ہیں جو یہ کچھ مانگتے ہیں، ہمارا کسان حکومت کو کیا دیتا ہے۔ ہمارا تیسرے درجہ کا مسافر ریلوے کو کیا ادا کرتا ہے جناب صدر! ہمارے مالیہ کی ولایت کے مالیہ سے کیا نسبت ہے؟" اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور ان کا ہاتھ اس ہتھوڑے کی

مانند چل رہا تھا جو کسی تابوت میں آخری کیلیں ٹھونک رہا ہو، جناب صدر، اگر ہم حکومت کو کچھ دے نہیں رہے تو ہمیں کیا حق ہو کہ حکومت سے سب کچھ مانگیں میں مانتا ہوں کہ تعلیم عوام کا بنیادی حق ہے مگر یہ بتایا جائے کہ عوام اس حق کے لیے کیا مالی قربانی کر رہے ہیں؟"

سیٹھ جی کی تقریر کا ایوان پر کچھ ایسا اثر ہوا جیسے کسی تلیا کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو جمود کی فضا بدل سی گئی اور ایوان کے تاریک گوشوں میں سے بھی بعض ارکان آگے کو جھک آئے تھے۔ ان میں پنڈت جی بھی تھے۔ پنڈت جی کے لیے یہ موضوع خاص دلچسپی کا باعث تھا۔ علم کے شجر ممنوعہ کو اس ملک میں برہمن نے خود تو اپنایا اور دوسروں کے لیے اسے مسموم قرار دے دیا۔ اور پھر خود اس کے برگ بار حاصل کرنے کے لالچ میں اتنا ہلایا اتنا ہلایا کہ جڑیں تک ڈھیلی کر دیں اور ابد الآباد تک کے لیے اسے ایک سوکھا ٹھنٹھ بنا دیا۔ ہمارے پنڈت جی بھی اسی سوکھے ٹھنٹھ کی ایک اداس بلبل تھے۔ اسی ٹھنٹھ کی آبیاری کی تجویز نے ان کی برسوں کی مردہ طلاقت لسانی کو بیدار کر دیا۔

"جناب صدر! ہندوستان ہمیشہ سے علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے علم و ہنر کی کرنیں پھوٹیں اور ان سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ علم کا گرانبار نخل یہاں پھوٹا، پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ اس کے سایہ میں عوام اور خواص دونوں نے فیضان حاصل کیا۔ اسی سرچشمہ سے ایک طرف مصر و اسکندریہ تو دوسری طرف چین و جاپان سیراب ہوئے۔

"جناب صدر! اگرچہ آج ہماری تعلیمی حالت اس قدر پس ماندہ ہے لیکن میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید اس ملک میں اس قیامت کی تاریکی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ اشوک کے زمانے کے کتبے اس حقیقت کے سچے اور بے زبان ترجمان ہیں کہ اس وقت تعلیم کس قدر عام اور ہر دل عزیز تھی۔ اشوک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا زریں زمانہ ہے۔ لیکن زریں کو چھوڑ کر اگر آپ کانسی اور پیتل کے زمانوں میں بھی دیکھیں تو ہم تعلیم کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ پر اپنا سر فخر سے اونچا رکھ سکتے تھے۔ ابھی پچھلی صدی کے پہلے نصف میں ہی صرف بنگال میں ایک لاکھ مکتب تھے اور آبادی کے چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ جناب صدر! اگر آپ ہمارے صوبوں کے تعلیمی اعداد و شمار کا مقابلہ برما سے کریں تو آپ کو

تعجب انگیز انکشافات ہوں گے۔ آج بھی برما میں لکھے پڑھوں کی تعداد فی صدی ہمارے ہاں سے گنا ہے اور اس کا سہرا برما کے پرانے نظام تعلیم اور پھونگیوں کے سر ہے۔ رگ وید میں لکھا.........

پنڈت جی ابھی تقریر کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب اپنی جگہ سے دفعتاً اچھل پڑے اور کہنے لگے "پائنٹ آف آرڈر سر" اگر پنڈت جی یہی تقریر اس ایوان کی بجائے آثار قدیمہ کے کسی عجائب گھر میں کرتے تو شاید زیادہ حق بجانب ہوتے (فرمائشی قہقہہ) وہاں کے پرانے بت ان کے خیالات کی اصلی قدر کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی زمانے کے بنے ہوئے ہیں جس کی رام کہانی پنڈت جی سنا رہے ہیں۔ کتبوں کی موجودگی سے تعلیم عامہ کا اندازہ لگا لینا میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ کیا پنڈت جی کی مراد یہ ہے کہ ہر کتبے کے نیچے ہزارہا تعلیمی مردے گڑے ہیں۔ (مسلسل قہقہہ)

اتنے میں ایک دوسرے رکن نے دوسرے پنڈت جی کو پرنام کیا "ہے شریان! شما کیجئے کہاں وید بانی کھول بیٹھے۔ یہاں ہریجن ارکان بھی تو بیٹھے ہیں"

اس آخری وار سے تو ان کی خود اعتمادی کا آبلہ سا پھوٹ نکلا۔

پنڈت کو مارے ندامت کے پسینہ چھوٹ گیا وہیں کے وہیں بیٹھ گئے اور ٹیا کھول کر آہستہ آہستہ سر سہلانے لگے۔

اس پر بائیں جانب کے ایک ممبر نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے آج ہندوستان کی فی صدی خواندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ فی صدی بہت کم ہے اور کم سے کم ہوتی جا رہی ہے جناب صدر! کیا کوئی متمدن سماج روح کی اس دردناک افلاس کو، اس ویرانی کو برداشت کر سکتی ہے جو ایک اچھی ابتدائی تعلیم کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ جناب صدر! ایک قوم کی علمی اور ذہنی اٹھان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑوں کو ابتدائی تعلیم کے جاں بخش سوتوں سے زندگی بخشی جائے اور ہمارے تعمیری تعلیم کے نظریے ہمارا ثانوی اور اونچی تعلیم کے لئے شور و غوغا کرنا کیا معنی رکھتے ہیں؟ ہم ملک کی ذہنی زندگی پر ایک ہلکا سا نمائشی رنگ ایک اوپری سی پوت پھیر رہے ہیں مگر اس کے نیچے وہی حیات کی بے حسی، ذہنی کور ذوقی۔ ہمارے ماہرین نے ہمارے لیے تعمیری تعلیم کا سرمایہ بنایا۔ ان کے خیال میں وقت کی مصلحت یہی تھی کہ اونچے

طبقہ کو تعلیم دی جائے اور جب یہ طبقہ علم کے رس سے لبریز ہو جائے گا تو اس سے رس ٹپک ٹپک کر سب طبقوں کو سیراب کر دے گا۔ مگر جناب صدر! وقت نے بتا دیا کہ اونچے طبقہ میں کچھ نہ کچھ امر بیل کی سی خاصیت تھی جس نے پورے درخت کا ست کھینچ لیا اور کھوکھلا خول چھوڑ دیا تقطیر کا نظر فریب فانوس ابتدائی تعلیم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اوپر کی سطح میں کلیاں بھی کھلیں شگوفے بھی پھوٹے۔ مگر زمین کی لاتعداد نچلی تہیں صحرا کی طرح ویران، پتھر کی طرح بے ثمر رہ گئیں۔ انہی نچلی تہوں کی آبیاری کا کام بعض ریاستوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ شروع کیا ہے آج ٹراونکور میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد پچانوے فی صدی ہے آپ کو چین، ٹراونکور یا بڑودہ کی تعداد خواندگان کا مقابلہ....

ایک ممبر: ''پوائنٹ آف آرڈر سر'' معزز رکن کے یہ الفاظ غیر متعلق ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع ہمارا اپنا ملک ہے ریاستیں خارج از بحث ہیں۔ جناب صدر! میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو موضوع کی حدود میں رکھنے کی کوشش کریں۔''

مقرر نے دوبارہ اسی انداز بے نیازی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ گویا کارواں جا رہا ہے اور اس کے لوازمات بھونکتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم اس ہلکے سے اٹکاؤ سے ان کی تقریر کا بہاؤ اور بھی چل نکلا اور اس میں ایک والہانہ شان خطابت اور گرمیٔ گفتار پیدا ہو گئی۔

''جناب صدر!! اب انھوں نے کچکچا کر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بولنا شروع کیا گویا کسی چیز کا عرق کھینچنے کے بعد اس کا پھلیتھن نکالنے کی فکر میں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھالے اور طویلہ کی بلا بندر کے سر! یا ایک دفتر کی بلا کسی دوسرے افسر کے سر نہ تھوپنے کی کوشش کرے ہماری ابتدائی تعلیم الف لیلہ کے اس کبڑے کی نعش کی طرح ہے جس کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنسا تو درزی کے ہاں تھا لیکن اس کی نعش یہودی سوداگر اور کہاں کہاں ہوتی ہوئی بالآخر شاہی مودی کے ہاں پائی گئی ہم چاہتے ہیں کہ جن کے سر ابتدائی تعلیم کی نعش کی ذمہ داری ہے انھیں کے کندھوں پر اس کا جنازہ اٹھایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ کوئی روایتی حجام روغن بلسان مل کر اس مردے کے حلق سے مچھلی کا کانٹا نکال دے اس مردہ پر اس قسم کے کامیاب اپریشن غیر ممالک میں کئے جا چکے ہیں، روس، ٹرکی اور جاپان......

اس پر ایک ممبر آپے سے باہر ہو کر "پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات دوسرے ملکوں کا حوالہ!
جناب صدر! ہمارے غصہ کے بیچ کے نیچے ہی نیچے آستینیں چڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں،
جناب صدر! پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات!"

صدر۔ آرڈر! آرڈر!!

اب بحث کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ صاحب صدر نے پہلے سے ہی اعلان کر دیا تھا کہ ایسے ذرہ عی مسائل کے لیے غیر محدود وقت نہیں دیا جا سکتا۔

ایوان کا یہ دستورالعمل اُن شاندار روایات کے خلاف تھا جس کی مثال خانگی ایوانات اکثر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بھٹیاریوں کی لڑائیاں اکثر دیکھی ہیں جس میں دو پارٹیاں بعینہٖ اسی طرح دو مستقل محاذوں پر جمی ہوتی ہیں جیسے ایوان کا دایاں اور بایاں بازو۔ فرق محض اتنا ہے کہ آئینی ایوان میں صدر کا نشان امتیاز اس کا گرز ہوتا ہے اور نسوانی ایوان میں کالی ہنڈیا۔ نسوانی ایوان میں ہر مقررہ باری باری ایک دوسری کی جگہ لیتی ہے۔ اور عارضی التوا کی صورت میں ہنڈیا کو اُلٹ دیا جاتا ہے لیکن اس ایوان کی ایک امتیازی شان ہے یعنی یہ ایوان زمان و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے۔ یہاں کسی مسئلہ پر کبھی بھی کسی وقت کسی مدت کے لیے بحث جاری رکھی جا سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ آئینی ایوان جو اِس پرانے جمہوری (واضح رہے کہ جمہوریت سب سے پہلے عورتوں میں آئی اور سب سے آخر میں جائے گی) ادارے کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کی سب روایات کو اصلی حالت میں برقرار نہ رکھ سکا۔ اب جبکہ عورتوں کو حق رائے مل رہا ہے ہمیں امید ہے کہ آئینی ایوان کے آداب اور دستورالعمل میں خوشگوار تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی

ارسطو نے ڈراما کے نفسیاتی عمل کو جذباتی تنقیہ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح سیاسی ایوان کے عمل کو سیاسی تنقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ آج کی بحث نے ارکان کے دلوں پر سے غبار سا دھو ڈالا تھا۔ محرک کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی چمک تھی۔ ان کی نگاہوں میں کل کے اخباروں کی سرخیاں رقص کر رہی تھیں اور ان کے کانوں میں دوستوں کی مبارکبادیاں گونج رہی تھیں وہ ایسی بے ساختگی سے اپنی جگہ بیٹھے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا رنگین کھلونا دوبارہ مل جانے کے بعد خوش ہوتا ہے۔ اب بحث کے اخیر میں

جو وہ جواب دینے اُٹھے ہیں تو ان کا گول گیا سا چہرہ ایک شگفتہ تبسم بنا ہوا تھا۔

"جناب صدر! میں آپ اور سب معزز اراکین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نہایت صبر اور اطمینان سے میری تقریر سنی۔ اس بحث کے بعد میرے دل میں آنریبل منسٹر کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے جس جرأت آفریں انداز میں انھوں نے مباحثہ میں حصہ لیا اور جن قیمتی خیالات سے ہمیں سرفراز فرمایا وہ تعلیم عوام کے لئے بڑے نیک شگون ہیں۔ ملک و ملت کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کی تعلیمی کشتی کا ناخدا ایسا مخلص اور حوصلہ مند انسان ہے، مبارک ہے وہ قوم جس کی تعلیمی قسمت ایسے محفوظ ہاتھوں میں سپرد کر دی گئی ہو۔ میں تعلیم عوام کا معاملہ بھی اسی محترم ہستی کو سونپتا ہوں اور اپنی تجویز شکریہ کے ساتھ واپس لیتا ہوں۔"

ان کی تقریر کے بعد جو تالیاں بجی ہیں تو انھیں یوں معلوم ہوا گویا ان پر گیندے کی پتیوں کی بوچھار پڑ رہی ہے۔ ان کا پورا جسم خوشبو سے بسی ہوئی رنگین لہروں میں ہلکورے لے رہا ہے۔ آنریبل منسٹر کی زبان سے تعریف کا ہر لفظ جو ان کی شان میں کہا گیا تھا ان کے دل میں یوں بیٹھ گیا جیسے کسی عنبریں تہہ پر موتی جڑ دیے گئے ہوں اور جب آخیر میں محرک نے ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک سچے شیدائی کا خلوص اور نیازمندی تھی۔ وہی اطمینان اور مذہبی عقیدت جو پرانے مصریوں کے چہرے پر ہوتی تھی جبکہ وہ سال کی حسین ترین دوشیزہ کو دریائے نیل کی نذر کرتے تھے اور اسے لہروں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بہت بڑی بے اصولی نہ تھی۔ کیا ہم اپنے ایمان کو ایک ملّا کے ہاتھ، اپنی صحت کو ایک نیم حکیم کے پاس گروی نہیں رکھ دیتے۔ پھر محرک نے اپنی تجویز کو ایسے مبارک ہاتھوں میں سونپ دیا تو کیا برا کیا؟

عبدالغفور ایم اے

# لکھنویت کیا ہے؟

(سلسلے کے لیے ۱۵ مئی سنہ ۱۹۴۲ء کا رسالہ ملاحظہ ہو)

شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کے کھیل کو باہم ملا کر لکھنوی شعرا نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا لیکن ہر رنگ میں نمایاں خصوصیت پھر بھی صنعت ہی کو ٹھیرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذکر کی ایک مکروہ شکل تھی اسی کے باعث ظہور میں آئی۔ تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ یا باہم تشبیہوں کے اجزا کی تحلیلی ترکیب پر توجہ کی گئی۔ چونکہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت عموماً ناپسند کی جاتی تھی اس لیے ایک نئے انداز میں دوغزلے سہ غزلے چوغزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنؤ کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آکر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔ یہ خیال آفرینی کبھی تو محسوس اشیا کے سلسلہ میں تخیل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وہمی اور تخیُّلی مسایل پر توجہ صرف ہوتی تھی۔ آخر الذکر میں "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" کی مثل بالکل صادق آئی۔ اور شاعری کی کوشش کے سامنے جب ان کے کمالات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی ناامیدی ہوتی ہے۔

صنعت گری کے ہی سلسلہ میں عربی فارسی کی تراکیب کی کثرت جسے ریختہ گو شعرا بالخصوص متقدمین نے بڑی کوشش سے رفتہ رفتہ زبان اُردو سے دور کیا تھا دوبارہ رواج پا گئی۔ اشعار کو مرصع کرنے کے لیے فارسی کی رقصاں ترکیبیں دل کھول کر استعمال کی جاتی تھیں ان کے استعمال کی ایک اور وجہ بھی تھی یعنی لکھنؤ اور دہلی کی حریفانہ چشمک۔ دہلی کے وہ شعرا، جو لکھنؤ میں شاعری کی بزم کے قیام کے وقت سخن گوئی میں مصروف تھے (میر و سودا وغیرہ) ہندی الفاظ، ہندی تراکیب، محاورات ضرب الامثال اور ہندی تخیلات کو بھی ریختہ کا جزو اہم سمجھتے تھے۔ میر کے کلام میں تو یہ خصوصیت

بہت ہی نمایاں ہے۔ ان کے ہاں ہندی کے ایسے سبک اور نازک نگینے جڑے ہیں کہ ان کو بکمال کر فارسی کی میناکاری کی جائے تو سوائے بھدا پن پیدا ہو جانے کے اور کچھ امکان نہیں ہے۔ شعرائے لکھنو نے زبان میں تراش خراش کی آڑ سے کہ زبان پر جراحی کا وہ عمل کیا کہ ہندی کے عناصر بالکل مٹ گئے۔ جن الفاظ اور تراکیب کو شعرائے لکھنو ایجاد کرتے ہیں وہ ان کی لاعلمی پر دلیل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے لیے نہایت موزوں مترادفات دہلی والوں کی زبان میں موجود ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں کون زیادہ فصیح اور بلیغ ہیں تو اس کا انحصار استعمال اور کثرت استعمال پر ہے۔ جس لفظ کو شعرائے لکھنو نے کوشش کر کے ترک کرنا چاہا وہ ترک ہو گیا۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ زمانہ لکھنوی شاعری کے شباب کا تھا اور شعرائے لکھنو کی زبان کو لوگ مستند سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں دربار کی سرپرستی نے اسے اور بھی تقویت پہنچائی۔ دلی والوں کی سلطنت لٹ رہی تھی زبان کو سنبھالنے کا کسے ہوش تھا اور اگر ہوتا بھی تو دلی والوں میں اب وہ کون سی کشش باقی رہ گئی تھی جو دوسروں کو ان کی زبان، وضع قطع اور تراش کی طرف متوجہ کرتی۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی شعرائے لکھنؤ کی اس کوشش میں معاون ہوئی عوام ہر جدید کو لذیذ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ لکھنوی شاعری کا معیوب ترین رنگ اور اس کی مکروہ سے مکروہ صورت بھی ابتدا میں بے حد مقبول ہوئی۔ آخر ان ہی لکھنوی صحبتوں میں امانت کے ضلع جگت اور ان کے واسوخت کی داد ملتی تھی یہی لوگ رنگین اور جان صاحب کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انھی کے ہاں ہر زیہ گوئی کو مرثیہ گوئی کے پہلو بہ پہلو قابل تحسین و آفریں سمجھا گیا۔

صنعت گری میں جس چیز نے زبان کی پگڑی اچھالی وہ معاملہ بندی ہے۔ اگرچہ معاملہ بندی کی ابتدا فارسی شاعری میں ہوئی تھی اور فارسی گو شعرا نے اسے بہ حیثیت ایک خاص فن کے بہت کچھ ترقی بخشی تھی تاہم اردو میں جرأت سے پہلے کسی نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا۔ جرأت کے اس رنگ میں لکھنو کی مہذب سوسائٹی کے نقش و نگار ہیں جس کا نمونہ شعرائے لکھنؤ کے علاوہ۔ سوائے حکیم مومن خاں مومن کے اور کسی کے کلام میں نہیں ملتا۔ لیکن مومن کے ہاں بھی یہ رنگ اتنا شوخ اور بے باک نہیں کہ طبع سلیم اور مذاق لطیف پر گراں گزرے۔ ناسخ کا کلام بیشتر اور آتش کا کمتر اور عام

شعرائے لکھنؤ کا کلیتہً معاملہ بندی کا ایک ناپاک دفتر ہی۔ حالیؔ نے خوب کہا ہو کہ سوسائٹی شاعری کے اثر سے اتنی خراب نہیں ہوتی جتنی خراب سوسائٹی شاعری کو خراب کر دیتی ہی۔

مے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است　　بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

یہ لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی زندگی کا عام پسند رنگ تھا جو شاعروں کے کلام میں جھلک گیا ہی اور جس کی داد علانیہ مجلسوں میں ان شاعروں کو ملا کرتی تھی۔ صنعت گری کی ان تمام صورتوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

رعایتِ لفظی :-

یاد دُرِ دنداں میں مری جان گئی زند　　تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا

وصل کی شب پلنگ کے اوپر　　مثلِ چیتے کے وہ مچلتے ہیں۔

کہیں جو میٹھی نظروں سے وہ دیکھے　　کہوں آنکھوں کو میں بادامِ شیریں

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے　　ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

نہ دکھلایا کسی دن بوند بھر پانی پسینے نے　　ترا چاہِ ذقن اے جانِ جاں اندھا کنواں نکلا

ساری رگیں ہوئی ہیں تنِ زار پر نمود　　بے طاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

پڑی جان اڑنے لگا میرے عیسیٰ　　روئی کا جو تو نے کبوتر بنایا

منھ کو آنچل سے چھپاتے جو تم آکر شبِ وصل　　جلوۂ حسن چراغ تہہ داماں ہوتا

دیکھے قریبِ چشم جو گیسوے مشکبار　　تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزالِ ختن کے پانو

نہ پیس اسے گردشِ آسماں　　کہ ہر استخواں کا رودا ہو گیا

معطر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا　　حباب بحر ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا

دل دیکھ اسے کس کا تماشا نہیں لیتا　　پر چشمِ سیاہ کا یہ بادام نہیں پستا

کر خط سے بوسہ لبِ شیریں ولا نہ ترک　　قند و نبات میں نہیں ہوتا ہو بال کیا

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت　　بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

مرغِ جاں کو تڑپے گی بلی تمھارے دروازہ کی　　رختِ تن کو کاٹے گا چوہا تمھاری ناک کا

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہے باغباں | لالا کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

معاملہ بندی :-

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں | غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے
ڈوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو | نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے | بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا
کھیلتا ہے وہ کبڈی میں بھی کھیلوں جان پر | ہاتھ رکھدوں جی میں ہے قاتل کی ننگی ران پر
منہ پہ منہ رکھا تو بولے کیا خوب | پہلے منہ اپنا تو بنوائیے آپ
انگڑائیاں جو لیں مرے اس تنگ پوش نے | چولی نکل گئی کبھی شانہ مسک گیا
زبردستی لیا بوسہ جو اس کا وصل کی شب میں | بہت جھگڑا بہت بگڑا بہت جھٹکا بہت پٹکا
جان جاں یاد ہے بوسے کیلیے وصل کی شب | منتیں کرنا مرا منھ کو چھپانا تیرا

تشبیہ و استعارہ :- تشبیہات میں شعرائے لکھنؤ نے بیشک اچھا اضافہ کیا ہے۔ راقم السطور کا دعویٰ ہے کہ صرف حضرت محسن کاکوروی کے پاک نعتیہ کلام میں اس قدر تشبیہات اور اتنی پرکیف اور رقصاں ہیں کہ اردو شاعری کے پورے دفتر میں ان کا جواب نہیں۔ انیس کے ہاں بھی تشبیہات کا کمال موجود ہے اور بلاشبہ ان کی تشبیہیں نہایت فصیح اور سلیس ہیں۔ مرزا دبیر کی تشبیہات میں عالمانہ رنگ ہے لیکن وہ بھی بے مزہ نہیں البتہ لکھنؤ کے بعض اور شاعروں نے تشبیہات میں بھی کہیں کہیں رکاکت پیدا کر دی ہے لیکن لکھنوی شاعری کے اماموں نے جن میں مذکورالصدر حضرات کے علاوہ نسیم صاحبِ مثنوی کا نام بھی شامل کرنا چاہیے اس میدان کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ حضرات دہلی کے یہاں اس قدر تشبیہات کا رواج نہیں ہے اور جو ہیں بھی وہ بہت سادہ اور نیچرل میر کے پورے کلام سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کی مثالوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ لکھنوی حضرات کی تشبیہات ملاحظہ ہوں :-

محسن کاکوروی :- سبزہ ہے کنارِ آبِ جو پر | یا خضر ہے مستعد وضو پر
نوبت ہے صدائے قمریاں کی | تیاری ہے باغ میں اذاں کی

محو تکبیر فاختہ ہی | قد قامت سرو دلربا ہی
اک شاخ رکوع میں رکی ہی | اور دوسری سجدہ میں جھکی ہی
سوسن کی زبان پر مناجات | جاری لب جو سے التحیات
غنچے میں ہی خامشی کا عالم | یا صوم سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہی | اور آب رواں طواف میں ہی
سالک ہی چمن میں نہر موزوں | مجذوب ہی شاخ بید مجنوں
ہی صوفی صاف دل صنوبر | تحریک نسیم حالت آور
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہی بھبوت | یا کہ بیراگی ہی پربت پہ بچھائے کمل
لہریں لیتا ہی جو بجلی کے مقابل سبزہ | چرخ پہ بادلا پھیلا ہی زمیں پر مخمل
جس طرف دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں | لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کو نسل

اب انیس کی بعض تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے | جیسے کرن نکلتی ہی گرد آفتاب کے
کہتی تھی یہ زرہ بدن بدخصال میں | پکڑا ہی بیل مست کو لوہے کے جال میں
دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

برچھیوں کے باہم ٹکرانے کی کیسی نادر تشبیہ ہے

تلوار کی تعریف۔

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے
پیراک جس طرح نکل آتا ہی موج سے
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سنال
غل تھا کہ اژدہا ہی نکالے ہوے زباں

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا | تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

ع لہراتی ہو گیا نہر شال سشکم مار

مصحفی کے یہاں ایک نہایت نادر تشبیہ ہو

جو بھر کے منھ کو اس نے نقعفا نقاب الٹا — اِدھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا

حق ہو کہ شعرائے دہلی کبھی ایسی زوردار تشبیہیں پیش نہ کر سکے۔ ہاتھی کی تعریف میں مرزا داغ فرماتے ہیں

فلک آسا وہ ترا فیل کہ جس کے آگے — ریزۂ سنگ و خزف سے ہیں سبک کوہ و دمن

چلتے چلتے جو ٹھہر جائے، پڑے بوجھ ایسا — ماہی زیر زمیں کا بھی تو دہس جائے شکم

ایک اور لکھنوی شاعر کا شعر ہو

عرق آلودہ گردن زیرِ کاکل یوں دمکتی ہو — اندھیری رات ہو برسات ہو بجلی چمکتی ہو

خیال کے دو شعر ہیں۔

افشاں جبیں پہ دوش پہ کاکل چھٹے ہوئے — طرفہ چراغ چلتے ہیں کالوں کے سامنے

ساقی کی مست آنکھ پہ دل لوٹ جاتے ہیں — شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

اچھے صاحب ذاکر کا ایک شعر ہو۔

محد یہ مہوشوں کے پا کا مجمع — ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

مثالیں جس قدر درکار ہوں مل سکتی ہیں طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیجئے۔

---

یہ چیزیں تو صنعت گری سے متعلق ہیں۔ اب لکھنویت کا خاص رنگ یعنی خارجی شاعری ملاحظہ ہو۔ متقدمین شعرا نے اپنے کلام کی بنیاد واقعات اور جذبات پر رکھی تھی اور چنانچہ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ مضمون کی خوبی کو بھی شعر کا جز و ضروری قرار دیا تھا۔ لکھنؤ والوں نے ضد میں بالکل ایک دوسرا رنگ ایجاد کیا یعنی حسن اور اس کی کیفیات سے قطع نظر کر کے محض خارجی متعلقات حسن پر اپنی تمام توجہ صرف کی۔ صرف ناسخ کے کلام سے بعض جستہ جستہ مثالیں پیش ہیں۔ یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں اور شاعروں کے کلام کا جائزہ لیجیے تو یہ دفتر شاید ہی تمام ہو۔

بالے کے موتی ہیں تارے روئے تاباں آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائے گا

اس نے جو پوچھا پسینہ رُوئے عالمتاب کا — بن گیا رومال گویا چادر مہتاب کا

لکھوں کیا حال میں دبلا نہ اپنی ناتوانی کا — ہوا طوق گراں گردن میں وہ چھلا نشانی کا

دمکتا ہو جو کندن سا بدن ہر اک حلقے سے — تری جالی کی کرتی میں ہو عالم کامدانی کا

بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں — وہ ستارہ صبح کا ہو یہ ستارہ شام کا

کس قدر صاف ہو تمھارا پیٹ — صاف آئینہ سا ہو سارا پیٹ

پہنے کرتی اگر وہ جالی کی — کرے ہر حلقہ کو ستارا پیٹ

نقرئی پٹے کا تو نے نہیں ڈالا مباف — ہو سیہ سارا بدن اور دم مار سفید

گنگری ہو گلے میں کافر کے — دیکھیے جب ہو تان ہونٹوں پہ

پہنے وہ صنم جو پیرہن زرد — ہو جائے سفید یاسمین زرد

دیکھی جو قبا تری بسنتی — پھاڑا گیندے نے پیرہن زرد

رنگ پاں سے سبز سونا بن گئے کندن سے گال
مبتذل تشبیہ ہو سونے پہ مینا ہو گیا

بوسے لیتی ہو ترے بالے کی مچھلی اے صنم — ہو ہمارے دل میں عالم ماہیِ بے آب کا

چھٹے گی کان کی مچھلی نہ زلف جاناں سے — یہ ہو محال کہ جی چھوڑے مار مچھلی کا

آتش رنگ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں — دست جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

ساق سیمیں کی محبت ہو ہمارے دم کیساتھ — اے پری تار نفس بھی تار سیمیں ہو گیا

اگر اس شاعری کے ساتھ ہزل گوئی اور ریختی کو بھی شامل کر لیں تو لکھنوی شاعری کا چہرہ اپنے مکمل خد و خال کے ساتھ نظر آنے لگتا ہو ان دونوں کی مثالیں بکثرت ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے معیار شرافت و متانت سے اس درجہ گری ہوئی ہیں کہ ان کا اعادہ ناگوار ہو جرأت انشا رنگین اور ان کے نامور شاگرد اس حمام میں آکر سب کے سب ننگے ہو گئے۔

اس سے یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے علاوہ لکھنؤ کی شاعری نے اور کوئی صاحب فن پیدا نہیں کیا، پیدا ہوئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ایسے چند نخلستانوں کی طرح ہے جو ایک ناپیدا کنار ریگستان میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں، محسن کاکوروی اور انیس اس قبیل کی درخشاں مثالیں ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام سے ردعمل کر کے لکھنویت کے اس سیلاب کو روکا اور آج لکھنؤ والے جو خود اپنے بچپن کی اس شبیہ کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں وہ ان ہی بزرگوں کا اثر ہے البتہ اس کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ لکھنؤ نے زبان کی حک و اصلاح کے علاوہ بعض اصناف میں ترقی کی، مرثیہ گوئی، مثنوی گوئی اور ڈرامہ نگاری ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہے ان کا بیان کسی دوسری صحبت پر منحصر ہے۔

ابواللیث صدیقی ایم۔اے

# علامہ اقبال کا فلسفہ

**جوہر۔** آئیے باقی صاحب مزاج عالی، ہیں ماہ نومبر کے جامعہ میں اپنے مضمون پر آپ کی تنقید دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

**باقی۔** شکریہ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو اس تنقید سے اتفاق ہے یا اختلاف ؟

**جوہر۔** اگر آپ ناراض نہ ہوں تو اختلاف ہے اور اگر ناراض ہوں تو اتفاق۔

**باقی۔** آپ نے بھی کمال کیا اختلاف تو اتفاق کی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک زینہ ہے۔ جوہر صاحب آپ کے مضمون سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ علامہ کے کلام کی جراحی کرکے ان کی نثری تحریروں سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے پیام کا تعین کرسکیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب سے یہ خام طریقۂ تنقید دور نہ ہوسکا۔

**جوہر۔** باقی صاحب! میں نے مضمون میں اقبال کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سعی میں ان کی شاعری سے بھی مدد لی ہے اقبال کی شاعری پر کسی تنقید یا تقابل کا خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور یہ امر مضمون سے واضح ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم رازِ درونِ میخانہ
مرے ہمصفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے — انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

باقی صاحب! واقعہ یہ ہے کہ اقبال پہلے فلسفی ہیں اور بعد میں شاعر، چونکہ ایشیائی طبایع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے اُس نے اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے اقبال کے فلسفہ حیات کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے اور انھیں احکامات کی روشنی میں علامہ کا پیام عمل ہے۔ یہ آپ نے بھی مانا ہے کہ علامہ کا کلام تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہے وہ بانگ درا کے دور میں تلاش و جستجو کا شکار تھے ان کے دل میں سوالات کا ہجوم تھا۔ پیام مشرق میں وہ ان کا حل سوچتے ہیں اور اس کو مغرب کے سامنے

بیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ میں یہ مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں۔ تعجب ہو کہ آپ اس قدر اعتراف کے بعد فرماتے ہیں کہ شاعر اقبال فلسفی نہیں۔ آپ کی یہ بھی رائے ہو کہ فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ اقبال کو صرف شاعر خیال کرتے ہیں، تو مندرجہ بالا خیال، اس کی تردید کرتا ہو۔ آپ کے نزدیک تو سوال کرنا، جستجو کرنا، مسائل کا حل کرنا اور ان کا علاج کرنا شاعر کا کام ہی نہیں۔ اقبال چونکہ بقول آپ کے ایسا کرتا ہو اور صرف جذبات واحساسات سے نہیں کھیلتا تو آپ کے استدلال کے بموجب اس کو شاعر ہی نہیں کہا جا سکتا ہو اور اگر اس کو فلسفی مان لیں تو وہ (آپ کے نظریہ کے بموجب) شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس ارشاد سے آپ کا یہ مطلب ہو کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی دو الگ الگ چیزیں ہیں تو میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنے مضمون میں اقبال فلسفی کی جراحی کی تھی لیکن میری اپنی یہ رائے ہو کہ علامہ کا مقصد فکر شاعری نہیں بلکہ فلسفہ کا درس ہو، وہ فلسفی شاعر ہو اس لیے آپ کے مجوزہ اصول تنقید جو صرف جمالیاتی وجذباتی شاعر کو پرکھنے کے لیے شاید کافی ہو سکتے ہوں اقبال پر تنقید کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

ق۔ کیا آپ کو ان تین اصولوں سے بھی اختلاف ہو۔ جوہر صاحب وہ تو بدیہیات میں سے ہیں۔

ہر۔ باقی صاحب! یہ بدیہیات ہو سکتے ہیں لیکن علامہ نے ادب کی تنقید کے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ آپ کے مجوزہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اس اختلاف کی یہ وجہ ہو کہ آپ کے نزدیک شاعر فلسفی نہیں ہوتا اور اقبال کے نزدیک وہ شاعر جو فلسفی نہیں یا جس کا کوئی خاص پیام نہیں وہ ایک بدبودار رنگین پھول کی مانند ہو۔ میرا خیال ہو کہ اقبال کے کلام کو اقبال کے مجوزہ اصولوں پر پرکھنا چاہیے۔ اقبال کے معین کردہ تنقیدی اصول پر غور کرنے سے یہ روشن ہو جاتا ہو کہ علامہ اقبال ادب کی تنقید کے لیے اس امر کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ادیب کی وجدانی دنیا کی تعمیر میں کس قسم کے تخیلات سے کام لیا گیا ہو۔ وہ ادیب کی طرز تحریر اور طرز ادا کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے جذباتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے بہت سادگی سے

یہ تحریر کر دیا ہے کہ شاعر وہ ہے جو زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صداقتیں کیا ہیں اور یہیں سے فلسفہ کی حد شروع ہو جاتی ہے یعنی اول تو شاعر کا یہ فرض ہوا کہ وہ صداقت سے روشناس ہو پھر اس کا اظہار شدت احساس سے کرے یعنی پہلے شاعر کو فلسفی ہونا چاہیے پھر شاعر۔ اقبال خود اسلامی تخیل کو شعر کی زبان میں پیش کرتا ہے اور اسلام کے ہر پہلو پر انہماکِ علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ اقبال موجودہ زمانہ کے رجحانات سے رد و قدح کر کے اسلامی نظامِ فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس نظامِ فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہے۔

**باقی۔** تو کیا آپ کی رائے میں ایک جذباتی انسان جو شعور، منطق اور ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنا لیتا ہے شاعر نہیں۔ جوہر صاحب! شاعر وہ ہے جو بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

**جوہر۔** باقی صاحب! یہ بھی ایک نظریہ ہو سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا علامہ بھی آپ کے جمالیاتی اور جذباتی نظریہ سے متفق تھے۔ حقیقت نگار کو جمالیاتی اور جذباتی نظریہ کے مطابق پرکھنا اس کے کلام کی اہمیت کو گرانا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اقبال کا کلام پیش کیے دیتا ہوں جس سے یہ صاف ہو جائے گا کہ ادب کو پرکھنے کے لیے علامہ نے آپ کے اصولوں سے مختلف اصول بیان کیے اور شعر و شاعری کے متعلق ان کا اپنا تصور آپ کے تخیل سے بالکل جدا ہے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر ۔۔۔ گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات ۔۔۔ نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی ۔۔۔ خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

شعر کو خودی کی حفاظت کرنی چاہیے ورنہ جذباتی گورکھ دھندہ رہ جاتا ہے۔ جمالیاتی ادب فسون و افسانہ ہے کیونکہ وہ خودی کو کند کرتا ہے لیکن دقت یہ ہے کہ اگر اس تخیل کو مان لیا جائے تو اردو ادب

کا ایک کثیر حصہ حدود ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔ والٹیر کہا کرتا تھا "جو باتیں اتنی ناپاک ہوتی ہیں کہ ان کو نثر میں بیان کرنا شرمناک معلوم ہوتا ہے ان کو شعر کی شکل میں گا کر بیان کیا جاتا ہے" والٹیر کا یہ قول ہماری جذباتی شاعری پر پوری طرح عاید ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ملو ان دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی (میر)

لیتے تھے لب کے بوسے ہم دیتے تھے منہ میں وہ زباں
ہائے تھے کامیاب عیش دونوں بہم کہ ناگہاں

صبح دمید شب گزشت آہ شبینہ خانہ رفت
روئے سحر سیاہ کنیم یار بہ ایں بہانہ رفت (مومن)

یہ سب اشعار شدت احساس سے احساس کو ابھارنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن اقبال کے نزدیک نہ یہ شعر ہیں اور نہ ان لمحات میں جبکہ ان بزرگوں نے یہ شعر کہے ان کو شاعر کہنا مناسب ہے۔ کہاں ہمارے پرانے شاعروں یہ عصمت سوز جمالیاتی کلام اور کہاں اقبال کا یہ نظریہ۔

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود

مکتب و مے کدہ جز درس نبودن ندہند
بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

جس شاعری سے تعمیر خودی نہ ہو اس پر اقبال آنسو بہاتے ہیں اور باقی صاحب آپ کی جمالیاتی شاعری اسی قابل ہے کہ اس پر نوحہ کیا جائے۔ ہماری شاعری زوال کے زمانے کی شاعری ہے اور شاید اسی قسم کی جمالیاتی اور جذباتی شاعری کو سراہنے کے لیے آپ کے بیان کردہ اصول وجود میں لائے گئے ان شاعروں اور ان کی شاعری کے سراہنے والوں کی بابت علامہ فرماتے ہیں ؎

آہ! وہ کافر بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصر رفتہ کے وہی ڈھلے ہوئے لات و منات

تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دیکھئے باقی صاحب اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہے جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آسکتی اس کی بابت علامہ نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہے۔ اگلے شعر میں علامہ فرماتے ہیں ؎

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے | یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو | جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں | جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر شاعر کی نوا خودی کو نہ ابھارے تو وہ شاعری بیکار ہے۔ ہنر کا مقصد سماجی زندگی کی تشکیل کرنا ہے جس ہنر میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور جو زلف و کاکل کے جمالیات اور بوس و کنار کے جذبات سے آگے نہ بڑھے وہ ہنر نہیں بلکہ بے ہنری ہے۔ باقی صاحب آپ کچھ اکتا سے گئے۔

**باقی۔** نہیں نہیں آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں مفصل جواب دوں گا۔

**جوہر۔** باقی صاحب! میں اس مسئلہ کو اس لیے زیادہ وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے چند عزیز دوستوں نے بھی میرا مضمون دیکھ کر یہی فرمایا کہ اقبال تو شاعر ہے اس کی فلسفیانہ نقطہ نظر سے تنقید بے معنی ہے اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر یہی خیال ذہن نشیں ہو گیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ خود علامہ کے کلام سے نوجوانوں کے اس خیال کی تردید کردوں۔ اقبال جمالیاتی و جذباتی شاعر نہیں ہے بلکہ فلسفی ہے جو حقیقت کو سمجھتا اور سمجھانا چاہتا ہے شاعر کے عنوان سے ضرب کلیم میں علامہ فرماتے ہیں۔

مشرق کی نیستاں میں ہے محتاج نفس نے | شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم | اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو | شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے | بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

جو قوم غلامی میں جکڑی ہوئی ہے اس کے لیے جمالیاتی شاعری سم قاتل ہے جس طرح اگر گھر میں چوہے

قلابازیاں کھائیں تو سکین کو ناچ و رنگ دیکھنا چاہتی کو دعوت دیتا ہے اسی طرح غلامی میں جمالیات کی طرف جانا بربادی ہے۔ اقبال شاعر کو حقیقت سے معرکہ آرا دیکھنا چاہتا ہے جمال سے مبہوت نہیں دیکھنا چاہتا ہماری شاعری کی بابت کہتا ہے۔

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلاویز　　اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ　　از ہرچہ بآئینہ نمایند بپرہیز

شاعر اگر حقیقت آشنا نہیں ہے اور وہ اپنے کلام سے خودی کو نہیں ابھار سکتا تو اس کو خاموش رہنا چاہئے ایک دوسری جگہ ہنروران ہند کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا　　ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں　　زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس　　آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

باقی صاحب یہ ہے آپ کے جمالیاتی ادیبوں کی حقیقت علامہ کی نظر میں جسے آپ اپنی جمالیاتی عینک سے دیکھنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ دراصل جذبات و احساسات بھی کسی فلسفہ اور زندگی کے مطابق ہوتے ہیں شاعر پہلے فلسفی ہوتا ہے پھر اس فلسفہ کی روشنی میں خاص قسم کے جذبات و احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال فلسفی شاعر ہے جو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام ایک خاص قسم کی سماجی زندگی کا موید ہے اس زندگی کی تشکیل کے لیے ایک خاص لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اقبال اس زندگی اس لائحہ عمل اور اس نصب العین کی طرف برابر دعوت دے رہا ہے جو کچھ علامہ نے نظم میں کہا ہے وہی نثر میں کہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے یہ حق ضرور دیں گے کہ میں علامہ کی نظم کو ان کی تحریر کردہ نثر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں اور شعرا کی طرح اقبال کا مسلک یہ نہیں کہ قافیہ اور ردیف نے جو خیال دل میں پیدا کیا اس کو پرشوکت اور دلگداز الفاظ میں باندھ دیا بلکہ وہ قافیہ و ردیف کو فلسفہ

کے تابع رکھتا ہو قافیہ ردیف کی خاطر اپنے خاص پیغام سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا باقی صاحب! آپ کے تینوں بدیہیات علامہ کے بدیہیات سے مختلف ہیں علامہ کے کلام پر تنقید آپ کے زاویہ نگاہ کے مطابق نہیں کی جا سکتی اور اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کے پیغام کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جمالیاتی اور جذباتی شاعری کی بھی سماجی زندگی میں جگہ ہو لیکن ناچ و رنگ کی طرح شام کو ایک آدھ گھنٹہ ہی اس کو دیا جا سکتا ہو اور بس۔

**باقی۔** جوہر صاحب! بڑی دقت یہ آ گئی کہ آپ شعر کی جادوگری کو نہیں سمجھتے۔ دراصل جو خیالات نثر میں معمولی طور پر بیان کیے جاتے ہیں وہ جب شعر بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان میں اتنی رنگ آمیزی، وسعت اور اثر پیدا ہو جاتا ہو کہ وہ کوئی دوسری شئے ہو جاتے ہیں۔

**جوہر۔** باقی صاحب! شعر اور نثر کے طریقہ بیان میں فرق ہوتا ہو لیکن اتنا نہیں کہ نثر میں اگر الحاد کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو جب اس خیال کو نظم کریں تو وہ خدا کے وجود و وحدانیت کا ذکر معلوم ہوگا۔ مثنوی اسرار و رموز تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی اس میں تمام تر علامہ کا وہی فلسفہ ہو جو انھوں نے اپنے مقالوں میں بیان کیا ہو۔ مثنوی کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ در بیان ایں کہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعیناتِ وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔

۲۔ در بیان ایں کہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است۔

۳۔ در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام پذیرد۔

۴۔ در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔

ساری مثنوی میں اسی قسم کے مطالب کا اظہار کیا گیا ہو۔ شاید آپ یہ فرما دیں کہ یہ مثنوی ہے۔ ضرب کلیم کو لیجئے اس کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

اجتہاد۔ تقدیر۔ توحید۔ جہاد۔ قوت اور دین۔ فلسفہ۔ نکتہ توحید۔ خودی کی تربیت۔ خودی کی زندگی عقل و دل۔ تسلیم و رضا۔ مرگ خودی۔ آزادیٔ نسواں۔ وجود۔ دین و ہنر۔ اشتراکیت۔ انقلاب وغیرہ

یہ وہی باتیں ہیں جن کو علامہ نے نہایت جامع طور پر اپنے خطبوں میں بیان کیا ہے۔ کیونکہ نثر میں خیالات کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لیے علامہ کے کلام کو ان کے خطبوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ شعر میں استعارات، تشبیہات حسن ادا وغیرہ اتنی جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں کہ نفس مضمون کی طرف توجہ مشکل ہی سے جاتی ہے لیکن نثر میں تمام تر توجہ نفس مضمون کی طرف رہتی ہے۔ اس لیے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں جو صاحب اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو علامہ کے خطبے پڑھنے چاہییں اور ان پر پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اس کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

**باقی۔** اچھا ان امور کو چھوڑیئے ان کا جواب میں مفصل دوں گا۔ اب یہ فرمایئے کہ علامہ کا فلسفہ کیا تھا۔

**جوہر۔** یہ اب دوسری صحبت کے لیے اٹھا رکھیئے لیکن باقی صاحب! یہ عرض کر دوں کہ آپ نے اقبال کے فلسفہ کی تحلیل جس طرح کی ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔

**باقی۔** اچھا تو رخصت کیونکہ کافی رات چلی گئی اور اگر یہ گفتگو چھڑ گئی تو طویل ہو گی۔ اچھا شب بخیر۔

**جوہر۔** خدا حافظ!

**ایم۔ ایم جوہر میرٹھی**

# مومن کی غزل گوئی

مومن[1] بہت سی باتوں میں اپنے ماحول سے الگ ہیں. کہیں تو اسی پر ترقی کی ہے اور کہیں اپنی انفرادیت الگ قائم کرلی ہے. پہلی بات تو ان کا اپنا غزل کا نظریہ ہے. ان کے نزدیک غزل کو محض لغوی معنوں میں برتنا چاہیئے اور اس طرح غزل کو انہیں مضامین پر محدود کر دینا چاہیئے جو عشق و عاشقی خصوصاً معاملہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں. اس اصول کو جو غالباً ان کی عربی تعلیم کا نتیجہ تھا مومن خاں نے اپنے کلام میں سختی سے برتا اور آخر تک بڑے استقلال سے برقرار و قایم رکھا. یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہم کو وحدت الوجود، ہمہ اوست یا ہمہ از دوست کے مسئلے نہیں ملتے. تصوف کی خیالی بلندیوں پر چڑھنا نہیں ہوتا اور فلسفہ کی پر پیچ دقت سے ہم معاف رکھے جاتے ہیں. ان کے ہاں محض عشق و عاشقی ہے. معاملہ بندی اور معشوق سے باتیں ہیں اور معشوق بھی اسی دنیا کا.

---

[1] **پیدایش**: ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۵-۱۶ھ. ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں نجبائے کشمیر سے تھے. حکیم نامدار خاں و حکیم کامدار خاں دو بھائی عہد سلطنت مغلیہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول جاگیر عطا ہوئی جو بعد کو ضبط ہوگئی اور پنشن مقرر ہوگئی. حکیم مومن خاں ۱۲۱۵ھ میں کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے. شاہ عبدالعزیز نے نام رکھا. عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھیں، طب باپ اور چچا سے. نجوم اہل فن سے. اس کے علاوہ رمل اور ریاضی میں کافی شغف رکھتے تھے. شطرنج سے مناسبت تھی. موسیقی میں طاق تھے اور عملیات میں بھی دخل تھا. شاعری سے عاشق مزاجی کے سبب لگاؤ ہوا. کلام شروع میں شاہ نصیر کو دکھایا.

**تصانیف**:۔ کلیات اردو، کلیات فارسی. انشائے فارسی، رسائل طب (نایاب)

**معاش**:۔ حکیم نامدار خاں کے وارثوں کی جو پنشن مقرر تھی اس میں مومن نے بھی اپنا حصہ پایا اس کے علاوہ کچھ سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی. شاعری یا طبابت کو ذریعہ معاش نہیں بنایا. حالانکہ اکثر مختلف ضرورتوں کی خاطر جہانگیرآباد. بدایوں. سہسوان رامپور اور سہارنپور جانا پڑا لیکن کہیں باقاعدہ دریوزہ گری نہ کی. اور باوجود ذرائع محدود ہونے کے امیرانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے.

دراصل مومن کا یہ نظریہ کئی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایک تو عربی میں غزل کی تعریف دوسرے ان کی خود کی سخت عاشقانہ طبیعت اور تیسرے اس وجہ سے ان پر جرأت کا اثر۔ عربی میں غزل معشوق سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں عاشقانہ اور ایک دوسرے کی تفریح کی ہوں گی۔ اس لئے مومن طبعاً اسی طرف راغب ہوئے اور غزل کو [illegible] اسی معنی میں برتنے میں زندگی گزار دی۔ چونکہ جوانی جوانیوں میں کٹی تھی اس لیے اس کوچہ سے خوب واقف تھے اور واقعی طبیعت پر ظلم کرتے اگر وہ معاملہ بندی کی طرف نہ آتے۔ لازماً جرأت کا رنگ آگیا اور اس کو وہ خود بھی مانتے تھے لیکن جرأت میں اور ان میں کافی فرق ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جرأت کا ماحول تمامتر رنگ رلیوں کا شیدائی تھا۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر ہر ایک پر سرخوشی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ مرفہ حالی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا اور بادشاہ کے اثر سے طبائع اور شاعری دونوں پر مستی چھائی ہوئی تھی۔ صلحا اور زہاد کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ اسی اسباب کی بنا پر جرأت کی شاعری ایک بے دھڑک

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شادی درد کے گھرانے میں ہوئی۔ ساس اور سسر میر درد کی پوتی اور نواسے تھے۔ ایک بیٹا احمد نصیر خاں (ان کے بیٹے محمد نصیر خاں اور بیٹی عزیز بیگم حیات ہیں) ایک بیٹی (عبدالغنی سیتاپوری سے بیاہی گئی) یادگار چھوڑے۔ اسی بیٹی کی تاریخ ولادت کہی تھی

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے　　　کہی تاریخ دختر مومن

۸۱-۱۳۴۰ = ۱۲۵۹ھ

ابتدائی زندگی جوانیوں میں کٹی بعد میں سید احمد رائے بریلوی سے بیعت کی اور صلاح اور تقویٰ میں بسر کر دی مذہبی شغف زیادہ تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل ان کے ہم سبق و ہم جلسہ تھے۔ اکثر جگہ معاندین اور شیعوں پر چوٹیں کی ہیں ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے سے گر کر ۵ مہینے بعد انتقال کیا۔ جیسا خود حساب لگایا تھا ۵۲ سال کی عمر پائی۔

گرنے کی تاریخ خود کہی "بشکست دست و بازو"۔ مرنے کی تاریخ ان کے شاگرد آہی نے کہی۔ ماتم مومن خاں غالب نے لکھا

شرطیست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر　　　خونابہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن　　　چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

شاگرد:۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ مرزا قربان علی سالک۔ نواب اصغر علی خاں نسیم۔ میر حسین تسکین۔ میر عبدالرحمن آہی۔ حکیم سند علی آشفتہ، سالک، قیصر امتہ العاظم صاحب یاس وغیرہ

کلام:۔ شیفتہ کے نسخہ سے آہی نے صاف کر کے مومن کی علالت میں مجتمع کر دیا تھا۔ غزل دردناک اور دلپذیر ترنم سے پڑھتے تھے

چوما چاٹی نظر آتی تھی۔ مومن کا ماحول اس کے برخلاف مفلس اور مولویانہ اور فاضلانہ تھا اس لیے جو بات مومن کو کہنا ہوتی وہ سنجیدگی اور علمیت کے پردے میں کہنا پڑتی تھی کیونکہ سامعین و نقاد وہی لوگ تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ کہ جرأت خود کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اس لیے بشیتر کھل جاتے تھے مومن برخلاف اس کے علوم متداولہ میں کافی وقوف رکھتے تھے لازماً ان کو اپنے پڑھے لکھے کا بھرم رکھنا ہی پڑتا تھا اس لیے پردے پڑے ہی رہتے اور قیس محل کے گرد محض چکر کاٹا کرتا۔

عوام کی تقلید اور پابندی کے لحاظ سے جس کے مومن خلاف تھے یہ تغزل کا نظریہ ایک جدت کہا جاسکتا ہو۔ لیکن مضامین کے لحاظ سے مومن نے اپنے تغزل میں وہی مسلمات برقرار و قایم رکھے جو ان کے زمانے میں مروج اور عام تھے اور اسی تقلید نے ان کے تغزل کو بڑی حد تک محدود بنا دیا ہو۔

حالانکہ مضامین کی اس محدود دنیا میں انھوں نے کافی جولانیاں اور نازک خیالیاں برتی اور دکھائی ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہو کہ گویا ایک محدود آسمان ایک محدود زمین ہو جس میں وہ بجلیاں چمکایا کرتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ یہ کبھی نہیں کرتے کہ کبھی اس فلک کو توڑ کر باہر نکلیں اور اپنا آشیانہ اس عرش سے پرے بنانے کی کوشش کریں یہی وجہ ہو کہ ان کا کلام پڑھتے وقت مسلمات شعری کا ایک خاص کاسہ سر اوڑھ لینا پڑتا ہے جس میں مضامین و تصورات محدود ہیں اور اگر کوئی نازک خیالی ندرت اسلوب یا شوخی ادا برتی جاتی ہو تو اسی محدود دائرہ کے اندر۔

---

مومن رعایت لفظی اور ایہام کے عاشق ہیں اور اس حیثیت سے اپنے دور کے پابند نصیر کے شاگرد

شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے — اب اس گلی میں غیر نہیں پھرتے شام کو

آئے وہ دست غیر میں دیے ہاتھ — آس ٹوٹی شکستہ پائی کی

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے — لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

لے گئی جان یاد رونق ہائے وصل — گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے

کشادِ دل پہ باندھی ہو کمر آج — نہیں خیر آپ کے بندِ قبا کی

منھ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی — واں میں بھی ابھی لیتے ہیں پردہ دری اپنی!

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نہ چکے تھے اور ناسخ کے ماننے والوں میں سے تھے اس لیے ان پر یہ رنگ چڑھ گیا۔ حالانکہ انھوں نے اس کے اور دیگر خصوصیات قبول نہیں کیے مثلاً محاورہ بندی، سنگلاخ زمینیں (ان کو چھوڑ کر جو دیوان سازی کے لیے کہی گئیں) لیکن رعایت لفظی کو وہ قادر الکلامی کی پہچان سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اس کو اصل غایت نہ سمجھتے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی — بات اپنی امیدواری کی

اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا کہ نہ سر اٹھائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو — ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

گر خواب میں بھی اُدھر کو دیکھا — آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو — منھ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو — جی ہی کو ہوا بنائیں گے ہم

آتا ہی گلے سے دہیان تیرے — خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت — کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

بگڑے تو کریں گے اور سے صلح — تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم

لب کا ترے دعوئے مسیحی — مر اور پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری — کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

کیا ذکر ہے ہونٹ چاٹنے کا — کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا — سوتے مردے جگائیں گے ہم

بت خانہ ہیں ہو گر ترا گھر — مومن میں تو پھر نہ آئیں گے ہم

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

اس لب لعل کی شکایت ہے — کیونکہ رنگین نہ ہو کلام مرا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

و

تے لیکن عیار استادی کا ایک ضروری جزو ضرور گردانتے تھے اور یہی مومن اور ذوق کی رعایت لفظی کا فرق ہے کہ اول الذکر معانی آفرینی کو پیش نظر رکھتے تھے اور رعایت لفظی کو مقصود شعر نہیں بناتے۔ موخر الذکر کا نظریہ بالکل برعکس ہے۔ مومن کو یہ شوق دراصل ابتدا میں نصیر و ناسخ سے حاصل ہوا اور اس وقت تک اکثر اشعار محض رعایت ہی کی خاطر لکھے ہیں لیکن بعد کو محض ایک ذریعہ و ترکیب اظہار کا رہ گیا نہ کہ مقصود اظہار لیکن پیچھا عمر بھر نہ چھوڑا۔

لیکن دراصل مومن کا مسلک معنی آفرینی[۵] اور نزاکت خیال ہے حقیقت یہ ہے کہ مومن کی شاعری

---

دیکھا اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہہ التفات ہے

کرہ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا
میرا سوال ہی میرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو
کہتے تھے تاب لائیں گے ہم۔

جراح کیا سوچا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر کو دیکھ کر

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحاں اے جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اب تو مرجانا بھی ہے مشکل ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ذاتی رجحانات اور خارجی معیار و مذاق شعری کی کش مکش کا ایک عجیب مرقع ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری
گنجلک سی نظر آتی ہے۔ یہ مرد میدان آخر تک اپنا میدان پا نہ سکا کبھی زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایات لفظی و
خارجی حسن شعر پر مائل ہو جاتا لیکن اپنی ذاتی افتاد سے مجبور ہو کر اپنی خداداد زور تخیل و نزاکت تخیل کو کام میں
لائے بغیر نہ رہ سکتا کبھی علمیت، دہلوی سنجیدگی اور متانت کا نقشہ پیش کرتا جو ماحول کا اثر تھا لیکن اپنی طبیعت
کی جوانیوں کو کہاں لے کر جائے کہ اس مصنوعی متانت کو چاک کر ڈالنا چاہتی تھیں مختصر یہ کہ پیشہ اور ظاہری
رکھ رکھاؤ اور برتاؤ فاضلانہ تھا لیکن طبیعت شاعرانہ اور متخیلہ تھی مومن اس کشاکش میں ایک لائحہ عمل اپنے
لیے بنانا چاہتے تھے (اور یقیناً ایک خوشگوار رویہ اختیار کر لیتے اگر مرنے پر اس قدر جلد نہ تیار ہو جاتے)
یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کبھی تو غالب کی طرح عوام کی تقلید سے نفرت جدت سے شوق نزاکت تخیل
سے رغبت ملتی ہے اور کبھی ذوق کی طرح محض الفاظ کے الٹ پھیر میں دقت نظری۔ نتیجہ یہ کہ محض گنجلک
حاصل ہوا جسے ہم ان کا خاص رنگ کہتے ہیں۔ نہ تو لکھنوی خارجی کمالات آئے نہ دہلوی حسن بیان، سلاست
سادگی اور روانی میں پختگی اپنے ماحول سے باوجود اپنی صلاحیتوں کے زیادہ ہونے کے زیادہ بلند نہ ہو سکے
اس لیے ہم ان کو ذوق اور غالب کے درمیان کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔

بعض طبائع دقت پسند ہوتی ہیں اور ان کو گرہیں ڈال کر کھولنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے
ان کی قدرت گرہ کشائی بروئے کار آتی ہے اور عوام سے بلندی ظاہر کرتی ہے۔ مومن یقینی اسی قسم کے لوگوں
میں سے تھے ان کی نازک خیالی مضمون آفرینی اور دقت نظری کچھ تو اس سبب سے اور کچھ متاخرین شعرا،

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں

قتل دشمن کا ہے ارادہ اسے — یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

حیرت حسن سے یہ شکل بنی — کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

نہ ربط اس سے نہ یاری آہ — جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے

کس طرح مایوس ہوں تاثیر کے — دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

فارسی کے مطالعہ سے نہ صرف وجود میں آئی بلکہ اُن اثرات کے سبب سے مغلق اور دقیق ہوگئی۔ یہ گنجلک یا اغلاق مومن کے یہاں عموماً مبالغہ کے دوراز کار ہونے یا ایہام و رعایت لفظی پر شعر کے مبنی ہونے یا استعارہ در استعارہ کے استعمال یا بڑے خیال کو مختصر کرنے کی خواہش (جس کی وجہ کر اکثر الفاظ حذف کر دینا پڑتے ہیں) سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے تخیل کو بھی ایک فن بنا لیا تھا اور تعجب یہ کہ اپنے جنونی شعروں میں بھی یہ التزام قایم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار محض دماغی معمے ہو کر رہ گئے جن کو حل کر لینے پر بھی کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا تعلق نفسیات بشری سے نہیں بلکہ معقلیات سے ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کی تڑپ نہیں بلکہ تعقل انسانی کی پیچیدگیاں ہیں ؎

شاعری اپنی ہوئی نیرنگیٔ دانشوری جو سخن ہے سو طلسم راز بطلیموس ہے

اور یہی غالب و مومن کے درمیان بڑا فرق ہے۔ غالب کے مشکل اشعار حل کرنے پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور کائنات یا فطرت انسانی کا ایک نہ ایک مخفی راز کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن مومن کی گتھیاں سلجھانے پر محض گتھیوں کا سلجھانا ہی ہاتھ آتا ہے۔ مومن کے اشعار گویا ان کی شطرنج کے نقشے ہیں جن کے حل کرنے پر محض اسی بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ حل ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے۔ علو تخیل اور بلندیٔ فکر نہیں

بظاہر مومن توبہ کر چکے تھے لیکن جن باتوں کے عمل سے انھوں نے توبہ کی تھی اب وہ محض شعر ہو کر رہ گئی تھیں یہی وجہ ہے کہ مومن معاملہ بندی کے معاملات میں اپنے صحیح رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ماحول اور علمیت کی وجہ سے متانت کا رکھ رکھاؤ برتتے لیکن طبیعت کو نہ مارتے۔ ان کا عشق مجازی و بوالہوسی کی طرف مائل ہے لیکن پستی اور ابتذال کم ہے اور ان کے معاملے بیشتر کسی پردہ نشین سے ہیں معاملہ بندی دراصل گرمی تصورات کا نتیجہ ہے اس لیے اس بیان میں تسلسل ہو تو خوب ہے۔ مومن کی معاملہ بندی[۵] میں تسلسل اکثر ملتا ہے خصوصاً جب وہ خود

---

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنے کسی معشوق سے خفا ہو جاتے ہیں۔ مومن اور جرأت کی معاملہ بندی میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے جائے واں بنے ہو نہ بن جائے چین سے
کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں
کرتا ہے ظلم کون کسی پر تری طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب
وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز
باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں
اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہیئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

دیکھیے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست
شیخ صنعا کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب ہیں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا تم نے آنے کا وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی کہ مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے بے وفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کہ مومن اپنے کیے کو برا سمجھنے لگے تھے جرأت برخلاف اس کے اسی کو اچھا سمجھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رات کس کس طرح کہا نہ رہا — نہ رہا پردہ مدعا نہ رہا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے — جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

مومن اس بت کی نیم نازی پر — ہم کو دعوئے اتقا نہ رہا

جیسا مجھے آرام ترے ہاتھ سے آیا — اللہ کرے یوں ہی ترا سینہ بھرا ہاتھ (ہو)

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا — الجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کیا

کود کر گھر میں تو پہنچا میں ترے پر کیا کروں — دم نکل جاتا تھا کھٹکے سے برابر رات کو

یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی — مر گئے ہم دیکھ کر چین ہائے بستر رات کو

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند آ گئی — یہ سوچ ہے گیا نہ ہوا عدا کے خواب میں

نیند میں یارب ڈوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا — ہے زمیں سے روشنی افلاک نور افشاں تلک

شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر — سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر

لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر یہ کہ یاد آیا — کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ تھہ تھہ کر

اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھائے — کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

ہائے رے چھیڑ رات سن سن کے — حال میرا کہا کہ کیسا صاحب؛

وحشت سے مری سارے احباب چلے گئے — آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

کشاد دل پہ باندھی ہے کمر آج — نہیں ہے خیر آپ کے بند قبا کی

کیا جب التفات اس نے ذرا سا — پڑی ہم کو حصول مدعا کی

ہیں پاک نظر ہم تو دلے ذوق فزا عشق — بے چاشنی بوسہ دشنام نہ ہوگا

غیروں سے اس نے چھوڑی ہرگز نہ ہاتھ پائی — جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہنچا

اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ — گھر میں مرے رہ جاؤ آج آئے ہو کل جانا

غیر کو سینہ کھے ہے سیمبر دکھلا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

طنز[ـه]، تعریض اور مکرِ شاعرانہ[ـه] جو محبت کے خاص چونچلے ہیں اسی معاملہ بندی کے تحت میں آتے ہیں اور

---

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کوئی بھینچے ہے دل کو پہلو میں — کس نے کی اس سے ہمکناری آج

پھرتے ہیں سو سو وسوسے جی میں دل میں سودے گتے ہیں — کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچہ میں — ولولہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں

کرتے ہیں آوازِ فقیری، دیتے ہیں دستک سو سو بار — گھر میں پتھر پھینکتے ہیں زنجیرِ در کھٹکاتے ہیں

اب اغیار سے ہاتھا پائی ہے کیوں — نزاکت بس اے نازنیں ہو چکی ؛

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے — خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی — ان کو بے تابی ہے کیوں اس خواب کی تعبیر سے

ارمان نکلنے دے بس اے بیمِ نزاکت — ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیرِ کمر ہے

اس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا — خط بھی لکھا تو سلام اس میں رقیبوں کا لکھا

(ـه ، ، ،) دیکھیے غزلِ مسلسل گزشتہ صفحہ پر یا غزلیں جن کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

توبہ ہے کہ ہم عشقِ بتاں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

منظورِ نظرِ غیر بھی اب ہمیں کیا ہے — لے دید تری دید سے دل پہلے بھرا ہے

گر نہیں ملتے ملوں گا اور سے — کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

کیونکر نہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

ـله سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیے دل اپنے راز داں کے لیے

شبِ ہجر میں کیا کیا ہجومِ بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اب اور سے جی لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

سہہ سکے نا درست تری خو بگاڑ دی — ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اس میں شک نہیں کہ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے مومن نے اس میں داد سخن خوب اور بہت کافی دی ہے اور جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو متانت و بزرگی کا وہ جامہ تصنع جو انھوں نے اوڑھ رکھا ہے شانوں سے کھسکتا نظر آتا ہے۔ شاعرانہ مکر کے مومن موجد ہیں اور خاتم بھی۔

شوخی[۱] و ظرافت کہ فطری ہے نیز اُس زمانہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ مومن کے ہاں بہت شوخ اور

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے — اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

(۱ ؎ ” “) ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں — عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

سرمگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو — خاک میں نام کو دشمن کے لگاتے کیوں ہو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے — اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے زاہد — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار رہا ہے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق — ناصح ہی کوئی آؤ گر افسانہ خواں نہیں

گو حسد سے ہو پر اب بھی ہے دہی ناصح کی یاد — ناحق اس جان جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن — مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

جو ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہوں گے نہ کر — بس مرے سامنے حوروں کا بیاں اے واعظ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

مومن کو سچ ہے دولت دنیا و دوں نصیب — شب بتکدہ میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

پی ہے جو حضرت مومن نے جبھی مضمضہ کو — آفتابے کئی ہنگام وضو کرتے ہیں

یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے — کر تو ہی ذرا ناصح پیغامبری اتنی

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ثواب ترک صنم سچ سہی مگر مومن — یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

کر چکا ہوں اس کا اخلاص بتاں میں امتحاں — میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہد سالوس ہے

زیادہ ہے۔ واعظ، ناصح اور زاہد کی جس کامیابی سے اور جی کھول کے دھجیاں انھوں نے اڑائی ہیں اور جس قدر حملے انھوں نے کیے ہیں، اتنی کامیابی سے غالباً کسی نے نہیں برتے۔ در اس کی وجہ خاص کر یہ تھی کہ ان کے دل میں بھی سخت اور کٹر ناصح بسا ہوا تھا

مومن کی شاعری میں ان کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو اندرونی باتیں بھی حائل تھیں یعنی ان کی علمیت[1] اور مذہبیت۔ علمیت کی وجہ سے وہ اکثر اوقات کسی نہ کسی علم کی اصطلاح لے آتے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا سمجھنا یا شعر کا حل مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی شعریت ان کی علمیت پر غالب ہے پھر بھی جب کبھی وہ شعر بناتے ہیں تو یہ علمیت ضرور سامنے آ جاتی ہے۔ تصوف میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے (اور اسی لیے ان کا معشوق زمین ہی پر رہتا تھا ورنہ وہ شعر میں مذاق زمانہ کے مطابق خوب کھپ جاتا اور یہ خشک علمیت گراں نہ گزرتی)، مذہبیت دوسرا روڑا تھا۔ تمام خاندان ان کا سخت قسم کا مسلمان، خود موحد۔ عامل بالحدیث اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مذہبی اصطلاحیں آ جاتی ہیں اور اکثر بندا در ظاہر دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں مناظرہ یا وعظ میں ہوں تو لطف دیتی ہیں۔ شاعری میں ذرا اکھل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔

طرز ادا مومن کا خاص گر اور جوہر ہے۔ جب کبھی رعایت اور صنائع کے پیچ سے اس طرف آتے ہیں تو اپنے خاص رنگ میں ہوتے ہیں۔ ندرت اسلوب کی خاص کر ان کے یہاں بے حد فراوانی ہے کبھی نادر تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں کبھی کسی امر کو مسلم مان کر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں

---

[1] صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے — رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب

کیوں نہ مجھ سے رہ وہ مہوش اب زیادہ ترکرے — بدگماں ہو سبعہ سیارہ کی تسخیر سے

علاج جواب راست ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ — آکے میری نعش پر وہ رو گیا

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا — ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

وغیرہ وغیرہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی ندرت اسلوب دقیق زیادہ تھی بجائے لطیف ہونے کے البتہ شوخیٔ ادا میں کافی خوشگوار شوخیاں دکھلائی ہیں۔ ان کی جدید فارسی ترکیبیں ان کی مشکل پسند طبیعت اور فارسیت کا نتیجہ ہیں۔ ان کے کلام میں جگہیں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اکثر خوب ہیں۔ لیکن بیشتر لائی ہوئی ہیں نہ کہ آئی ہوئی اسی لیے رواں اور رائج نہ ہوسکیں۔ ان کی ترکیبوں اور غالب کی ترکیبوں میں بھی فرق تھا۔ جدید ترکیبیں وہ بھلی معلوم ہوتی ہیں جو جوش تصور سے بن جائیں نہ وہ جو ایک ریاضی داں یا انجینیر سوچ کر نکالے۔ شاعری میں عموماً ترکیب کی جدت جوش تصور اور وسعت تصور کو چند الفاظ میں محصور کر دینے کی تدبیر ہوا کرتی ہے خواہ کسی تشبیہ کی بابت ہو یا واقعہ کی بابت۔ مومن کا جوش تصور تعقید پسند تھا نہ کہ وسعت پسند۔ اس لیے ان کی تشبیہوں میں حرکت نہیں ہے اور انجماد کی وجہ سے ان کی تراکیب بھی روشن اور اتنی دلکش نہیں ہیں جتنی غالب کے یہاں۔

مومن اپنے مقطع سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ مومن کی رعایت سے بت پرستی اور کافر پرستی کے مضامین نہایت آسانی اور خوبی سے لائے جاسکتے ہیں۔

مومن عرصہ تک روشناس نہیں ہوسکے جس کی وجہ خاص ان کی تعقید تھی۔ اس کے علاوہ انھیں حالی یا آزاد جیسا شاگرد نہ ملا کہ موجودہ طرز تنقید کے مطابق انھیں اجاگر کرتا بلکہ صاحب آب حیات و گلستان بے خزاں نے تو ان کے کمالات پر شروع میں پردہ ہی ڈال دیا تھا لیکن اب جبکہ مومن روشناس ہوئے ہیں انھیں غالب کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھی زیادتی ہے۔ دونوں کے طبایع مختلف۔ افتاد مزاج جداگانہ، ایک کر کے توبہ کرنے والا، ایک توبہ کو اپنی ہتک سمجھنے والا۔ ایک کٹر مومن مسلمان دوسرا صرف انسانیت میں اعتقاد رکھنے والا۔ تغزل کا نظریہ بھی جداگانہ۔ مومن کی غزلوں میں محض تغزل ہے غالب کے یہاں گوناگوں جذبات کے علاوہ تصوف۔ اعتقادات و فلسفہ بھی ہے یعنی تخیل کے میدان میں ایک محدود ہے دوسرا لامحدود۔ ایک کے یہاں بے چینیٔ روح ہے دوسرے کے یہاں محض بے چینیٔ دماغ۔ ایک کا تخیل تمام نفسیات انسانی کی سیر میں مصروف ہے۔ دوسرے کا محض ایک ہی جذبہ کے تلطف میں گرہ در گرہ۔ ایک کی زندگی تمام تر بے چینیٔ خیالی، جذباتی۔ اعتقادی اور دنیا کی طرف سے۔ دوسرے کی زندگی تمام تر منظم یعنی مومن

مالی حیثیت سے مطمئن تھے۔ جذبات آسودہ، اعتقادات مستحکم اور اٹل ظاہر ہی کہاں وہ دماغ پریشاں کہاں
یہ روح مطمئن اور وجہ یہی ہی کہ مومن تھوڑا بہت لفظی صناعی سے کہ مثل علائق دنیوی سی ہو وابستہ رہے اور وہ
روح بے چین کہ آزاد تھی اس مایا میں نہ پھنس سکی مومن اگر عمر طبعی پاتے تب بھی غالب تک نہ پہنچ سکتے
اکثر جگہ یہ صحیح ہی کہ ہم طرحی غزلوں میں مومن کے اشعار غالب سے بہت کم نہیں معلوم ہوتے یا اکثر فارسی
ترکیبیں مومن کی بھی کچھ کم عمدہ نہیں ہیں لیکن ان اشعار میں خوبی محض فن کی ہی جس میں مومن اس زمانے کے
معیار کے مطابق غالب سے کم نہ تھے لیکن تنوع مضامین اور طرفگی ادا کی مقابلتہً کمی کی وجہ سے اب
مومن و غالب کے مقامات نہایت آسانی سے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ دونوں کی دماغی قابلیتیں
عوام کی سطح سے بہت بلند تھیں ایک مسلم حقیقت ہی لیکن روش دونوں کی جداگانہ تھی ورنہ ایسے معاملہ بندی
کی باتیں تو ہر عاشق شاعر کے یہاں ایک ہی جیسی ملیں گی۔

نورالحسن ہاشمی

# فانی کی موت

## ایک منظر

(اندھیری رات ۔ آسمان تمام سیاہ نظر آرہا ہے ۔ اس سیاہی میں صرف دو تارے جگمگا رہے ہیں ۔ ایک تارہ کہتا ہے)

**ایک تارہ** - پرتو ظلمت سے میرے نور میں یہ آب و تاب
منظر تاریک ہے یا روشنی کا انقلاب!

سرفرازی کو مری تھامے ہوئے دوش عدم
منزل حسن و لطافت کی طرف میرے قدم

آئینہ ساز نظر ہے جلوہ سامانی مری
جگمگاتی ہے تجلی بن کے حیرانی مری

صبح کے سیمیں اجالے سے لرز جاتا ہوں میں
چھاؤں میں اسرار دو عالم کے چھپ جاتا ہوں میں

**دوسرا تارہ** - رات کی تاریکیوں میں نور کا پیغام ہوں
میں کسی بے تابی آغاز کا انجام ہوں

جل رہی ہے مجھ میں شاید آہ و فریاد ازل
میری جان زار سے قائم ہے بنیاد ازل

ہر نفس لرزاں ہے میرا اہتمام زندگی
جھومتا ہے عرش پر میرا نظام زندگی

آنکھ کی مانند ہر لحظہ جھپک جاتا ہوں میں
اشک غم کی طرح دامن میں ٹپک جاتا ہوں میں

(یہ کہہ کے تارہ ٹوٹتا ہے اور سیاہ بلندیاں طے کرتا ہوا نیچے آتا ہے ۔ زمین کے ایک رفیع لیکن سیاہ پہاڑ پر ایک جنازہ گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے دو پیکر کندھوں پر اٹھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ ایک پیکر کا نام زندگی ہے ۔ دوسرے کا نام موت ۔ موت کا پیکر یہ نوحہ کرتا ہے ۔)

**موت کا پیکر** - تھم گیا وہ سینۂ بیتاب جس میں راز تھا
یہ کوئی دریا تھا یا ٹوٹا ہوا اک ساز تھا

چند سانسوں کے تموج میں تھا اک طوفان غم
اک دل مایوس اور فریادی ذوق ستم!

بند ہے وہ آنکھ جس میں حسن کا پیغام تھا
ختم ہے وہ زیست جس میں عشق کا انجام تھا

بند ہیں وہ گوش جو سنتے تھے آواز سروش
ہو گئے دنیائے رنج و غم کے افسانے خموش

زندگی کی گود میں پالا ہوا اک جسم ناز
ہو گیا افسوس بیداد زمانہ سے گداز

وہ تجلی جس پہ نازاں تھی فضائے کائنات
بن گیا اس وقت اک ویرانۂ درد حیات

فکر جو پرواز کرتی تھی فراز عرش پر
آج بے حس ہو گئی ہے آب و گل کے فرش پر

داغ دل جس کے نمایاں اہل محشر کیلیے — جو ستارے توڑتا تھا دیدۂ تر کے لیے
وہ فغاں جس میں نظر آتا تھا دل صیاد کا — وہ صدا جس میں تھا نغمہ حسرت بیداد کا
آج دنیائے خموشی کا فسانہ بن گئی! — موت کے پہلو میں آنے کا بہانہ بن گئی!

(زندگی یوں ماتم کرتی ہے)

زندگی، ظلمت ہستی کا آئینہ غم دیتا نہ دیکھ — مرگ فانی کا شب تاریک میں جلوہ نہ دیکھ
اس میں آئیں گی نظر تجھ کو ہزاروں عبرتیں — اک سیہ چادر نہیں ہیں زندگی کی حسرتیں
جا رہی ہے اوڑھ کر اس کو وہ خودداری کی لاش — موت کے دامن میں خوابیدہ ہے دل کا ارتعاش
اہل دنیا میرے شعلے کو بجھائیں کس طرح — بے بصر اک گوہر نایاب پائیں کس طرح
جو شب دیجور ہستی میں فروزاں ہی رہا — ریشمی دامن میں دنیا کے جو غلطاں ہی رہا
حسرتیں بیدار تھیں جس کی صدائے ناز سے — جس نے دنیا کو پکارا درد کی آواز سے
جس نے سنجیدہ بنایا ہستیٔ ناکام کو — جس نے زندہ کر دیا تکلیف کے انجام کو
نطق انسانی کو بخشے جس نے کچھ راز و نیاز — بن گیا غم جس کے نغموں سے پیام دلگداز
رکھ دیا سر جس نے رو رو کر ازل کے دوش پر — سو گیا جو آج میرے سینۂ خاموش پر!

(یہ نوحہ سن کر ٹوٹتا ہوا تارہ اس جنازہ کے طرف ایک نور کا حلقہ سا ڈال دیتا ہے۔ اندھیری فضا میں نظر آتا ہے کہ ایک روح سفید اس حلقہ میں بلند ہو رہی ہے۔ موت، زندگی اور آسمان کا مسکراتا ہوا تارہ مل کر گاتے ہیں)

اٹھ گئی آج بزم راز و نیاز — بے صدا ہو گیا ہے پردۂ ساز
زندگی مختصر تھی انساں کی — ڈھونڈ لی اس نے راہ دور و دراز
نغمۂ درد، اس قدر بے تاب — آہ و فریاد، اتنی سینہ گداز
مطرب خوش نوا، تری مرضی — چھوڑ دی تو نے بزم درد نواز
ہم سمجھتے ہیں تیری ہستی کو — آرہی ہے سروش کی آواز
"آج روز وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز"

محمد عبدالقیوم خاں باقی

# تجلّیات

یاد تری شراب ہے، ذکر ترا سرود ہے!
کیفِ طرب ہیں موجزن میرا یہ وجود ہے!

اپنی ہی دُھن میں عرش سے دور نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غمِ صعود ہے!

اس میں کہاں سرور و نور آگ ہی آگ ہے ہوس
مثلِ سموم ہر نفس، آہ برنگِ دود ہے!

آنکھ ہو حق شناس اگر آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بتکدۂ نمود ہے!

پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے ڈھلی ہوئی
عرشِ بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا ورود ہے!

فکرِ دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے بھی گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے!

غرقِ سرور و نور ہوں جام و سبو سے دور ہوں
میرے لیے کھلا ہوا میکدۂ شہود ہے!

آثر صہبائی

# اس دور میں!

ہر شعر مرا اصل میں تاریخِ امم ہے
مجھکو مری آفاق نوردی کی قسم ہے

اُس مردِ قلندر کو سڑی کہتی ہے دنیا
اس دور میں جو طالبِ انصاف و کرم ہے

ہر روح کی خلوت میں جو آباد ہے ابتک
وہ خالقِ اکبر بھی تصور کا صنم ہے

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

خلوت میں یہ عفریتِ تعیش ہے مگر اب
منبر پہ بھی استادہ ہے اور آنکھ بھی نم ہے

ہر شخص ہے سنگین حقایق سے گریزاں
ہر فرد کو محبوب یہی شیوۂ رم ہے

جو قیصر و فغفور کے آگے نہ جھکا تھا
مدت ہوئی وہ سر درِ الحاد پہ خم ہے

جذبات میں جدت نہ خیالات میں وسعت
تحریر میں رعنائی نہ تقریر میں دم ہے

یخ بستہ ہے نوخیز جوانی کا ارادہ
اور ڈھلتے بڑھاپے پہ گرانباریٔ غم ہے

مشرق کی نگاہوں میں ہے ہم پلّۂ قرآں
وہ بات جو مغرب کی کتابوں میں رقم ہے

جینے کے لیے اذن ہے قانون کا مطلوب
اللہ ستم ہے، مرے اللہ ستم ہے!

احمد ندیم قاسمی

# نوائے سحر

زندگی میں کوئی محشر کبنا ر آ جائے
قلب لرزاں کو کسی طور قرار آ جائے

سینچتا ہوں دل خاک اشک سحر گاہی سے
شاید اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آ جائے

---

دل کی قندیل سے روشن نہیں قوموں کا نظام
بندۂ سود و زیاں ہر شب ہستی کا غلام

زندگی میں اثر دانش امروز نہ پوچھ
تیری دنیائے تجلی پہ ہے چھائی ہوئی شام

---

دل سے روٹھے ہوئے اک دیس میں رہتا ہوں میں
سختیاں گردش ایام کی سہتا ہوں میں

قصۂ درد و الم پچھلی شبوں کو اکثر
چپکے چپکے ترے افلاک سے کہتا ہوں میں

---

ساقئ دہر ہی تو مجھ کو تنک جام نہ کر
اس خرد زار میں آئین جنوں عام نہ کر

شرم رکھ لے مری تقدیر کی اے روز جزا
ایک بدنام زمانہ کو تو بدنام نہ کر

---

تیرا پیغام سناتے ہیں ستارے مجھ کو
کرتے ہیں رات کو آنکھوں سے اشارے مجھ کو

توڑ دیتا ہے جنوں جب کہ تصور کے حدود
کھینچ لیتے ہیں سمندر کے کنارے مجھ کو

---

ضرب غم سے ابھی دستور نفس چاک نہیں
حامل موج شرر یہ خس و خاشاک نہیں

تیری تقدیر نے بخشا غم یاراں بھی مجھے
کہ دل خوردہ سزاوار غم پاک نہیں

**فضل حسین کیف اسرائیلی**

# تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

**کتاب العلم** (جزو اول): ناشران دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمیٹڈ۔ لاہور صفحات ۵۰۰ سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۱۱ر ہے۔ طباعت و کتابت کاغذ نفیس مع متعدد یک رنگی و سہ رنگی تصاویر۔

محمد سعید بیگ و محمد اسمٰعیل صاحبان نے ایک بہت بڑے سرمایے سے یہ کتاب بک آف نالج کی وضع کی نکالی ہے۔ خوبی طباعت اور اشاعت کی نفاست کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے مقصد یہ ہے کہ ہر علم کی معلومات ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائیں۔ کتاب العلم کا یہ پہلا حصہ ہے بقیہ حصے بھی اسی نمونے پر تیار کیے جائیں گے۔ فہرست مضامین سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ کائنات۔ معدنیات۔ حیاتیات انسانیات۔ ملکیات۔ کیمیا و طبیعیات۔ ایجادات فنون لطیفہ۔ تاریخیات۔ زرعیات۔ ادبیات تنظیمیات۔ دینیات قصہ جات تشخیصات۔ استفسارات۔ میکانیکیات۔ تفریحیات صحتیات اور اقتصادیات۔ دراصل یہ کتاب انگریزی کی بک آف نالج، ورلڈ آف ونڈرز، ورلڈ آف سائنس، وغیرہ عام معلومات کی قسم کی کتابوں سے لکھی گئی ہے۔ زیادہ تر تصاویر اور مضامین ان ہی سے لیے گئے ہیں۔ لیکن اصطلاحات کا ترجمہ بہت ہی معرب زبان میں کیا گیا ہے۔ یوں بھی عبارت میں عربیت اور فارسی انشا پردازی بہت زیادہ ہے۔ عموماً ایسی کتابیں عوام لڑکوں بچوں اور طالب علموں کے لیے زیادہ اور خواص کے لیے کمتر مخصوص ہوتی ہیں اس لیے زبان ایسی رکھنی چاہیے جو بہت سادہ اور آسان ہوتا کہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکے اور معمولی پڑھا لکھا بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ موجودہ اسلوب بیان سے زیادہ لوگ کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک بات اور اس کتاب میں نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی مذہبیت ہے گئی جگہ علمی مضامین میں آدم و حوا کا قصہ دہرایا گیا ہے یا دیگر مذاہب اور اسلام کے نقطہ نظر دیے گئے ہیں۔ خالص علمی مضامین میں (اور پھر جبکہ یہ کتاب ہر فرقہ کے لیے ہے صرف مسلمانوں

سکے لیے نہیں) مذہب کو جگہ جگہ بیچ میں نہیں لانا چاہیئے تھا مثلاً زرعیات، ادبیات وغیرہ میں بہتر ہوتا اگر دینیات کے عنوان ہی میں یہ مباحث رکھے جاتے یا اسلام ہی کے متعلق لکھنا تھا تو اسلامیات کا موضوع وضع کیا جاتا۔ دیگر لحاظ سے کتاب کی افادیت میں کلام نہیں ضروری ہو کہ یہ کتاب ہر لائبریری میں ہو۔ کتاب پر لاگت تو یقینی زیادہ آئی ہوگی پھر بھی قیمت کچھ زیادہ ہو۔

**اسلام اور مسیحیت**:- از ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری، ملنے کا پتہ دفتر اہلحدیث امرتسر، صفحات ۲۴۴۔ سائز $\frac{22\times18}{8}$ قیمت عہ۔ کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

مولانا موصوف کی یہ کتاب عیسائیوں کی کئی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی ہو اور بہت سی ان غلطیوں کو دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہو جو عیسائی مبلغین پھیلاتے رہتے ہیں۔ عیسائیت کا فتنہ مسلمانوں کے لیے پنجاب میں خصوصیت سے بڑے خطروں کا حامل ہو ضرورت تھی کہ ان مشنریوں کے خلاف جو وہاں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں سخت جد وجہد کی جائے۔ اور ان کو ان ہی کے دلائل سے بند کر دیا جائے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب عرصے سے اس جد وجہد میں مصروف ہیں خدا انھیں ثواب عظیم عطا کرے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان کی تصانیف خرید کر ان کو زیادہ سے زیادہ کام کر سکنے کا موقع دیں۔

**مسئلہ قومیت**:- از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائز $\frac{26\times20}{8}$ صفحات ۴۴، قیمت بے جلد عہ، کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

مولانا موصوف نے یہ مقالہ قومیت کے مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے لکھا ہو کہ اصل مقصد قوم اور قوم پرستی سے کیا ہو اور اسلام میں قومیت کے کیا معنی ہیں۔ جماعت، قوم اور امت کے معانی میں کیا فرق ہو اور مسلمانوں کی قومیت کن معنوں میں دوسروں کی قومیت سے جداگانہ ہو۔ یہ مقالہ دراصل پانچ مضامین کا مجموعہ ہو جن کے عنوانات یہ ہیں۔ قومیت اسلام، کلمہ جامعہ، متحدہ قومیت اور اسلام، کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہو، اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم۔ ہر موضوع کو بڑی وضاحت اور انشراح سے واضح کیا ہو۔ تا بلند رکتا ہو

**ہفت اورنگ** (حصہ اول) از اقبال حسین صاحب انصاری جونپوری ملنے کا پتہ ابو محمد انصاری محلہ سپاہ، جونپور، سائز $\frac{20\times26}{16}$ صفحات ۱۴۶ قیمت عہ، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

یہ سات مضمونوں کا مجموعہ ہے جو فارسی ادب سے متعلق مضامین پر لکھے گئے ہیں۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ زردشت، ایران میں شاعری و ادب، فردوسی طوسی، چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی۔ صوفیانہ لٹریچر۔ لسان الغیب، شیخ علی حزیں۔ ان مضامین میں کوئی داد تحقیق نہیں دی گئی ہے لیکن جو کچھ ہر موضوع پر موجود تھا اس کو ایک جگہ جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور اس لیے فارسی ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

**ذکر و فکر:**۔ از مقصود زاہدی ملنے کا پتہ نمبر ۱۶ زاہدی برادرز، زاہدیان میرٹھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۶ قیمت ۸؍ کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مقصود صاحب کے چند سماجی، سیاسی اور نفسیاتی چھوٹے چھوٹے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں وہ مطالعے خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں جو نفسیاتی جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ مثلاً میلے کو، بندگی و بیچارگی، فریب خیال، ڈاکٹر نیگی وغیرہ۔ مقصود صاحب کے بیان میں ہلکا سا طنز ہے جو ہمارے سماجی تکلفات کا پردہ اٹھانے میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔ مقصود صاحب کی قوت مشاہدہ باریک بیں ہے اور واقعیت نگاری کے لیے یہی چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ مقصود صاحب اس ذکر و فکر کو جاری رکھیں گے اور بہت جلد وہ اپنے لیے اردو ادب میں اچھی جگہ بنا سکیں گے۔

**میرے نغمے:**۔ از سلام مچھلی شہری ملنے کا پتہ اردو سوسائٹی دفتر ماہنامہ "اضطراب" جائپلنگ مارٹ نظیر آباد لکھنؤ۔ صفحات ۱۰۲، سائز ۲۲×۲۹/۱۲ قیمت ایک روپیہ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی "پھول اور انگارے"، اول الذکر میں رومانی نظمیں اور دوسرے حصہ میں انقلابی نظمیں شائع ہونا تھیں لیکن سرکاری اجازت نہ ملنے کے باعث صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے۔

سلام مچھلی شہری صاحب اردو کے ان نوجوان شعرا میں سے ہیں جو ادب کو زندگی سے قریب تر دیکھنا چاہتے ہیں جو تمام نظام معاشرت میں مساوات کے حامی ہیں اور جو موجودہ سیاسی تنظیم کو پلٹ کر ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں ہر ایک کو برابر کے مواقع ملیں نہ کوئی ظالم ہو نہ مظلوم نہ کوئی آقا ہو نہ خادم

نہ کوئی سرمایہ دار ہو نہ کوئی مزدور۔ سلام کی گرمی تخیل اور شدت احساس ان موضوع کے لیے یقیناً مناسبت رکھتی ہو ان کی سیاسی نظمیں کافی معروف ہیں زیر نظر رومانی نظموں میں بھی ان کا شدت احساس بدرجہ اتم نمایاں ہو۔ عید کی مبارکباد، کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہو؟ افسانہ در افسانہ، محبت کے گیت، بھلا دو، وہاں، حسین تعارف اچھے مطالعے ہیں اور ہمیں توی امید ہو کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اپنے آرٹ میں اور ترقی کرے گا

**قاعدہ مفتاح القراۃ:۔** از حکیم عبداللہ رشید نواب رشد کی مطبوعہ ایس ایم حسن ستارہ ہند پریس لمیٹڈ نمبر ۲۵ بنیا پوکھر لین کلکتہ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ صفحات ۴۴ قیمت درج نہیں۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

فن تجوید پر یہ قاعدہ حکیم عبداللہ رشید صاحب نے بڑے غور و خوض نیز ان تجربات کے بعد شائع کیا ہو جو موصوف نے مسلم ہائی اسکول اریشمش میں کیے۔ اس میں مختلف مشقوں کے ذریعہ طلبا کو حروف کے جوڑ ان کے صحیح تلفظ اور صحیح آوازوں کے متعلق صحیح رہبری کی گئی ہو۔ طلبا کے لیے بہت مفید چیز ہو۔ امید ہو عربی اور فن تجوید کے طالب علم اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔

**پارہ عم:۔** مرتبہ شعبہ اشاعت قرآن ادارہ دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ صفحات ۹۶ قیمت ۸ر کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی۔

یہ پارہ عم دارالاسلام نے مع ترجمہ وتفسیر و معانی الفاظ شائع کیا ہو ایک خصوصیت یہ بھی ہو کہ ہر لفظ کے معنی الگ الگ بھی دے دیے ہیں اس سے عربی دانی میں بڑی مدد مل سکتی ہو۔ امید ہو کہ ادارہ دارالاسلام پورا قرآن شریف اسی اہتمام سے شائع کر سکے گا طلبا اور عوام کے لیے یکساں مفید ہو۔

**شمیم کے سو شعر:۔** مرتبہ سید جمیل الدین۔ ملنے کا پتہ۔ عثمانیہ بکڈپو دکان نمبر ۱۵ا محمد علی بلڈنگ بمبئی نمبر ۳ صفحات ۴۸۔ تقطیع چھوٹی قیمت ۴ر کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم کے یہ سو منتخب اشعار جمیل الدین صاحب نے پیش کیے ہیں۔ مختصر پیش لفظ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب نے لکھا ہو۔ انھوں نے صحیح تحریر فرمایا ہو کہ شمیم صاحب کے کلام میں صداقت زیادہ ہو نظر میں گہرائی بھی ہو اور دل پر سوز بھی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

سینے میں اک چھالا سا تھا کیا جانے کب پھوٹ گیا    پوچھ رہے ہو دل کی حالت۔ دل کی حالت کیا کہیے

بھیگے ہوئے یہ بادل مہکی ہوئی یہ راتیں ۔۔۔ یاد آگئیں پھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں

لب پہ نالہ نہیں شکوہ نہیں فریاد نہیں ۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ ترا کوئی ستم یاد نہیں

**سالنامہ نظامیہ:۔** مرتبہ ابو الخیر کنج نشیں۔ ملنے کا پتہ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن صفحات ۱۹۶ قیمت ۱۲ر سائز ـــــ کتابت طباعت اچھی کاغذ معمولی۔

حیدرآباد دکن کی ایک قدیم مذہبی درسگاہ کا نام جامعہ نظامیہ ہے چند سالوں سے اس جامعہ کا یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ اس سال فروری ۱۹۶۱ء میں منایا گیا۔ اس سلسلے میں جامعہ نظامیہ کی علمی مذہبی خدمات نیز کارگزاریوں اور حالات میں جو مقالے اور مضامین ترتیب دیے گئے وہ اس رسالہ میں درج ہیں۔ چند مضامین اس سلسلے کے علاوہ بھی شامل کئے گئے ہیں مثلاً تاریخ قراۃ و تجوید، آزادی نسواں اور مسئلہ حجاب و حدود ستر و نظر، شعر العرب (جو پہلے کتابی صورت میں بھی شایع ہو چکا ہے) وغیرہ جو قابل مطالعہ ہیں۔

**نصاب تعلیمی مرکز:۔** انجمن خدمت خلق، عربک کالج دہلی

تعلیم بالغان کے اس بڑے مرکز نے اپنا نصاب حال ہی میں شایع کیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرکز کتنی تن دہی اور جاں فشانی سے بلا کسی معاوضے کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ کر رہا ہے۔ تعلیم اور سامان تعلیم سب مفت مہیا کیا جاتا ہے۔ مرکز میں کل چار جماعتیں ہیں ہر جماعت کے نصاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی دینیات، حساب اور عام معلومات۔ اصل میں خواندگی کا نصاب تو پہلی جماعت میں ختم ہو جاتا ہے باقی تین جماعتوں میں ان کی مشق کو مستحکم کیا جاتا ہے اور شوق کو ابھارا جاتا ہے۔

ایک اخبار، ایک دارالمطالعہ، ایک لائبریری اور ایک انجمن بھی قایم ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحب استطاعت حضرات حسب توفیق الوسع اس کی مالی امداد کریں نیز لوگ اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھائیں۔ نصاب مندرجہ بالا پتہ پر کارڈ لکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

**شیطان کا انتقام** ہم دور حاضرہ کے علمی، ادارتی اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز و تند اور تلخ تبصرہ از سلطان احمد صاحب شائق قیمت ۵ر صفحات ۹۶۔ پتہ درج نہیں۔

**سلک گوہر** (ایک غنائی تمثیل) از جلال الدین اشک قیمت ہم ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

اشک صاحب کی پہلی کتاب اس تلخی اور مایوسی کی آئینہ دار ہی جو اس دور کے اکثر ذہین اور ہونہار نوجوانوں میں پائی جاتی ہی اور جو دراصل اس دور کی روح ہی۔ اس میں انھوں نے موجودہ دنیا اور اس کی تمام برکتوں کو شیطانی بتایا ہی اُن کا خیال یہ معلوم ہوتا ہی کہ انسان باوجود بہت سی نعمتوں کے چونکہ مسرت سے محروم ہو گیا ہی اس لیے وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہی۔ مسرت سے محرومی اشک صاحب کے نزدیک شیطان کا کرشمہ ہی۔ انسانی اعمال کی ذمہ داری اتنی آسانی سے شیطان پر نہیں رکھی جا سکتی۔ دراصل ملکوتیت اور شیطنیت خود انسان کے اندر موجود ہی۔ اس کش مکش سے انسانی زندگی کی دلچسپیاں قایم ہیں۔ ارتسامات کے تحت میں ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہی کہ اشک صاحب کا شیطان کا استعمال اچھوتا ہی۔ یہ خیال صحیح نہیں اگر دوسرے ادبیات سے قطع نظر کی جائے تو بھی اردو میں سجاد انصاری، فلک پیما۔ رشید احمد صدیقی، اقبال ان سب کے ہاں یہی تصور ملتا ہی۔ دراصل اردو میں سب سے پہلے شیطان کو سجاد انصاری نے محرم راز کی حیثیت سے پیش کیا۔ اقبال اسے خواجہ اہل فراق بھی کہتے ہیں اور اس کے "سوز نفس سے کار عالم کی استواری" بھی عبارت سمجھتے ہیں۔
اشک صاحب نے زیادہ سے زیادہ اپنی پوری کتاب میں اقبال ہی کے بعض اشاروں کو واضح کیا ہی۔ معلوم ہوتا ہی کہ ان کے نزدیک شعر و ادب، تنقید، فلسفہ آرٹ، عورت سب اس لیے گمراہ کن زندگی ہیں کہ بعض شیطانوں نے انھیں اپنی اغراض کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا ہی۔ یہ ذہنیت دلچسپ ضرور ہی۔ اور پر خلوص بھی مگر بالکل صحیح نہیں۔ ایک مسرت وہ ہوتی ہی جو "احساس زیاں" نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہی۔ ایک وہ ہی جو سود و زیاں دونوں سمجھنے سے۔ دراصل انسان پہلے احساس زیادہ رکھتا ہی نہ تھا اس لیے اگرچہ وہ خوش تھا مگر اس کی خوشی بچوں کی سی تھی۔ وہ صرف خوش رہنے کے لیے نہیں آیا، وہ رنج و راحت سختی و سستی کو ہموار کرنے کے لیے آیا ہی۔ اقبال کے ابلیس نے جو دنیا کی تعریف کی ہی وہ دراصل اشک صاحب کے تصور سے زیادہ حقیقی ہی۔

سوز و ساز و درد و رنج و آرزو و جستجو

یوں دیکھیے تو مسرت کی کمی اتنا بڑا جرم نہیں رہ جاتی بلکہ اس سے محرومی اس بے حسی سے بہتر ہے جو بعض وقت مسرت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے

دراصل زندگی پر ایک بہتر تبصرہ اشک صاحب کی دوسری کتاب "سلک گوہریں" میں ملتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت مختصر ہے۔ اس میں شاعری، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور اس قسم کے دوسرے سانچوں سے آزاد ملتی ہے۔ غنائی شاعری اردو میں اب شروع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کی اٹھان ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھنی چاہیے اشک صاحب کے اشعار میں شعر کی روح ضرور موجود ہے مگر ابھی طریقۂ اظہار پر قدرت حاصل نہیں ہوئی اور بعض مصرعے اور شعر اعتراف عجز کی زندہ مثالیں ہیں۔

دونوں کتابیں توجہ سے پڑھنے کے لایق ہیں۔ شیطان کا انتقام پر جوش نثر میں لکھا گیا ہے۔ کاش خیالات اور گہرے اور پختہ ہوتے تاکہ سطحیت بالکل نہ آنے پاتی۔

**ہمارے مزدور :۔** از محمد عبدالقادر صاحب لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ۔ ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی صفحات ۶۰، قیمت درج نہیں کاغذ، کتابت و طباعت بہت اچھی۔

انجمن ترقی اردو نے اپنے پروگرام کے ماتحت یہ چھوٹا سا رسالہ اس لیے نکالا ہے تاکہ عام لوگ معاشیاتی مسائل سے اچھی طرح باخبر ہو سکیں۔ عبدالقادر صاحب نے یہ رسالہ بڑی تحقیق سے مرتب کیا ہے اور اس میں وہ تمام معاشیاتی مسائل آ گئے جو ہندوستان کے ایوان قانون سازی میں منظور ہو کر عمل پذیر ہوتے رہے ہیں۔ آکسفورڈ پریس کی طرح یہ عام فہم طریقۂ علوم پھیلانے کا یقیناً بہت مفید اور اچھا ہے۔ امید ہے کہ انجمن مذکور اس قسم کے دیگر رسائل بھی ملک کے سامنے جلد رکھ سکے گی۔ اگر آئندہ زبان اور آسان ہو تو بہتر ہوگا اور عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

**رسالے :۔**

**اضطراب :۔** ایڈیٹر مسعود اختر جمال۔ دارالاشاعت دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس صفحات ۴۲ چندہ سالانہ ۳ ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جگر مرادآبادی صاحب کی نگرانی اور مسعود اختر جمال صاحب کی ادارت میں کچھ عرصہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کا اچھا مجموعہ ہوتا ہے بعض اچھے مضامین دوسرے رسالوں سے بھی مستعار لیے جاتے ہیں اس صورت سے اس کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ زیر نظر نمبر جولائی و اگست کا ہے۔ اس میں بھی اچھے اچھے رسالوں کے اچھے اچھے ادبی اور علمی مضامین مجتمع ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ انگریزی میں کئی رسالے اس قسم کے نکلتے ہیں جن میں تمام دیگر رسالوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں اس نچوڑ کے علاوہ اس کے اپنے مضمون نگاروں کے بھی مضامین اور نظمیں ہیں اگر یہی رفتار "اضطراب" کی رہی تو امید ہے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط تر پیدا کرے گا۔

**سُہیل** (خاص نمبر) مدیران عارف سنبھلی و قیصر عثمانی صاحبان۔ صفحات تقریباً ۲۱۶۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ سہیل گیا۔ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

رسالہ سہیل کا خاص نمبر بڑی خصوصیت کے ساتھ نکلا کرتا ہے۔ اور بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اچھے اور تحقیق سے لکھے ہوئے مقالے، دلچسپ نظمیں اور اچھے ڈرامے ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں بھی "آغا حشر اور اس کا آرٹ"۔ "موازنہ غالب و مومن میری نظر میں"۔ "دقیقی اور فردوسی" وغیرہ مضامین بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح افسانوں، ڈراموں، نظموں اور غزلوں کا معیار بھی برا نہیں ہے۔ شائقین کے لیے ایک اچھے مطالعہ کا سامان ہیں۔

فہرست مضامین پر اگر صفحات دے دیے جاتے تو اچھا تھا نیز ان کی ترتیب بھی جیسی عام طور پر ہوتی ہے ویسی ہونا چاہیے تھی تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ اشتہارات کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ادبی رسالوں میں جنسی امراض کے اشتہارات نہ ہونے چاہئیں۔

**نئی زندگی** :- مدیر انیس الرحمٰن صاحب۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ نئی زندگی ۴۹ سپلیمنٹری زیرو روڈ الہ آباد چندہ سالانہ صہ ر فی پرچہ ۸ر صفحات ۶۴، کاغذ، کتابت طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جولائی ۱۹۴۱ء سے ڈاکٹر سید محمود کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ مقصد اس رسالہ کا یہ ہے اس میں خالص ہندوستانی کلچرل مسائل پر بحث کی جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے

ادیبوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مشترک کلچرل ترکے کو پیش کریں تاکہ ایک دوسرے سے گزشتہ کی طرح قریب آسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے رسالے کی سخت ضرورت تھی۔ موجودہ ہندوستان کی فضا دیکھتے ہوئے اس قسم کے رسائل کا نکلنا مفید اور بہتر نتائج ثابت ہوگا۔ زیر نظر اگست نمبر میں خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ (۱) مسلم عہد حکومت میں ہندؤں کی حالت (۲) سندھ پر عربوں کا حملہ (۳) یورپین سامراج کی اسلام نوازیاں۔ (۴) ہندوستان میں زبان کا مسئلہ (۵) آنند (افسانہ)۔ (۶) تمام مذاہب عالم کی حیرت انگیز یکسانیت۔ (۷) مرہٹہ حکمراں فرقہ پرست نہ تھے۔ مضمون نگاروں کی فہرست جو صفحہ ۲ پر دی گئی ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نئی زندگی والوں نے کس قدر ستھرا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں نوجوان طبقہ ہی سے آئندہ کی بہتری کی امید ہو سکتی ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اور اس کا مقصد و معیار قائم رہے۔

**ہمارا اخبار** ؂۔ مرتبہ سید محمد ادریس ڈپٹی کلکٹر بلیا۔ صفحات ۱۰۔ سائز ۱۷×۲۷/۴ چندہ سالانہ عہ ر

یہ پندرہ روزہ اخبار جنگ کی حقیقتوں کو جاری رکھنے کے لیے نکالا گیا ہے۔ اپنے مقاصد کے پیش نظر اس کی ترتیب بہت معقول اور مناسب ہے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں نکل رہا ہے۔

# رفتارِ زمانہ

اس مہینہ میں، اب تک جنگ کے کوئی کارنامے، خاص طور سے بیان کے قابل نہیں ہیں لیکن تقریریں کئی ہوئی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر فتوحات کا درجہ رکھتی ہیں ہم ان کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم ان کا اصل مطلب نہیں سمجھے، انھیں نظر انداز کریں اور بات اسی کو مانیں، جو توپ کے منہ سے کی جائے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ یہ تقریریں ہمیں سیاست کے وہ بھید بتاتی ہیں، جو اور کسی طرح سے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ تبصرے ہیں ان واقعات پر جو ہمیں روز کی خبروں میں تھوڑے تھوڑے بتائے جاتے ہیں اس طرح کہ ان کی مجموعی شکل ہمارے سامنے نہیں آتی جنگ کی خبر صرف یہ ہے کہ جرمنی کا قریب قریب پورے جزیرہ نما کریمیا پر قبضہ ہو گیا ہے اور جرمن ہوائی جہاز، دون ( Don ) اور دولگا دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اس پر منڈلا رہے ہیں، یعنی قفقاز کو روس سے الگ کرنے کی کارروائی شروع ہو گئی ہے، کریمیا پر قبضہ کرنے کا منشا بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک ہوائی مرکز بنایا جائے، جہاں سے بحر کیسپین کے کناروں تک مشرق میں اور ترکی کے ساحل تک جنوب میں ہوائی جہاز بھیجے جا سکیں۔ ماسکو کے گرد لڑائی ہو رہی ہے، جرمنوں کو جان اور مال کا بہت نقصان ہو رہا ہے لیکن وہ ماسکو کا محاصرہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ روسیوں نے یہ ہوشیاری کی کہ ماسکو کے جنوب میں جتنے کارخانے تھے، ان میں سے کام کی چیزیں پہلے ہی اٹھا لے گئے اور محاذ سے دور مشرق کی طرف جا کر نئے کارخانے قائم کر دئے اور جیسے اوکرائن میں ملبے کے ڈھیروں کے سوا جرمنی کے کچھ ہاتھ نہ لگا تھا ایسے ہی یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جنگ کے شور اور پریشانیوں میں ایسا کام کرے جانا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن روسیوں کے پاس سامانِ جنگ کی پہلے بھی کمی تھی کارخانوں کو اس طرح منتقل کر کے انھوں نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ سامان تیار ہوتا رہے مگر بنتا پہلے کے مقابل میں کم ہی ہوگا، لینن گراڈ کا محاصرہ بدستور جاری ہے، وہاں کی روسی فوج اکثر نکل کر

دشمن کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن گھیرے سے نکل نہیں پاتی۔ یہ حالت بہت مایوسی کی ہوتی اگر روسی ہمت ہار جاتے۔ وہ ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کا استقلال بڑھتا جاتا ہے اور استالن کی جو تقریر حال میں ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ناکامی اور نقصان روسیوں کے ارادے کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اس کے مقابلے پر ہر ہٹلر کی وہ تقریر رکھنا چاہئے جو انھوں نے کچھ دن ہوئے میونخ میں کی تھی اور جس میں طرح طرح سے بات بنا کر دکھایا گیا ہے کہ جرمنی کو کوئی ناکامیابی نہیں ہوئی ہے، ہر ہٹلر کی تقریریں اور بہت سے نکتے بھی تھے جن کا تعلق روس کی جنگ سے نہیں، بلکہ دنیا کی سیاست سے ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس وقت ذرا ان تقریروں پر غور کیجئے جو اس جنگ کا حال بتاتی ہیں اور اس سیاست کا جس کی خاطر یہ جنگ ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر کی تمام تقریریں ایک سی ہوتی ہیں۔ ان کے اصول وہی ہیں، جو ہر بڑے پیمانے کی صنعت کا، کہ الگ الگ کل پرزے تیار کرئے جائیں اور پھر انھیں جوڑ کر جو چیز بنانا ہو تیار کر لی جائے۔ ہر ہٹلر کی تقریروں میں بہت سی پرانی باتیں تھیں اور بالکل نئی بات شاید کوئی بھی نہیں تھی۔ لیکن دنیا کی حالت بدلتی رہتی ہے اور ہر ہٹلر اپنی پرانی تقریروں میں کچھ بڑھا کر اور کچھ گھٹا کر جو نئی تقریر کرتے ہیں، اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ روس کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں لڑتے ہیں، کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی موسم کو ناموافق دیکھ کر یا رسد کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد تماشا دکھانا نہیں ہے، ہم دشمن کی فوج کو ختم کرنا اور ملک پر پورا قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہر ہٹلر پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لیکن چند دن کے اندر ماسکو فتح کرنے کا دعویٰ جو انھوں نے پہلے کیا تھا وہ اس مرتبہ دہرایا نہیں گیا۔ اس کے بجائے انھوں نے لینن گراڈ کے محاصرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس شہر کو گھیرے بیٹھے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ایک دن یہاں کی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے پاس نہ کھانے کو کچھ رہے گا اور نہ گولہ بارود۔ ہم محاصرے میں ایک سپاہی کی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے، بس محاصرے کو جاری رکھیں گے اور اگر روسی دوسرے شہروں کی طرح لینن گراڈ کو اڑا دیں گے تو یہ بھی ہمارا کام ہے جو ان کے ہاتھوں اور خود بخود ہو جائے گا۔ خود بخود ہونے والا

کام کتنے دنوں میں ہوگا یہ ہرہٹلر نے نہیں بتایا اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ اب جاڑا شروع ہوگیا ہے اور ان کا وعدہ تھا کہ اس کی جنگ جاڑوں سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

سیاست پر جو تبصرہ ہر ہٹلر نے کیا ہے، وہ بھی اسی انداز میں تھا، وہ برطانیہ پر جنگ جوئی کا الزام لگاتے ہیں جس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ برطانیہ ان سے صلح کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہر ہٹلر اپنی طرف سے کئی مرتبہ صلح کی بحث چھیڑ چکے ہیں۔ اس کی استالن نے بھی تصدیق کی ہے۔ کہ ہر ہٹلر نے مغربی ملکوں کو روس کے خلاف ملانا چاہا۔ اپنی تقریر میں استالن نے یہاں تک کہا کہ ہرہیس اصل میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جنگ کی ذمہ داری برطانیہ پر ڈالنے میں ہر ہٹلر کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ برطانیہ یورپ کی اس نئی تنظیم میں حائل ہے وہ جو کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب فضا موافق ہے، اٹلی ان کے قابو میں ہے، فرانس کو انھوں نے اس حد تک راضی کر لیا ہے کہ اب فرانسیسی فوج روس کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کی جا رہی ہے، یورپ کی باقی تمام قومیں ہر ہٹلر کے ماتحت یا ان کی دست نگر ہیں۔ اس لئے جرمنی کے پروپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو اس بات کا چرچا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ہوگی کہ یورپ کی تمام قوموں کی ایک کانفرنس جلد ہونے والی ہے۔ کانفرنس کا اشتہار دینے کے لئے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے پہلے کہا گیا تھا کہ اس کا اجلاس ماسکو کے مشہور محل کریملن میں ہوگا، لیکن جرمن فوجیں ابھی تک ماسکو نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اس لئے کانفرنس مجبوراً ویانا میں ہوگی۔ کانفرنس کا غالباً ایک مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تصدیق ہو جائے اور آگے کے لئے جرمنی کو اس کا باضابطہ طور پر اختیار ہو جائے گا کہ جس طرح سے چاہے جنگ کرے اور جس طرح چاہے صلح کی تدبیریں کرے۔ یہ بات شاید صاف صاف کہی تو نہیں جاتی لیکن کانفرنس میں صلح کی تحریک بھی اٹھائی جائے گی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جنگ کا اصل ذمہ دار وہ ہے، جو اس وقت صلح سے انکار کرے۔

ایسے تو کانفرنس کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اس سے لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں، ترکی میں جرمنی کے اشارے پر یہ غلط فہمی جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی ہے، ترک دیکھتے ہیں کہ جنگ روز بروز ان کے ملک کے

قریب آتی جا رہی ہے۔ انھیں اندیشہ ہے کہ وہ اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے، اس لئے قدرتی طور پر وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے جرمنی اور برطانیہ میں صلح کرا دی جائے۔ ترکوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے جرمن کہتے پھرتے ہیں کہ ہاں ہاں اب صلح ہو جانا چاہئے، اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے اور ترک جو دل سے صلح پسند ہیں اب اس کی کوشش کریں تو صلح اور بھی جلدی ہو سکتی ہے۔ ترکوں کو سب اپنا دوست سمجھتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ صلح کانفرنس قسطنطنیہ میں ہو، واقف کار ترک تو وہی سمجھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں جو کہ ترکی کے صدر عصمت پاشا نے جمہوریہ کی برسی کے موقع پر اپنی تقریر میں بیان کیا تھا، لیکن سب لوگ واقف کار اور ہوشیار نہیں ہوتے وہ تو جنگ سے بیزار ہیں اور ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔

سمجھدار ترک تو جانتے ہیں کہ برطانیہ جرمنی سے صلح نہیں کرے گا اور ابھی صلح کا نام لینا فضول ہے لیکن ہر ایک کے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی، وہ صلح اور جنگ کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق فرانس کو شکست کے بعد برطانیہ کو صلح کر لینا چاہئے تھا۔ اب پھر ان کے نزدیک روس کی شکست کے بعد صلح کی گفتگو کرنے کا موقع آئے گا۔ ہمارے لئے اول تو روس کی شکست کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ روس اپنی موجودہ حالت میں بھی مہینوں لڑ سکتا ہے، دوسرے اگر خدانخواستہ روس نے شکست بھی کھائی تو برطانیہ صلح کی گفتگو کرنے کے بجائے جنگ جاری رکھنے کا نئے سرے سے عہد کرے گا مسٹر چرچل پچھلے سال کہہ چکے ہیں کہ برطانیہ اگر ضروری ہوا تو برسوں تک اور ضروری ہوا تو اکیلا لڑتا رہے گا۔ اسٹالن نے اپنی پچھلی تقریر میں روس کی طرف سے ایسا ہی کچھ کہا تھا اسٹالن، مسٹر چرچل اور پریزیڈنٹ روزولٹ کی تقریروں سے دنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرا کا ساتھ کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے اور جہاں تک ممکن ہوگا وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہیں گے۔ متحدہ ریاستوں نے روس کو بہت بڑی رقم قرض دی ہے، پریزیڈنٹ روزولٹ نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ اگر جلد فیصلہ کرنا ہو، تو ان کی اور اسٹالن کی گفتگو براہ راست ہو جائے اس طرح روس میں جنگ جاری رکھنے کا سامان ہو گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں، اگر اسٹالن کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ مغربی یورپ میں کہیں پر برطانوی فوجیں اتریں اور جرمنی کے خلاف محاذ قائم کریں۔

پریزیڈنٹ روزولٹ کا اختیار ابھی روز بروز بڑھتا جارہا ہے، انھیں صرف صحیح تدبیر سوچنے میں کمال حاصل نہیں ہے، وہ اپنی قوم کو اپنی مصلحت سمجھا بھی سکتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ لینڈ اینڈ لیز ــــ ادھار بٹا کا قانون منظور ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب قانون غیر جانب داری میں ترمیم کی جارہی ہے اس کے بعد متحدہ ریاستوں کے تمام تجارتی جہاز مسلح ہو جائیں گے امریکہ سے انگلستان ہر قسم کا مال امریکہ کے جنگی جہازوں کی حفاظت میں پہنچایا جا سکے گا اور برطانوی بیڑا خالص جنگی کارروائیوں کے لئے وقف کیا جا سکے گا۔ اس طرح وہ اتحاد جو اب تک دل میں تھا، ایک بہت معقول عملی صورت اختیار کرے گا اور متحدہ ریاستیں، برطانیہ اور روس ایک دوسرے سے مل جائیں گے کہ فاشسٹ قوموں کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔

جاڑا شروع ہو گیا ہے اور جنگ ایک نئی سی کیفیت کیطرح ان میدانوں میں بھی پھیل رہی ہے جہاں اب تک دھوپ اور ریت نے مورچوں اور خندقوں سے نکلنا مشکل کر دیا تھا۔ پچھلے سال برطانوی سپہ سالار نے لیبیا میں پیش قدمی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع کی تھی اس مرتبہ دشمن زیادہ چالاک اور مستعد ہے اس لئے ضروری تھا کہ اسے تیار رہنے کا موقع کم سے کم دیا جائے۔ موسم کے ناموافق ہو جانے کا امکان ابھی باقی ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ بارش کی وجہ سے فوجی کارروائیوں میں خلل پڑتا ہے لیکن اچانک حملہ کرنے میں بھی بڑے فائدے ہیں، ان کو خالی اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ موسم اپنا رنگ بدل کر پریشان کرے گا۔

واقف کار لوگوں کے اخباروں میں جو بیانات شائع کرتے ہیں ان سے آپکو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ریگستان کی لڑائی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ زمین ایسی ہوتی ہے جو کسی کو سہارا نہیں دیتی جس پر کسی کے قدم جمنے نہیں پاتے۔ کبھی آدمی اس کے اوپر ہوتا ہے تو کبھی یہ آدمی کے اوپر ہو جاتی ہے اس میں نہ راستہ بنایا جا سکتا ہے نہ ٹھکانہ اور اگر کسی کو اس کا پتہ رہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی منزل کدھر ہے تو یہی بہت غنیمت ہے۔ ایسی زمین میں کوئی مستقل محاذ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تھوڑی تھوڑی کر کے فتح نہیں کی جا سکتی اس لئے اگر آپ کی سمجھ میں فوراً نہ آجائے کہ لیبیا میں برطانوی اور جرمن فوجوں کی لڑائی کس طرح ہو رہی ہے تو اسے سمجھانے والے کا قصور نہ جانیئے۔ ریگستان کی جنگ میں فوج کے مختلف حصے اس

روستوف پر قبضہ کر کے وہ جلد سے جلد جنوب کی طرف بڑھیں گی اور جزیرہ نما کریمیا سے لاگر [illegible] تم کے پاس بھی وہ فوج اتاریں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ لیکن جلدی کی بھی ایک حد ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن خود جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بھی ناکافی نہیں۔ اس لئے ترکی کے وزیر اعظم ہر ہٹلر سے گفتگو کرنے کے لئے بلائے گئے ہیں اس امید میں کہ شاید ترکوں کی مدد سے کام کچھ اور جلدی ہو جائے۔ ظاہر ہے ترک کسی کی دھونس میں نہ آئیں گے۔ جرمنی جتنا اصرار کرے گا اتنا ہی وہ انکار کریں گے اور بہت ممکن ہے ہر ہٹلر جلدی میں اپنا کام اس طرح بگاڑ دیں کہ پھر وہ بنائے نہ بن سکے۔ فی الحال تو ہم بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ لیبیا میں برطانیہ کی پیش قدمی نے صرف ایک میدان میں نہیں۔ سیاست اور جنگ کے بہت سے میدانوں میں دشمن کو مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اب لڑائی صرف لیبیا میں نہ ہوگی بلکہ اس کا نا ذ ڈاکر سے شمالی ایران تک ہوگا۔